زوالِ آدمِ خاکی

محمد غیاث الدین

ناول
۳۰۱۷

زوالِ آدمِ خاکی

(ناول)

گورنمنٹ
اردو لائبریری
پٹنہ-۴
۱۹۳۸ء

GIFT

زوالِ آدمِ خاکی

(ناول)

GOVT. URDU LIBRARY
ACC. N 35718

محمد غیاث الدین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

© سلطنت غیاث

ZAWAL-E-A'DAM-E-KHAKI

(Novel)

by

Mohammed Ghayasuddin

P-5, University Campus
Dr. Baba Saheb Ambedkar Marathwarha University
Aurangabad-431004
Mob: 09422312894
E mail: gayas147@gmail.com

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-090-4

نام کتاب : زوالِ آدم خاکی (ناول)
مصنف : محمد غیاث الدین
سنِ اشاعت : ۲۰۱۳ء

مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

Govt. Urdu Library
35108

اپنی خالہ مرحومہ کے نام

پیش لفظ

ناول کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں۔
مماثلت کے لئے مصنف اور ناشر ذمہ دار نہیں ہیں۔

مصنّف

آرٹس فیکلٹی کی تین منزلہ عمارت اپنے اندر علم و دانش کا خزانہ سمائے قومی ہیکل سفید قلعہ کی شکل میں پوری آن بان کے ساتھ تقریباً دو ایکٹر زمین پر ایستادہ تھی۔ کیمپس کا رقبہ چار ایکڑ تھا۔ پچھم میں پارکنگ اور پورب میں پی آر او آفس اور کینٹین تھی۔ شمال میں ٹیچرس کے رہائشی مکانات تھے۔ عمارت کا رخ جنوب میں تھا۔ سامنے سرسبز لان تھا۔ لان میں یہاں وہاں سمنٹ کی بینچ بنی تھی جن پر طالب علم بیٹھے تھے۔ لان کے پرے یونیورسٹی روڈ تھی۔ روڈ کے اس پار جنرل ایجوکیشن سینٹر، میوزیم، کینیڈی آڈیٹوریم اور مولانا آزاد لائبریری تھی۔ لان، سڑک، کینیڈی کیمپس، لائبریری، آرٹس فیکلٹی کے انٹرنس اور اس کے اندر ہر جگہ طالب علم نظر آرہے تھے۔ انٹرنس پر سیڑھیوں سے گزر کر بائیں طرف ڈین آفس اور دائیں طرف شعبۂ اردو تھا۔ کوریڈور نما شعبۂ اردو پچیس تیس میٹر لمبی اور دو میٹر چوڑی راہ داری جس کے دونوں طرف اساتذہ کے کابک نما کیبن تھے۔ جس میں مشکل سے ایک میز اور چار کرسیوں کو آسانی سے رکھا جاسکتا تھا۔ کوریڈور کے آخر میں ایک دس بائی دس کا کمرا تھا جس میں وہ تمام لکچرر رہتے تھے جنھیں علیحدہ کیبن نہیں ملا تھا۔

اس دن شعبۂ اردو میں جاوید کے ایم۔ فل کا وائیوا ووسی امتحان تھا۔ سنٹرل یونیورسٹی سے ایک پروفیسر بطور خارجی ممتحن تشریف لائے تھے۔ جاوید اپنے وائیوا کی وجہ سے نروس تھا۔ ممتحن اردو کے ممتاز نقاد، دانشور اور سینئر پروفیسر تھے۔ یہی سوچ کر جاوید کے دل میں بے چینی تھی۔ اس کے ذہن میں مختلف طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔

موضوع سے متعلق سوالات ہونگے یا اس سے الگ۔ موضوع پر ہوئے تو تھوڑا بہت معلوم ہے لیکن غیر متعلق کا جواب کیسے دونگا۔ تھوڑی دیر کے بعد گائیڈ کے چیمبر میں بلایا گیا۔ گائیڈ اور ممتحن ایک طرف بیٹھے تھے۔ ان کے اور جاوید کے درمیان ایک میز تھی۔ جاوید کو دونوں کے بالکل سامنے بٹھایا گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ممتحن ایم۔ فل کے مقالہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ گائیڈ نے جاوید سے کہا کہ آپ اپنے حواس اور اعصاب پر قابو رکھئے۔ ڈاکٹر صاحب کوئی مشکل سوال نہیں پوچھنے جا رہے ہیں۔ ممتحن صاحب کو یہ سن کر اندازہ ہو گیا کہ طالب علم ان کی شخصیت اور علمی حیثیت سے خوفزدہ اور نروس ہے۔ اس لئے انھوں نے چند بہت ہی آسان سوالات پوچھے اور مبارکباد دی اور کہا آپ نے مقالہ لکھنے میں بڑی محنت کی ہے۔ اور اس پر وائیوا ختم ہو گیا۔ جاوید کو ایسا لگا جیسے حبس زدہ کمرے سے باہر کھلی جگہ میں آگیا ہو۔ اس کا دماغ اور بدن ہلکا ہو گیا۔ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ شیرینی پہلے سے لاکر رکھی تھی۔ کمرے سے باہر کوریڈور میں اس کے کئی دوست منتظر تھے۔ سبھوں کو پیش کیا۔ انھوں نے ایک ساتھ مبارکباد دی۔ پھر شعبے کے دیگر اساتذہ کا منہ میٹھا کرایا اور اس تقسیم کے ساتھ ہی جاوید کا ایم۔ فل کا وائیوا اپنے اختتام کو پہنچا۔

جاوید کا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا۔ بارہ سال پہلے اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ والدہ حیات تھیں۔ والد مرحوم ایک بڑے شہر کی سمندری بندرگاہ میں ملازم تھے۔ اسی ملازمت پر چار بہنوں اور تین بھائیوں کی زندگی کا دارومدار تھا۔ کوئی ذراعت نہ تھی اور رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہ تھا جو بُرے وقت میں مدد کر سکے۔ جاوید کے والد مرحوم نے الہ آباد شہر کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور اسی کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتے تھے۔ مگر جب ان کے ابا مرحوم جو سمندری بندرگاہ میں ملازم تھے انھیں اپنے شہر کلکتہ بلایا تاکہ انھیں بھی بندرگاہ میں ملازم کرادیں تو یہ انکار نہ کر سکے۔ انھوں نے مدرسہ میں تعلیم ضرور حاصل کی تھی مگر کھلا ذہن رکھتے تھے۔ خیال اور حقیقت کے فرق کو جانتے تھے۔ دینی اور جدید تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ اس شہر کی قلیل

آمدنی میں گھر کی کفالت اور اپنے بچوں کو جدید تعلیم نہیں دلا سکتے تھے۔ جدید تعلیم کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں جس کی تکمیل عارضی ذریعۂ معاش کے بجائے ایک معقول اور مستقل آمدنی سے ہو سکتی تھی۔ یہی سوچ کر انھوں نے اپنے شہر علم کو چھوڑا اور اس شہر میں آگئے جہاں وہ اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے لئے زیادہ سہولت حاصل کر سکتے تھے۔ یہاں انھیں جو ملازمت ملی اس میں بڑی محنت درکار تھی جس کے وہ کسی طرح اہل نہیں تھے۔ لیکن اپنے مقصد کے حصول کی خاطر وہ اس کے لئے بھی تیار ہو گئے۔

جاوید جب مطالعہ کے لئے بیٹھتا تو اپنے نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ اور بھائی بہنوں کے چہروں کو بھی یاد کرتا کہ خدا معلوم ان کے شب و روز کیسے گذر رہے ہونگے۔ نہ جانے گھر کی کیا حالت ہوگی۔ ایم۔ اے۔ کرتے ہی جاوید نے نیٹ کا امتحان دیا اور اسے وظیفہ مل گیا۔ آدھا وظیفہ میں اپنا خرچ اور آدھا گھر بھیج دیا کرتا لیکن وظیفہ ملنے سے پہلے کے پانچ سال اس کے بھائی بہنوں اور والدہ کے لئے بڑے کربناک تھے۔ جس میں فاقے بھی ہوئے، اندھیرے میں سونا بھی اور ایک ایک کپڑے میں سال گذارنا بھی۔

جاوید کو ملازمت کی اشد ضرورت تھی۔ وہ ملازمت کے لئے کہیں بھی جانے کو تیار تھا۔ اس کے لئے وہ مسلسل درخواست بھیجتا رہتا تھا۔ آخر ایک دن مغربی ہندوستان کے ایک بڑے شہر کے ایک کالج سے ایک کال لیٹر جاوید کے نام آیا۔ وہ تو کب سے اس کا منتظر تھا۔ اسلئے بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے ہوئے وہ فوراً انٹرویو کے لیے روانہ ہو گیا۔

جس شہر کو ٹرین جا رہی تھی اس کے بارے میں جاوید نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کی روزی روٹی اسے وہاں لیے جا رہی تھی۔ اپنی یونیورسٹی کے مختلف راستوں پر تنہا چلتے ہوئے وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیا اسے یہاں ملازمت ملے گی؟ کاش اسے یہاں نوکری مل جاتی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اسے یہاں نوکری مل جاتی۔ خود ہی پوچھتا تمہیں کس بنیاد پر نوکری ملے گی؟ کیوں میرے پاس ڈگری ہے فرسٹ کلاس رزلٹ ہے۔ نیٹ اور یو جی سی اسکالر شپ ہے اور تھوڑی بہت صلاحیت ہے؟ ہاں یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن

تمہیں جانتا کون ہے؟ تمہارے تعلقات کن سے ہیں؟ وہ لوگ جو تمہارے لئے کچھ کر سکتے ہیں تم نے ان کے تھیلے کب اٹھائے؟ ان کے لیے ساگ سبزی کب لائے؟ ان کے بچوں کو اسکول کب لے گئے؟ ان کی ہاں میں ہاں کب ملائی؟ ایسے لوگوں کے رفقاء ہی انٹرویو لینے آتے ہیں۔ ان کی پوری جماعت ہے جو ملک میں اپنا نیٹ ورک رکھتی ہے۔ تم نے ایسوں کی خوشیا برداری نہیں کی تو بھلا بتاؤ تمہاری ملازمت میں کون دلچسپی لے گا؟ تم نے ایسے شخص کو اپنا شناسا بنایا جس کی صلاحیت سے نٹ ورک کی جماعت خار کھاتی ہے تو بھلا نٹ ورک والے ایسے استاد کے طالب علم کی ملازمت کے لئے کیوں سوچیں گے؟ بلکہ اگر نٹ ورک کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس استاد کا طالب علم ہے تو تمام صلاحتیوں کے باوجود بھی تم کو رجکٹ کر دیں گے۔ جاوید سوچتا اس حالت میں بھلا مجھے کون یہاں پر ہونے دے گا۔ نہ جانے کیوں اس یونیورسٹی کی ایک ایک شئے سے محبت ہے۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن صرف سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم سے کم صلاحیت کے لوگ یہاں لگ گئے اور مجھے چھانٹ دیا گیا۔ لیکن جس کام کے لئے دل نہیں مانتا اسے کیسے انجام دیں۔ نا اہلوں اور جاہلوں کی خوشامد کیوں کریں۔ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ یہ پوری دنیا تو نہیں۔ ساری دنیا تو جاہل نہیں۔ کہیں نہ کہیں اور کوئی تو علم اور صلاحیت کی قدر کرنے والا ہوگا۔

ٹرین پٹری پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ جاوید کے ذہن میں بھی خیالات کی بھاگم بھاگ ہو رہی تھی۔ اس نئے شہر میں اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ اگر یہ نوکری ہو جاتی تو جیسے زندگی کی مشکلیں کم ہو جاتیں۔ یہاں سے لے کر گاؤں کے گھر تک کے روزانہ کے مسائل کا حل نکل آتا۔ ماں کی خدمت کرنے کا موقع مل جاتا۔ ایک بار پھر گھر کی غربت اور بدحالی کو یاد کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پھر اس نے خدا کو یاد کیا اور گڑگڑایا یا رب العالمین میری پریشانیوں کو دور کر دے۔ اتنی بڑی دنیا میں تیرے سوا میرا کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ رات کے اندھیرے میں ٹرین بھاگ رہی تھی۔ ڈبے کے تمام مسافر سو رہے تھے۔ جاوید جاگ کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ

رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں منظروں کا سلسلہ قائم تھا جس میں کہیں بھی مسرت نہ تھی، کہیں بھی کوئی ہمدرد نہ تھا، کوئی مددگار نہ تھا، کوئی روشنی نہ تھی، سنہرا خواب نہ تھا، دور دور تک ناامیدی تھی، دکھ تھا، آنسو تھے اور تنہائی تھی۔

سوچتے سوچتے آخر کار سفر کی آخری منزل آگئی۔اسٹیشن کے باہر ایک ہوٹل میں رات گذاری۔صبح ۹ر بجے وہ اس کالج میں پہنچ گیا جہاں انٹرویو دینا تھا۔پرنسپل چیمبر سے ملحق وزیٹرس روم تھا جس میں تقریباً بیس امیدوار بیٹھے تھے۔اس کمرے سے باہر مشرق تا مغرب ایک لمبا کوریڈور تھا جس میں دس کرسیوں پر دس امیدوار براجمان تھے۔آخری کرسی کے کنارے سبھوں سے الگ جاوید کھڑا تھا۔اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔اتنے سارے امیدواروں میں وہ کیا امید کرسکتا ہے۔میرا ہوگا؟ کہنا مشکل لگ رہا ہے۔اس میں کئی تو ایسے ہونگے جن کی کالج انتظامیہ سے پہلے سے ہی روشناسی ہوگی۔اور وہ یہیں قرب وجوار کے ہونگے بھلا ایسے میں ہم جیسے دور دراز سے آئے ہوئے کو کون پوچھے گا؟ یہاں تک آگئے ہیں تو انٹرویو تو دینا ہی ہے۔چلو خدا کا نام لے کر دے دیتے ہیں۔اپنی کوشش تو کیے لیتے ہیں یہ تو اپنے بس میں ہے بقیہ خدا پر چھوڑ دو۔جاوید انھیں خیالوں میں گم تھا اور اُدھر انٹرویو شروع ہوگیا تھا۔پانچ یا دس منٹ پر ایک ایک امیدوار باہر آرہا تھا۔حتیٰ کے صرف دو بچ گئے۔جس میں ایک جاوید تھا۔جاوید سے پہلے اُس کو بلایا گیا۔جب وہ اندر چلا گیا تو کسی نے بتایا کہ ابھی جو گیا ہے اسی کا ہوگا کیونکہ وہی سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور کسی بڑے شہر کی مرکزی یونیورسٹی سے آیا ہے۔جاوید کا کلیجہ دھک سے رہ گیا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔خود کو بھروسہ دلایا کہ اب جو ہو انٹرویو تو دینا ہے اور پوری کوشش کرنی ہے۔وہ اپنے ذہن میں ہر طرح کے سوالوں کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے ذہن وخیال کو پوری دنیا سے الگ کر کے انٹرویو پر مرکوز کرلیا۔اس نے اپنی ذہنی قوت سے خود کو ایسا بنالیا جیسے اس دنیا میں اس وقت اس کا وجود صرف اور صرف انٹرویو کے لئے ہی ہے۔وہ اس وقت کچھ نہیں جانتا ہے سوائے انٹرویو کے۔یہ سوچتے ہوئے دس منٹ گذرے ہونگے کہ مرکزی یونیورسٹی

کا امیدوار پرنسپل چیمبر سے چہرے کا پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ جاوید اس کی طرف بڑھا اور پوچھا بھئی کیا خبر ہے۔ کیسا رہا۔ وہ شخص حواس باختہ تھا۔ کہا بس ہو گیا کہتے ہوئے کوریڈور کی طرف چلا گیا۔

جاوید خود پر قابو پا رہا تھا۔ اب وہی آخری امیدوار تھا۔ تین چار منٹ بعد اس کا نام پکارا گیا۔ دروازہ ناک کر کے چیمبر میں داخل ہوتے ہوئے جاوید نے اراکین انٹرویو کو سلام کیا۔ آٹھ افراد تھے۔ بالکل سامنے چھوٹے قد، چھوٹی مونچھ، چھوٹے بال، سفاری میں ملبوس پرنسپل صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ جس کے بارے میں ایک امیدوار نے بتایا تھا۔ دائیں بائیں دورویہ قطار میں نہ جانے کون کون لوگ تھے۔ درمیان میں ایک خالی کرسی تھی۔ اجازت ملنے پر وہ بیٹھ گیا۔ گویا ترتیب نشست انگریزی کے حرف یو کی الٹی شکل تھی جس کے بیچ میں جاوید کی کرسی تھی۔ پرنسپل صاحب نے پوچھا کہاں سے آرہے ہیں۔ پھر دوسروں نے بھی ایک کے بعد ایک سوال کرنا شروع کر دیا۔ ایم۔فل کا موضوع اور اس سے متعلق بھی سوال کئے گئے۔ جاوید نے ہفتہ بھر پہلے ہی ایم۔فل کا وائیوا دیا تھا۔ سب کچھ زبانی یاد تھا۔ سینکڑوں افسانے اور افسانہ نگاروں کے نام ازبر تھے۔ بے دھڑک روانی کے ساتھ بولتا گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا آپ کتنے وقت کی نماز پڑھتے ہیں؟ جاوید نے شرماتے ہوئے کہا سر جمعہ کی پابندی سے پڑھتا ہوں۔ انھوں نے کہا یہ اچھا نہیں ہے آپ پنج وقتہ نماز پڑھیے۔ جاوید نے کہا جی انشاء اللہ پڑھونگا۔ انھوں نے کہا آج سے شروع کر دیجیے۔ جاوید نے کہا جی۔ تقریباً چالیس منٹ میں انٹرویو ختم ہوا۔ ایک صاحب نے کہا ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں۔ جاوید شکریہ کہہ کر جانے لگا تو پرنسپل نے کہا آپ باہر کے کمرے میں بیٹھئے کہیں جائیے نہیں۔ یہ سن کر ایک خوشی کی لہر اس کے دل و دماغ میں دوڑ گئی۔ شاید یقین میں بدلنے لگا۔ جسم میں نئی توانائی کا احساس ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ انٹرویو کے خول سے باہر آنے لگا۔ اس نے کالج کو اور اس کے قرب وجوار کو غور سے دیکھا۔ دو ایکٹر کے کیمپس میں کل تین عمارتیں تھیں۔ اتر میں تین منزلہ اِل ٹایپ عمارت تھی

جس میں لکچر ہوتے تھے۔ پورب میں گراونڈ فلور کی عمارت میں کینٹین تھی۔ کینٹین کے پورب میں ایک دومنزلہ عمارت میں گرلس ہوسٹل تھا۔ اس میں پرنسپل کی رہائش بھی تھی۔ بقیہ درمیان کی زمین خالی تھی جو کالج کا آنگن یا اسپورٹس گراونڈ تھا۔ گراونڈ کے مغربی کنارے میں پارکنگ تھی۔ پچھم اور اتر سے کارپوریشن کی سڑک تھی۔ دکھن اور پورب میں آدم ٹرسٹ کے ادارے تھے۔

جاوید نے دیکھا کہ سارے امیدوار جا چکے تھے لیکن مرکزی یونیورسٹی کا ابتک موجود تھا۔ وہ شاید اس انتظار میں تھا چاہے جس کا انتخاب ہو معلوم کر کے جائیں گے۔ اس نے جاوید سے پوچھا کیوں بھئی آپ نے تو بڑی دیر لگا دی۔ جاوید نے کہا مستقل سوالات ہوتے رہے اس لئے تاخیر ہوگئی۔ اس نے کہا لگتا ہے آپ کا ہی ہوگا۔ جاوید نے کہا بھئی کیا معلوم کس کا ہوتا ہے۔ آپ کا ہی ہوگا یہ کہتا ہوا وہ رخصت ہوگیا۔

کچھ ہی دیر بعد جاوید کو پرنسپل چیمبر میں بلایا گیا۔ تمام ممبران نے یکے بعد دیگرے جاوید کو مبارکباد دی۔ پرنسپل شیخ بابو لعل نے کہا آپ کا سیلکشن ہوگیا ہے۔ آپ کب جوائن کرنا چاہتے ہیں۔ جاوید کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے کہا سر میں ابھی جوائن کر سکتا ہوں۔ پرنسپل نے کہا ابھی تو شام ہوگئی ہے آپ کل آ کر ڈیوٹی جوائن کرلیں۔ جاوید نے تمام افراد کا شکریہ ادا کیا۔ سر کل جوائن کرونگا پرنسپل سے کہا اور اجازت لے کر چیمبر سے باہر آ گیا۔

دوسرے دن ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے وہ نو بجے صبح کالج میں پہنچ گیا۔ اس کی ملاقات صدر شعبہ سے ہوئی جو گذشتہ دن انٹرویو میں بھی تھے۔ اس کے ذہن میں یونیورسٹی کے صدر شعبہ کا خاکہ تھا لیکن یہاں کی تصویر بالکل مختلف تھی۔ گنجا سر، چپٹا منہ، موٹا جسم، سرخ و سفید رنگ، کلین شیوڈ، بش شرٹ، پتلون اور پمپ شو میں صدر شعبہ دھنسے ہوئے تھے۔ پرانے زمانے کے اسی شہر کے کاڈیا کالج کے ایم۔ اے تھے۔ وہاں کی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو نہ تھا۔ مختلف کالجوں میں پوسٹ گریجویٹ سنٹرس قائم تھے جہاں سے طالب علم ایم۔اے۔ کر لیتے تھے۔ جاوید نے دوپہر سے پہلے ڈیوٹی جوائن کرلی۔ صدر شعبہ نے ٹائم

ٹیبل دیا جس میں یو جی اور پی جی دونوں کے لکچرس تھے۔ وہاں کلاس لینے کو لکچر لینا کہتے تھے۔ جاوید نے پہلے دن سے ہی یو جی اور پی جی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ جہاں جہاں کلاس ہو رہی تھی صدر شعبہ نے وہاں لے جا کر لکچر روم اور پڑھاتے ہوئے کلیگ سے ملوایا۔ ان میں ایک محترمہ بھی تھیں سید شمیم ماما میاں۔ گیہواں رنگ، حد سے زیادہ فربہ، چوڑا پھیکا چہرہ، بھدا میک اپ، متوسط قد، شلوار قمیص میں ملبوس عمر پینتیس کے اوپر صدر نے کہا انھیں کا نیا تقرر ہوا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ محترمہ بولیں۔ اچھا ہے ان سے اردو سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ایک اور کلاس میں لے گئے۔ ایک لمبے قد کے گنجے کلین شیوڈ، لمبا چہرہ، بش شرٹ پتلون اور چپل پہنے ہوئے تھے شہپر علی۔ ان سے تعارف کرایا گیا۔ انھوں کوئی ردِ عمل نہ کیا۔ مبارکباد نہ دی۔ پوچھا کہاں سے آئے۔ جاوید نے بتایا۔ سن کر چہرا گھما لیا اور پھر سے پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ وہاں سے دونوں کینٹین میں گئے جو کالج کی مین بلڈنگ سے بیس قدم پر ایک منزلہ بلڈنگ کے گراونڈ فلور پر تھی۔ چائے پینے کے بعد صدر نے کہا آپ آج سے ہی لکچر لینا شروع کر دیجیے۔ جاوید نے ایسا ہی کیا۔ کلاس میں طلباء اور طالبات دونوں تھے۔ سبھوں نے بڑے غور سے جاوید کا لکچر سنا۔ لکچر کے بعد ان کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی چمک تھی۔ گویا آج لیکچر اور لکچر لینے والا دیگر اساتذہ سے مختلف تھا۔

اگلے روز جاوید صدر شعبہ کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا۔ مختلف سبجکٹس کے استاد آنے شروع ہوئے۔ صدر نے یکے بعد دیگرے سبھوں کا تعارف جاوید سے کرایا۔ یہ ہیں پروفیسر زولوجی کے، یہ ہیں پروفیسر بوٹنی کے، یہ ہیں پروفیسر میتھس کے، یہ ہیں پروفیسر کیمسٹری کے۔ گویا کوئی بھی استاد پروفیسر سے کم نہ تھا۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنا تعارف اپنے نام میں پروفیسر کے ساتھ ہی کرتے یعنی میں ہوں پروفیسر خلیل، شکیل، جلیل، ریاض، نیاز، میعاد اور آپ۔ جاوید کے کہنے سے پہلے صدر نے کہا یہ ہیں پروفیسر جاوید۔ اپنے نام کے ساتھ جوائننگ کے دوسرے دن ہی پروفیسر کا لفظ سن کر جاوید کو دھچکا لگا۔ حد ہے۔ دو دن میں

اس لئے وہ پیدل گھر کے لئے چل پڑا۔ گاؤں کے کنارے قبرستان کے نزدیک وہ املی کا پیڑ کھڑا تھا جس پر بھوت رہتا تھا۔ پیڑ کے نیچے سے گذرتے ہوئے اس کا بدن سہم گیا۔ دور کتے بھونک رہے تھے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔ آخر اس کا گھر آ گیا۔ آنگن میں داخل ہوا تو وراندے پر ماں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ لالٹین روشن تھی۔ نماز ختم ہوئی۔ اس نے سلام کیا۔ ماں نے جواب دیتے ہوئے کہا بابو ہے اتنی رات میں کب آئے؟ وہ بولا بس ابھی پہنچا ہوں۔ آپ نماز پڑھ رہی تھیں۔ بہنیں اور بھائی سو رہے تھے۔ والدہ نے سبھوں کو جگایا۔ اٹھو اٹھو بابو آیا ہے۔ چلو اٹھو۔ بھوکا ہوگا۔ جلدی کھانا پکاؤ۔ سب اٹھ کر کھانا تیار کرنے لگے۔

کھانے کے بعد جاوید نے مٹھائی کا پیکٹ ماں کے ہاتھوں میں دیا۔ اور کہا ماں یہ میری ملازمت کی مٹھائی ہے۔ ماں نے نہیں سمجھا۔ اس نے بتایا ماں مجھے ایک بڑے شہر کے کالج میں لیکچرر کی نوکری مل گئی ہے۔ اب ماں نے سمجھا اور فوراً دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ مبارک ہو بیٹے۔

دوسرے دن وہ یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوگیا جہاں ہوسٹل میں اس کا ضروری سامان اور بستر تھا۔ کیونکہ ایک ہفتہ کے اندر اسے ملازمت پر حاضر ہونا تھا۔ ہوسٹل سے بستر اور کتابیں لے کر وہ پونا کو روانہ ہوگیا۔ روانگی کے ایک دن پہلے ایک استاد نے اس سے کہا کہ اسی شہر میں میرا بیٹا رہتا ہے۔ تم اس سے ضرور ملنا۔ تم عمان احمد سے بھی ملنا۔ وہ یہیں کا رہنے والا ہے۔ اور اسی کالج میں معاشیات میں لیکچرر ہے۔ اس کے والد سے ایک خط لے لو۔ تمہاری رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔ یار یہ خط لینا عجیب لگ رہا ہے۔ نوکری کے لیے خط نہیں لیا اور رہائش کے لئے خط۔ چلو لے لو۔ کرایہ تو سب کو دینا ہے۔ عمان احمد کے والد سے خط لے کر تیسرے دن پونا پہنچ گیا۔ عمان احمد نیہا جی نگر میں کرایے کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ ان سے ملاقات کی۔ علی گڑھ سے ان کے والد کا خط بتایا۔ خط پڑھکر ان کے چہرے پر اداسی کی لکیر کھینچ گئی۔ وہ سوچنے لگے کہ یار یہ نئی مصیبت کہاں سے آن پڑی۔ والد صاحب کو بھی بیٹھے بٹھائے یہی سب سوجھتی رہتی ہے۔ کسی کو بھی کہیں بھیج دیتے ہیں۔ اب کچھ تو کرنا

وہیں ڈیرا جمائے رہتے ہیں۔

کالج کا ٹائم ٹیبل صبح ساڑھے سات بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک تھا۔اور جونیر کالج کا بارہ سے چھ بجے تک۔ جاوید اکثر دیکھتا کہ درمیان میں کوئی نہ کوئی پروفیسر ایک دو گھنٹے کے لئے غائب ہو جاتے اور پھر دکھائی پڑتے۔ایک دو سے پوچھا بھی تو اس نے بتایا کہ ہاں ایک ضروری کام تھا۔لیکن یہ ضروری کام روزانہ ہوتا تھا اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ایک پروفیسر تو ایسے تھے جو کلاس کے بعد ایک منٹ کالج میں نہیں ٹھہرتے تھے۔کلاس ختم ہوتے ہی جیب سے ٹائم ٹیبل نکال کر دیکھنے لگتے۔معلوم ہوا ان کے پاس دو ٹائم ٹیبل ہے۔ایک کالج کا اور ایک کالج کے باہر کا۔یہ کالج کے باہر کا کیسا ٹائم ٹیبل ہوا۔یہ پروفیسر آگے چل کر اسی کالج کے پرنسپل ہوئے۔

جوائن کرنے کے دو دن بعد جاوید نے پرنسپل سے کہا کہ سر میرا سارا سامان یونیورسٹی ہوسٹل میں ہے جہاں میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہا تھا۔اسے جا کر لانا ہوگا۔پرنسپل نے کہا دو تین دن کے بعد چلے جاؤ اور ایک ہفتے میں واپس آجانا۔میں چھٹی دے دونگا۔جاوید نے یونیورسٹی جانے کے بجائے اپنے وطن جانے کا ارادہ کیا جہاں گاؤں میں اس کی والدہ رہتی تھیں۔یہ خوشخبری سب سے پہلے وہ اپنی ماں کو دینا چاہتا تھا۔وہ ماں جس نے برسوں سے تکلیف اٹھائی مگر کبھی اس کے سامنے اپنے دکھوں کا ذکر نہ کیا۔وہ سمجھتا رہا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے مگر گاؤں میں پڑوسیوں نے بتایا کہ آپ کی والدہ روزمرہ کی ضروریات کی محتاج ہوگئی ہیں لیکن وہ کسی کو بتاتی نہیں۔اس ملازمت کے بعد اب اس کے گھر میں بھی خوشیاں آئیں گی۔اب اس کے اہل خانہ بھی خوشحالی کی زندگی گذاریں گے۔اس کو خیال آیا کہ جب وہ اپنی ماں سے اس کا ذکر کرے گا تو وہ کتنا خوش ہونگی۔

ٹرین کے لمبے سفر کے بعد تیسرے دن رات کے آٹھ بجے وہ دربھنگہ شہر سے تیس کیلومیٹر دور اپنے گاؤں دہ نشیں پہنچا۔عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔اس کا گھر آگیا۔پورا گاؤں اندھیرے میں غرق تھا۔روڈ سے گاؤں تک دو کیلومیٹر کچی سڑک تھی۔کوئی سواری نہیں ملی

ہی پڑے گا۔ ان کے کرائے کے فلیٹ میں ایک کمرا ایسا تھا جس میں تین جوان رہتے تھے۔ دو یونانی کالج کے طالب علم تھے اور ایک نائٹ ہائی اسکول میں اردو پڑھانے والا ماسٹر۔ پروفیسر عثمان احمد نے کہا آپ ایسا کریں اپنا بستر اسی کمرے میں لے آئیں اور انھیں لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیجئے۔ جاوید نے کہا جی آپ کا شکریہ۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ تینوں کے بستر جیسے تیسے لگے تھے۔ ہر کونے میں ایک سوٹ کیس رکھا تھا۔ دیواروں پر کپڑے ٹانگنے کے لئے ہینگر لگے تھے۔ لگتا تھا مزدور کا کمرا ہے جہاں ایک ہفتہ سے صفائی نہیں کی گئی ہے۔ اس نے ایک طرف بستر لگا لیا۔ کپڑے بدل کر آرام کرنے لگا اور آئندہ کے پروگرام پر غور کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ابھی تو مجھے اس شہر کی کوئی جانکاری نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو یہاں کا جغرافیہ معلوم کر کے کسی دوسری جگہ شفٹ کر جائیں گے۔ ان لوگوں کے ساتھ زیادہ دنوں نہیں رہا جا سکتا۔ میرے پڑھنے لکھنے کا اپنا ڈھنگ ہے اور اپنے اوقات ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی مرضی کے مطابق رہنا ہوگا اور یہ مجھے پسند نہیں۔ ابھی مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ بھی مکمل کرنا ہے اور اس کے لئے مکمل سکون اور آزادی چاہئے جوان لوگوں کے ساتھ ناممکن ہے۔ یہی سب سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔ شام میں ہوا خوری کے لیے باہر نکلا اور ٹہلتے پھرتے نو بج گئے۔ ہوٹل سے کھانا کھا کر واپس کمرے آگیا۔

کہتے ہیں اسٹوڈنٹ لائف پرنس لائف اور وہ بھی جب یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہ رہے ہوں مرضی سے سونا، مرضی سے اٹھنا، جب چاہو کلاس میں جاؤ یا نہ جاؤ، لائبریری میں پڑھو یا کینٹین میں بیٹھو یا سینما جاؤ، یا شہر میں گھومو یا دوسرے ہوسٹلوں میں دوستوں کے ساتھ گپیں مارو یا سڑک کے کنارے چائے خانے میں اڑتی ہوئی دھول میں بیٹھے چائے پیو کوئی روکنے والا نہیں کوئی منع کرنے والا نہیں۔ گویا مکمل آزادی۔ جاوید کو جو ٹائم ٹیبل دیا گیا اس میں پہلی کلاس ساڑھے سات بجے اور کالج پانچ کیلومیٹر دور۔ دس منٹ پیدل چلنے کے بعد بس اسٹاپ اور پانچ کیلومیٹر بس کے سفر کے بعد بس اسٹاپ سے کالج پھر پندرہ منٹ

پیدل اس کے علاوہ اور کوئی سہولت نہیں۔یعنی ساڑھے سات بجے کی کلاس کے لئے ساڑھے چھ بجے فلیٹ سے نکلو اور ساڑھے چھ بجے نکلنے کے لئے ساڑھے پانچ بجے اٹھ کر تیاری کرو۔رات میں ایک دو بجے سونے کی عادت اور یہاں ساڑھے پانچ بجے اٹھنا۔کئی بار تو ایسا ہوا کہ ساڑھے چھ بجے اٹھا اور جلدی سے صرف منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر کے کالج بھاگا۔دو بجے واپس آنے کے بعد صبح کی ضروریات سے فارغ ہوتا۔کبھی کبھی تو جی میں آتا گولی مارو ایسی نوکری کو کہاں آ کر پھنس گئے۔سوا سات بجے سے ہی پرنسپل کالج کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا رہتا۔ساڑھے سات کے ایک منٹ بعد گیٹ بند کر دیا جاتا۔ ساڑھے سات بجے اسٹاف روم میں ایک رجسٹر پر تمام پروفیسروں کو دستخط کرنا پڑتا۔ دوسرا حاضری کا رجسٹر دن کے بارہ بجے اسٹاف روم میں آتا۔تیسرا رجسٹر ہر ڈپارٹمنٹ میں ہوتا جس میں آمد اور روانگی کا اندراج کیا جاتا۔ساڑھے سات بجے والے رجسٹر میں جس کا دستخط نہ ہوتا اسے دس بجے پرنسپل چیمبر میں بلایا جاتا اور ڈانٹ پھٹکار لگائی جاتی۔ساڑھے چھ بجے صبح اٹھنے کی عادت نہ تھی۔اکثر دیر سے آنکھ کھلتی۔آخر کار اس نے ایک الارم کلاک خریدا اور ہر شب اسے اپنے سرہانے چابی بھر کے رکھتا۔اور رات کی بقیہ نیند کالج سے واپس آ کر تین چار بجے سہ پہر میں دو گھنٹے سو کر پوری کرتا۔جیسے ہی گیارہ بارہ رات کے بجتے اور جاوید مطالعہ کر رہا ہوتا فوراً تینوں میں سے کوئی بولتا سر لائٹ بند کر دیجئے ہم لوگوں کو نیند آ رہی ہے جبکہ وہی وقت جاوید کے مطالعے کا ہوتا۔وہ اپنے غصے کو ضبط کر لیتا اور گھنٹوں فرشی بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔اسے نیند نہیں آتی۔ظاہر ہے برسوں کی عادت بھلا ایک مہینہ میں کیسے بدل جاتی یا ختم ہو جاتی۔اسے ہر رات اس کرب کو برداشت کرنا پڑتا۔وہ جلد سے جلد کہیں شفٹ کرنا چاہتا تھا مگر کوئی مناسب جگہ نہیں مل رہی تھی۔کوئی جگہ ملتی تو بس اسٹینڈ سے دور، کوئی بازار اور ہوٹل سے دور، کوئی غیر مسلموں کے علاقے میں اور کوئی ایسی جہاں سے ڈائرکٹ ایک بس نہیں تھی بلکہ تین تین بس بدلکر آنا پڑتا۔انھیں مجبوریوں کو دیکھکر اسے دو مہینہ اسی تین اشخاص پر مشتمل فرشی کمرے میں گذارنا پڑا۔

غیر موافق رہائش نے جاوید کو ذہنی طور پر بیمار کر دیا تھا۔ آخر کار اس نے اس کا ذکر پروفیسر عمان احمد سے کیا۔ انھوں نے پراپرٹی ایجنٹ کیطرح یقین دلاتے ہوئے کہا آپ پریشان نہ ہوں میرے دوست ہیں پروفیسر نسیم فیزکس پڑھاتے ہیں۔ دو کمرے کے فلیٹ میں وہ اکیلے رہتے ہیں۔ ماشاء اللہ کنفرمڈ بیچلر ہیں۔ ان کی ہر شام میرے یہاں گذرتی ہے۔ میں آج ان سے بات کر لیتا ہوں۔ آپ کل کالج کینٹین میں ڈیڑھ بجے ملئے وہیں پر پروفیسر نسیم سے آپ کی رہائش کا معاملہ بھی طے کر لیں گے۔

متعینہ دن پروفیسر عمان، پروفیسر نسیم اور جاوید کینٹین میں بیٹھے تھے۔ پروفیسر نسیم کو جاوید نے غور سے دیکھا۔ انھوں نے بھی جاوید کو دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں جیسے شرما گئے ہوں۔ بوٹا سا قد، سر پر بال قابل شمار، چھوٹی آنکھیں، چھوٹا چہرہ، چھوٹی ٹانگیں اور وہ بھی ساڑھے چار فٹ آدمی کی ٹانگیں بھلا کتنی بڑی ہونگی۔ پروفیسر نسیم ہنستے تو چپ ہونے پر آنسو نکل آتے جیسے ہنستے ہوئے بچے سے کوئی چیز چھین لی جائے تو اس کی آنکھوں کا آنسو اس کے رخسار پر پھیل جائے اور کھلونا واپس کر دینے پر لپٹے ہوئے آنسوؤں میں بھی ہنسنے لگے۔ پروفیسر نسیم بچے کا یہ رول پروفیسر بن کر کر رہے تھے۔ اور اس کھلونے کی چابی پروفیسر عمان کے ہاتھ میں تھی۔ آنسو پونچھ لینے کے بعد جاوید کی طرف دیکھتے تو جاوید کو ان پر سرکس کے مسخرے کا گمان ہوتا۔ چھوٹی پتلون، چھوٹی بش شرٹ اور میلے جوتے میں ان کی شخصیت سرشار کے خوجی کی نمائندگی کر رہی تھی۔ جاوید نے سوچا اگر یہی پروفیسر نسیم ہیں تو خدا خیر کرے ان کے ساتھ میں کتنے دن رہ پاؤنگا۔ پہلی ہی نظر میں جاوید کو وہ پسند نہ آئے۔ وہ شہر میں نو وارد تھا۔ اسے کمرے کی ضرورت تھی۔ مصلحت یہی سمجھا کہ میاں چپ رہو اور سنتے جاؤ جس طرح پروفیسر عمان کی کچی پکی سنتے رہے ہو۔

پروفیسر نسیم کے فلیٹ میں ایک کمرا خالی تھا۔ دو کمروں کے فلیٹ میں وہ تنہا سات برسوں سے کنوارے دن رات گذار رہے تھے۔ پروفیسروں نے بتایا کہ ابتک حضور کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی ہے۔ ان کے سولہواں کو گذرے تقریباً چوبیس سال ہوگئے تھے یعنی

چالیس کی سرحد پر ان کے شباب رفتہ نے قدم رنجہ فرمالیا تھا مگر محترم اب بھی کسی سولہ سالہ چھریرے جسم، دراز قد، دراز چشم،، دراز زلف اور در دانہ دندان کی تلاش میں تھے۔ جاوید خاموشی سے ان کی ساری گفتگو سنتا رہا۔ یہ طے پایا کہ دوسری شب وہ پروفیسر نسیم کے ہاں ماجلکے ویہار کالونی مع سامان ولزوم کے انتقال کر جائیں۔ پروفیسر عثمان کے اس فیصلہ کو سن کر پروفیسر نسیم ''ہیں ہیں ہیں'' کرنے لگے۔ جب پروفیسر عثمان نے انھیں روکا تو وہ رک گئے۔ معلوم ہوا کہ اس کھلونے کی چابی پروفیسر عثمان کی جیب میں رہتی ہے جب چاہا ہنسا دیا جب خواہش ہوئی رلا دیا۔

دوسری شب جاوید اپنے سامان کے ساتھ ان کے سکنڈ فلور کے فلیٹ کے در پر تھا۔ پروفیسر نسیم نے دروازہ کھولا۔ جاوید کو غور سے دیکھا۔ گراونڈ فلور پر رکھے اس کے گنتی کے سامان کو تاڑا اور زبردستی مسکرائے۔ سامنے کے دو دانت چند لمحے کو نظر آئے پھر ہونٹوں نے انھیں چھپالیا۔ انھوں نے جاوید پر اس طرح نگاہ ڈالی جیسے دولت مند مفلس کو دیکھتا ہے۔ فرمایا اچھا تو آپ آ ہی گئے۔ وہ اس وقت کرتا پاجامے میں ملبوس داڑھی مونچھ صاف چہرے میں کئی بچوں کے باپ دکھائی دیے۔ جاوید نے اس خیال کو جھٹکا اور ان سے پوچھا کہ حضور سامان کہاں رکھوں۔ انھوں نے ایک ویران سا خالی کمرا دکھایا جس میں چار دیواروں اور ایک فرش کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ فلیٹ میں داخل ہونے کا راستہ وہی کمرا تھا۔ چھوٹا آٹھ بائی آٹھ اور کھڑکی سے محروم۔ جاوید دوسری منزل پر تین بار سیڑھیوں سے اپنے تین سامان کو ہاتھوں میں لے کر چڑھا۔ پروفیسر نسیم اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے زینے پر چڑھنے اترنے اور کمرے میں سامان رکھنے کی آواز سنتے رہے، اندازہ کرتے رہے اور اخبار پڑھتے رہے۔ جب وہ سارے سامان لا چکا تو پروفیسر نسیم اس کے کمرے میں آئے۔ انھوں نے لباس بدل لیا تھا۔ فلیٹ سے باہر جانے کا راستہ جاوید والے کمرے ہی سے تھا۔ انھوں نے ہر کمرے کی لائٹ آف کی۔ فلیٹ میں تالا لگایا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ جاوید بھی پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ان سے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔

انھوں نے کہا میں ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے وہ پروفیسر عمان کے پاس جا رہے تھے۔ وہ اپنے اسکوٹر کے پاس پہنچ گئے۔ اسکوٹر اسٹارٹ کر دی۔ جاوید نے کہا حضور کمرے کی چابی تو دے دیجئے میں اکیلا کہاں اور کدھر بھٹکتا پھرونگا۔ وہ بولے بھئی میری تمام چابیاں ایک رنگ میں پھنسی ہوئی ہیں میں اسکوٹر کس طرح اسٹارٹ اور بند کرونگا۔ یہ کہتے ہوئے اسکوٹر اسٹارٹ کر دی۔ جاوید نے دوڑتے ہوئے پوچھا کہ یہ تو بتا دیجئے یہاں پر آس پاس کوئی کینٹین یا ہوٹل وغیرہ ہے۔ انھوں کہا دیکھ لیجئے گا کہیں پر مل جائے گی اور اسی کے ساتھ زن سے نکل گئے۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ اندھیری رات تھی۔ چہار جانب چھ چھ منزلہ عمارتوں کی کھڑکیوں سے مدھم روشنی باہر آ رہی تھی۔ مدھم روشنی نے رات کو سنسان بنا دیا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ پتلی سڑک دائیں بائیں تھوڑی دور جا کر دو دو ہو گئی تھی۔ آٹو رکشے والے نے اس کو اس رہائشی کالونی میں بتائے ہوئے پتے پر پہنچا دیا تھا۔ اس پتے کے علاوہ جاوید کو یہاں کی کسی چیز کا علم نہ تھا۔ آدم اور آدم زاد کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ فاصلے پر اسٹریٹ لائٹ سردی کے کہاسے اور شبنم سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ اس نے جلد بازی میں سوئٹر بھی نہیں پہنا تھا۔ ٹھنڈک اس سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ سنسان سڑک پر کھڑا ہوا وہ سوچتا رہا کہ یا خدا کدھر جاؤں۔ کوئی آتا جاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کس سے پوچھوں۔ بھوک لگ رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ فلیٹ کا تالا توڑ کر سامان نکالوں اور کسی ہوٹل میں جا کر ٹھہر جاؤں اور کل جب ان سے کالج میں ملاقات ہو تو وہ لعنتیں ان پر بھیجوں جو خدا نے ابولہب کے لئے قران میں بیان کیا ہے۔ اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مگر یہاں حالات کی نوعیت مختلف تھی۔ اس کالونی میں آنے کیلئے رکشا والے بڑے اصرار پر تیار ہوتے تھے۔ کالونی مین روڈ سے چار کیلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ آٹو رکشا مین روڈ پر ملتا تھا۔ رکشا والے اس کالونی میں آنے کے لئے اس لیے ہچکچاتے تھے کہ واپسی پر انھیں پسنجر نہیں ملتا تھا۔ اس صورتِ حال میں اس کا تالا توڑنا اور ہوٹل جانا بھی ناممکن تھا۔ کالونی سے ہوٹل کی دوری دس کیلومیٹر تھی۔

جاوید آدھے گھنٹے تک انجان راستوں پر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ آخر کار ایک جگہ روشنی کا سلسلہ نظر آیا۔ اتفاق دیکھئے قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ روشنی کینٹین کی ہے۔ کسی طرح کھانا زہر مار کیا۔ باہر نکلا تو فلیٹ کیطرف جانے کا راستہ پھر انجانا سا لگا۔ اندھیرے میں حافظہ کام نہیں کر رہا تھا۔ کینٹین سے نکلتے ہوئے ایک آدمی سے جو اچانک خدا معلوم کہاں سے آ گیا تھا اپنے فلیٹ کا پتہ پوچھا۔ اس نے بتایا۔ چند منٹوں میں وہاں پہنچ گیا۔ گویا لمبا چکر کاٹ کر وہ فلیٹ کے پاس ہی بھٹک رہا تھا۔ وہاں پہنچا تو دور سے ہی تالے شریف چمکتے نظر آئے۔ نیچے اتر آیا۔ ایک بار پھر کینٹین میں جا کر پروفیسر کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے گیارہ بجے وہ تشریف لائے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد پہلا جملہ ارشاد فرمایا۔ کہئے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا بلڈ پریشر دبایا اور کہا ایسی تو کوئی بات نہیں۔ انھوں نے دوسرا سوال کیا۔ تم نے اردو میں ایم۔ اے کیا ہے۔ شعبۂ اردو علی گڑھ کی سناؤ۔ وہاں تو بڑی بہار ہوتی ہے۔ جدھر دیکھو تتلیاں، لڑکیاں پریاں۔ اس نے کہا کیا آپ بھی ادھر جایا کرتے تھے۔ بولے اماں یار مجھے اتنی فرصت کہاں ملتی تھی۔ مگر ان کے چہرے کے خدوخال بتا رہے تھے کہ حضور نے بھی ان سڑکوں کی آبلہ پائی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے لائق نظر نہ بنے۔ اس رات پروفیسر نسیم صرف علی گڑھ اور دوشیزوں کی پوچھ تاچھ کرتے رہے۔ معلوم نہیں کب کا ذخیرہ تھا جس کو وہ آج خرچ کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ وہ ٹوٹا پھوٹا جواب دیتا رہا۔ تھک گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی گفتگو خشک اور بے مزہ ہوتی گئی۔ مگر ان کی لن ترانی شروع تھی۔ آخر وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف رخصت ہوا کہ باقی کل سناؤنگا۔

جاوید صبح آٹھ بجے بیدار ہوا۔ ان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ حضور سن رسیدگی کے خواب حور و غلماں میں محو پرواز تھے۔ وہ کالج جانے کو تیار ہو گیا۔ ناشتہ کہیں بھی کر لونگا۔ علی گڑھ کی آٹھ سالہ زندگی میں بھی یہی دستور رہا۔ ہوسٹل میں نہ کبھی خود کے لیے ناشتہ کھانا بنایا نہ ہی دوسروں سے ناشتہ یا چائے بنانے کو کہا۔ ایسے جھمیلوں سے کبھی سابقہ ہی

نہیں پڑا۔ ہوٹل زندہ باد۔

جاوید نے آواز دی جناب نو بجنے والے ہیں کالج جانا ہے یا نہیں۔ آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے ہوئے کھولا۔ ٹیڑھے میڑھے تھے ایک دو منٹ میں سیدھے ہو گئے۔ اپنے چہرے کو سکوڑا اور بھاری آواز میں بولے۔

"بھئی ایسا ہے ذرا دو پیالی چائے بنالو۔"

اسے یہ فرمان سن کر ایسا لگا جیسے کسی نے اسے آواز کرتے ہوئے بارود کے ڈھیر پر رکھ دیا ہو۔ قیام علی گڑھ میں ایسے بکھیروں سے وہ ہزاروں قدم دور تھا۔ وہاں اس نے آٹھ سال قلندرانہ زندگی گذاری تھی۔ علی گڑھ کے پہلے بھی کسی نے اسے کسی کام کے لیے حکم نہیں کیا تھا۔ نئے شہر میں پہلی بار اس کے کانوں نے ایسے جملوں کی آواز سنی۔ وہ نوکری کرنے آیا تھا۔ یہ اس کی عملی زندگی تھی۔ یہاں اسے جاننے والا ایک فرد نہ تھا۔ نئی جگہ نئے لوگ۔ لوگوں نے اسے ہدایتیں بھی کی تھیں۔ وہ غصہ کو پی گیا۔ جیسے تیسے اس نے چائے بنا دی۔ چائے پی کر پروفیسر نسیم پھر بستر پر دراز ہو گئے اور اپنی قوت گویائی کو سمیٹ سمیٹ کر گمبھیر ہو کر بولے۔ بھئی ایسا ہے کہ ذرا کالونی کے گیٹ پر چلے جاؤ اور آدھا لیٹر دودھ، ایک بریڈ، دو انڈے، ولس سگریٹ کا ایک پیکٹ، ڈھائی سو گرام پیاز، تھوڑی ہری مرچ اور ڈھائی سو ٹماٹر لیتے آؤ۔ پتلون کی جیب میں پیسے ہیں نکال لو۔

دوسرا حکم نامہ سن کر جاوید کے پاؤں کا خون سر پر پہنچ گیا اور جی میں آیا کہ پاپوش کی دس بارہ ضربیں ان کے اجڑے چمن پر رسید کر دیں تا کہ یہ پھر سے سو جائیں مگر اس شہر میں بھی بمبئی کی طرح رہائش بڑی مشکل سے ملتی ہے یہ سوچ کر ایک بار پھر ضبط کر گیا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے ایک دن کی تو بات ہے ممکن ہے آج کوئی مجبوری ہو گی۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو یہاں صرف ایک کرایہ دار کے طور پر آیا ہے۔ درمیان میں یہ کھانے کا کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے۔ یہ تو اس وقت ہونا چاہئے جب آپس میں بیٹھ کر طے ہو جائے کہ کھانا پینا مشترکہ طور پر بنے گا یا بنایا جائے گا۔ کوئی فیصلہ ہوئے بغیر اسے بار بار

احکامات کیوں دیے جارہے ہیں۔

زندگی میں پہلی بار جاوید نے اشیائے خوردنی کی خریداری کی۔ ساری چیزیں باورچی خانے میں لاکر رکھ دیں۔ پروفیسر نسیم کچن میں آئے اور کہا پیاز نکال لو، مہین تراشنا، انڈے اس پلیٹ میں توڑو اور بریڈ کو سینک لو اور چائے کا پانی ڈال دو۔ یہ ہدایتیں دے کر وہ پھر اپنے کمرے میں بستر پر لمبے ہو گئے اور وہیں سے فرمایا ذرا دیکھنا اخبار آیا کہ نہیں۔ جاوید نے اخبار ان کے ہاتھ میں دے کر پیاز کے چھلکے اتارنے لگا۔

دونوں نے ناشتہ کیا۔ انھوں نے سگریٹ پی لباس تبدیل کیا اور نیچے اسکوٹر کے پاس پہنچ گئے۔ تالا لگا کر جاوید بھی نیچے آ گیا۔ پروفیسر نسیم نے اسکوٹر کی طاق میں سے کپڑے کی صافی نکالی جاوید سے کہا ذرا سیٹ صاف کر دینا۔ سیٹ صاف ہو گئی۔ جاوید ان کے پیچھے اسکوٹر پر بیٹھ گیا۔ پانچ چھ بار پاؤں جھاڑنے پر اسکوٹر اسٹارٹ ہوا اور جیوں ہی وہ ہچکولے کے ساتھ آگے بڑھتا نسیم بھی اپنی سیٹ سے آگے کھسک جاتے۔ بریک لگائی۔ خود کو پیچھے کیا اور پھر رفتار بڑھائی۔ کالونی سے کالج تک تقریباً بیسیوں عورتوں اور لڑکیوں کو راستے میں اسطرح چندھیا کر دیکھا کہ اسکوٹر کئی بار الٹتے الٹتے سنبھل گیا۔ ایک جگہ ایک ٹرک کے دائیں طرف سے اسکوٹر نکالنا تھا۔ داہنی طرف ہی سڑک کے کنارے ایک سائیکل والا کھڑا تھا۔ دونوں کے درمیان سے نسیم اسکوٹر نکال رہے تھے کہ اچانک ٹرک کا انجن زور سے گڑگڑایا۔ حضرت گرج سنتے ہی سائیکل پر اسکوٹر کے ساتھ لیٹ گئے۔ جاوید نے پاؤں زمین پر ٹیک دیا اور اسکوٹر کو کھڑا کیا۔ وہ سیدھے ہوئے۔ جاوید سے چہرہ چھپائے ہوئے ٹرک کو گالی دی اور اسکوٹر چلانے لگے۔

رات کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ بیٹھے تو ساتھ ساتھ تھے مگر اپنی اپنی سوچوں میں غرق۔ گویا سوچ سوچ کر کھایا گیا۔ کالونی سے باہر کی سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے انھوں نے کہا یار کوئی اچھا سا شعر سناؤ۔ جاوید نے کئی بار انھیں غلط اردو بولتے ہوئے سنا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ شعر کا حشر کیا ہوگا۔ اس لئے ٹال دیا۔ اسے معلوم تھا پروفیسر کی شادی میں

GOVT. URDU LIBRARY, PATNA

تاخیر ہو رہی ہے اس لئے اس نے اس موضوع کو چھیڑ دیا اور کہا لگتا ہے آپ نے اس طرف ابھی تک توجہ نہیں فرمائی۔ ان کی دکھتی رگ پھڑک گئی بولے اماں یار کوئی مناسب لڑکی نہیں مل رہی ہے۔ تم ایسا کرو اب کی بار علی گڑھ جاؤ تو ایک لڑکی کا انتظام کرنا۔ کانونٹ کی تعلیم یافتہ، لمبا قد، لمبے بال، شیریں آواز، نہ زیادہ موٹی نہ زیادہ دبلی، رفتار با انداز، انگلیاں باریک، ہرن جیسی آنکھیں اور ان کے ساتھ سکۂ رائج الوقت پانچ لاکھ نقد۔ جاوید نے کہا بس بس۔ اتنی فرمائشوں کو سننے کے بعد جاوید نے پروفیسر نسیم کے حلیے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا تو ایسا لگا جیسے کوئی اپاہج ہمالیہ پر چڑھنے کا ہشت پہلو منصوبہ بنا رہا ہو۔ اسکی ہنسی پھوٹ پڑنے کو تھی مگر ضبط کر لیا کہیں پروفیسر دیکھ نہ لے۔ یہ وہی پروفیسر نسیم تھے جو اپنے منسوب کے لئے پروفیسر عمان کے ساتھ ایم۔ جی۔ روڈ پر کسی لڑکی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ وہ لڑکی پروفیسر عمان سے بے تکلف تھی اور انھیں چچا کہتی تھی۔ ان کے کان میں کہا کہ انکل آپ کے ساتھ یہ کون انکل آئے ہیں اور وہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئے جن کا انتظار ہمارے گھر کے تمام افراد کر رہے ہیں۔ یہ سن کر تو پروفیسر عمان حواس باختہ ہو گئے۔ بڑی مشکل سے بہانہ بنا کر وہاں سے انکل نسیم کو لے کر نکلے۔ اور آج یہ ایسی گفتگو کر رہے ہیں جیسے ان کی جوانی کا آغاز ابھی ابھی ہوا ہے۔ جاوید نے سوچا کہ کوئی لڑکی پروفیسر نسیم کو دیکھ کر ہرگز شادی نہیں کر سکتی ہاں پروفیسر کے والدین کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈ لیں جو آنکھ کی اندھی اور گانٹھ کی پوری ہو تو اور بات ہے۔

اس دن کالج میں اساتذہ کی ہڑتال تھی۔ پروفیسروں کو کوئی کام نہ تھا۔ تھوڑی سی گپ شپ کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ پروفیسر نسیم نے چلتے ہوئے جاوید سے کہا۔ یہ لو بیس روپے۔ یہاں سے بازار آدھا کیلومیٹر ہے گوشت خرید کر لیتے آنا۔ جاوید کو پھر آگ لگ گئی۔ اس نے کہا مجھے کئی دوسرے کام ہیں۔ دھوپ بھی سخت ہے۔ مجھے پیدل چلنا پڑے گا اور بس کی بھیڑ بھاڑ میں پتلے باریک پلاسٹک کیری بیگ میں گوشت لے کر چڑھنا اترنا اور کئی کیلومیٹر پیدل چلنا پریشان کن ہے۔ آپ کے پاس اسکوٹر ہے۔ دس

منٹ میں آپ بازار جاسکتے ہیں۔ مگر انھوں نے جاوید کی باتوں پر دھیان نہ دیا اور تحکمانہ انداز میں کہا یہ روپے لےلو اور گوشت لیتے آنا۔ جاوید نے روپے مسکراتے ہوئے لے لئے لیکن دل میں یہ سوچا کہ آج بیٹا پروفیسر کو ضرور گوشت کھلانا چاہئے۔

شام گذر چکی تھی۔ پروفیسر نسیم گوشت کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ جاوید خالی ہاتھ فلیٹ میں داخل ہوا۔ ان کے پوچھنے کے پہلے ہی جاوید نے کہا کہ جب وہ بازار میں پہنچا تو دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ فرمائیں جاوید کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس رہائشی کالونی میں اس کالج کے معاشیات کے پروفیسر جلیل بھی ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ جاوید انھیں کے یہاں جا کر بیٹھ گیا۔ آج اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اِس پار یا اُس پار۔

ایک گھنٹے بعد پروفیسر نسیم تشریف لائے۔ یہ ایک گھنٹہ انھوں نے اپنے پرانے رفیق پروفیسر عمان کے یہاں گذارا تھا۔ وہاں یہ بتایا گیا کہ اس نافرمانبردار کا کیا کرنا چاہئے۔ یہ کسی طرح غلام بننے کو تیار نہیں۔ پروفیسر نسیم کے یہاں جاوید کی عارضی رہائش پروفیسر عمان کے کہنے پر طے ہوئی تھی گویا دونوں نے ملکر ایک کھیل کھیلا تھا۔

پروفیسر نسیم جب ان کے ہاں کانٹا نکالنے کی تدبیر ڈھونڈنے گئے تو انھیں نسیم کا ہی انتظار تھا۔ ایک دن پہلے ہی ان کا چھوٹا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پونا پہنچا تھا۔ اسے یہاں دو سال کا ایک تعلیمی کورس پورا کرنا تھا۔ ظاہر ہے پروفیسر عمان کے فلیٹ میں اتنے لوگوں کو دو سال ٹھہرانا ممکن نہیں تھا۔ پروفیسر نسیم کو دیکھکر انھوں نے ایک تیر سے دو نشانہ لگایا۔ انھوں نے کہا اماں یار یہ شخص تو بڑا ہی کم ظرف نکلا۔ ہم نے سمجھا تھا نیک آدمی ہے تم اس کے ہمدرد ہوئے۔ تمہاری خدمت کو اپنا فرض سمجھے گا لیکن یہ تو بڑا ہی بداخلاق نکلا۔ اب جتنی جلدی ہو اسے وہاں سے نکالو۔ اس کے رہنے سے بہتر یہی ہے کہ فلیٹ کا ایک کمرا خالی ہی رہے۔ تم فوراً جاؤ اور جو کہا ہے اسی وقت سنادو۔ آخر میں تمہارا دوست ہوں کس موقع پر کام آونگا۔ جاؤ ابھی جاؤ۔

پروفیسر نسیم، پروفیسر عمان سے مشورے کے بعد سیدھے پروفیسر جلیل کے یہاں

پہنچے۔ پروفیسر جلیل وہ تھے جن سے اگر کوئی ایک ہفتہ روزانہ ملتا تو وہ اس شخص سے گریز کرنے لگتے۔ اور جب وہ شخص بھی ردعمل میں دور ہونے لگتا تو اس کا ہاتھ پکڑ کے کہتے اماں یار پہنچانتے بھی نہیں آؤ چائے پیتے ہیں۔ بات کرتے ہوئے آدھے الفاظ منہ میں ہی رہ جاتے تھے اور اس کی جگہ تھوک کے چھینٹے باہر نکلتے۔ اس لیے طلباء بھی ان کا لیکچر آدھا ہی سمجھتے تھے۔ پروفیسر نسیم، جلیل اور جاوید کے سامنے کے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ بے چین لگ رہے تھے۔ اپنے خیالات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ لیکچر میں بھی پسینہ پونچھتے تھے جب کوئی طالب علم سوال کر دیتا تھا۔ جاوید کی طرف دیکھنے کی ان میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جاوید کا خون ابل رہا تھا۔ آخر وہ دیواروں کو دیکھتے ہوئے بولے۔ مجھے ابھی پہلی منزل کے کرایہ دار نے بتایا ہے کہ کوئی شخص کسی اجنبی کو اپنے فلیٹ میں نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ غیر قانونی ہے۔ جاوید کی طرف ترچھی نظروں اور ٹمٹماتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا آپ کل صبح کہیں اور کوئی جگہ دیکھ لیجئے۔

جاوید نے جواب دیا پروفیسر صاحب دو دن پہلے آپ مجھے جانتے تھے اور آج میں اجنبی ہو گیا۔ کل آپ میرے توسط سے سولہ سالہ کانونٹ میڈیم تعلیم یافتہ، دراز قد، گول چہرہ، ابھرا سینہ، پتلی کمر، باریک ہونٹ، لمبی زلفیں، باریک آواز، پتلی انگلیاں اور پانچ لاکھ نقد والی دوشیزہ کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور آج میں آپ کے لئے انجان ہوں۔ خیر کل صبح انتظام کرنا تو مشکل ہے۔ میں کل ہی بتاؤنگا کہ کمرا کب خالی کرنا ہے۔

دوسری صبح جاوید تنہا ہی کالج گیا۔ کئی گھنٹوں کی تلاش کے بعد اس نے ایک جگہ کمرے کا انتظام کر لیا۔ شام میں واپس آیا۔ کالونی کے ریسٹورانٹ میں چائے پی رہا تھا۔ اسی وقت جلیل احمد کا بھتیجا معاون حسین پہنچا۔ یہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ جاوید سے خوب باتیں کرتا تھا۔ جاوید نے پوچھا کیا خبر ہے کیسے ہو۔ اس نے بتایا سب تو ٹھیک ہے لیکن پروفیسر نسیم انکل مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ہمارا نوکر کمرا کہاں تلاش کر رہا ہے؟ یہ سن کر تو جاوید کے تلوے میں آگ لگ گئی۔ اس نے سوچا اب حد ہو گئی اسے سمجھانا ہی پڑے گا۔ آج

اس کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اس کی مٹی درست کرنی پڑے گی۔ معاون سے کہا میرے کمرے چلو۔ دونوں فلیٹ میں داخل ہوئے۔ جاوید نے اپنے سامان کو باندھا۔ معاون جاوید کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ پروفیسر نسیم اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے تھے۔ بستر کے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ دیواروں پر کیلوں میں کپڑے ٹنگے تھے۔ جاوید ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا اور ان کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ وہ جاوید کا تیور دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ اندازہ ہو گیا کہ انہونی ہونے والی ہے۔ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ کدھر بھاگیں اور کیا بولیں کیونکہ کرسی دروازے سے لگی تھی۔ وہ سیلاب جو چھ دنوں سے رکا تھا اس کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔ جاوید نے گرج کر ان کی آنکھوں کی گولائی میں جھانکتے ہوئے کہا شرافت و نجابت، کلچر اور تمدن، اور اخلاق و کردار، کو سمجھنے اور پانے کے لئے جو علم ونظر اور خاندان چاہئے آپ اس سے محروم ہیں۔ ہم شرافت اور شرارت دونوں جانتے ہیں۔ اچھے اور برُے وقت پر دونوں کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ پروفیسر نسیم ایم ایس سی برسوں گیارہویں بارہویں کو اسکول میں پڑھا کر کالج میں ماسٹر سے پروفیسر بن گئے تو دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا جبکہ آپ کے پاس دماغ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ آپ دنیا سے بتاتے ہیں کہ میں نے وہاں تعلیم حاصل کی ہے جس کا ایک نام تہذیب و تربیت بھی ہے۔ مگر آپ کے طور طریقے دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے تہذیب و تربیت سے آپ کا کبھی سابقہ ہی نہیں رہا۔ آپ وہ عجوبہ اور نمونہ ہیں جس کی جگہ کالج اور کالونی نہیں بلکہ میوزیم ہے۔ پروفیسر نسیم اپنے مشیر کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا کہ فلیٹ میں اجنبی کو ٹھہرانا جائز ہے یا خلاف قانون۔ اس فلیٹ میں میرے بعد کون ٹھہرے گا یہ میں خوب جانتا ہوں۔ پروفیسر عمان کے ساتھ آپ جو غٹرغوں کر کے آئے ہیں مجھے اس کا بھی علم ہے۔ وہ شخص جسے آپ اپنا مشیر اور دوست سمجھتے ہیں اس کی نگاہ میں آپ کی حیثیت احمق سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ اب بھی آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے اور آئندہ بھی بناتا رہے گا کیونکہ آپ پہلے درجے کے احمق اور

گنوار ہیں۔اور یہ جو آپ کے دماغ میں کرایے کے فلیٹ اور سکینڈ ہینڈ اسکوٹر کا نشہ ہے تو اس سے انھیں ڈرایئے جس نے یہ کھلونے نہیں دیکھے ہیں اور جو مشینوں، کھلونوں اور دیواروں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔رہی بات فلیٹ کی تو کرایہ کا فلیٹ آپ لے سکتے ہیں تو میں بھی لے سکتا ہوں۔آپ کی حیثیت کرایہ دار کی ہے فلیٹ اونر کی نہیں۔سکینڈ ہینڈ اسکوٹر کی چابی اور موہنجوداڑو فلیٹ کی کنجی کو اپنی کمر کی پشت پر لٹکا لیجئے تا کہ کوئی طلب کرے تو کہہ سکئے کہ چابیاں تو میری پشت میں پھنسی ہیں، نہیں نکل سکتیں۔آپ کے جسم پر جتنے لباس ہیں اس سے قیمتی میرا جوتا ہے اور مجھے لگتا ہے ان جوتوں کے سہی استعمال کا وقت اب آن پہنچا ہے۔

آپ نے چھ دنوں میں جو ادائیں دکھائی ہیں یہ تو کسی چالباز عورت کے بس کی بھی بات نہیں اور آپ کی چالبازیاں تریا چرتر پر بھی بھاری ہیں۔ماسٹر نسیم آپ جو سمجھ رہے تھے کہ میں آپ کی ٹانگ دباؤنگا تو یہ آپ کا خواب خرگوش تھا اور ٹانگ اور ہاتھ تو میں اب آپ کو دکھاؤنگا نطفہ ٔ تشکیک، عجیب الطرفین یہ کہتے ہی جاوید نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کرسی اپنے سر پر اٹھالی اور پوری طاقت سے پروفیسر نسیم کے سر پر جو ڈر کے مارے بستر پر بیٹھ گئے تھے دے مارنے والا تھا کہ باورچی خانہ سے پروفیسر عمان کا چھوٹا بھائی دوڑتے ہوئے آیا اور جاوید کے ہاتھوں کو تھام لیا۔کرسی چھین لی اور کہا آپ یہ کیا کرتے ہیں اور جاوید کو کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ماسٹر نسیم حیران و ششدر۔ہزار کوشش کی کہ ان کے غصہ، نفرت، تعصب اور حسد کے نوخیز بچے کا تولد ان کے منہ سے ہو جائے مگر وہ تو کب کا شرمندگی کے رحم میں موت کی نذر ہو چکا تھا۔لاکھ سعی کے باوجود کانپتے ہوئے وہ اوں، آں، او، دیکھو، یہ کیا، ارے کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔جاوید اپنے بچپن کی یاد کی ہوئی الف سے یے تک اور یجنل ان کے گوش گذار کرتا ہوا اپنے سامان کے ساتھ کرایے کے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔آٹو رکشا سے شہر کے لاج میں پہنچا جہاں آج دن میں ماہانہ کرایہ دار کے طور پر بات کرلی تھی۔پروفیسر نسیم کی صحبت سے مستفید ہونے کا زمانہ کل چھ دنوں کا تھا۔

شروع شروع میں وہ کلاس لیتا اور اسٹاف روم میں آکر بیٹھ جاتا۔طالب علموں

سے زیادہ قربت نہ تھی۔ ایک دو مہینے بعد آہستہ آہستہ طلباء سے واقفیت ہوتی گئی اور ان سے تبادلہ بھی ہوا۔ جب ان سے بار بار گفتگو ہوئی تو ان کی زبان اور لب ولہجہ کو سننے کا بھی موقع ملا اور جسے سن کر جاوید کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کی حیرانی دوبالا تب ہوئی جب وہاں کے پروفیسروں کی زبان اور لب ولہجہ کو بھی طالب علموں جیسا ہی پایا۔ ایکدن ایک طالب علم کئی دن کے بعد کلاس میں آیا تو جاوید نے اس کی وجہ پوچھی اس نے کہا۔

''سر اُدھر اپنے فیملی کے رشتے کا ایک شادی تھا۔ سولا پور میں ادھر ہی اپن گئے لا تھا۔ کل شام میں ادھر آیا تو آج ادھر کالج آیا اس کے پہلے کیسے آتا۔ کیا سر اتنی سی بات بھی تمہارے مغز میں نہیں آئے لا ہے۔ آج سے اپن رگولر آتا نا۔ لیکن سر ادھر دو تین دن تم نے جو پڑھائے لا ہے وہ اپن کو بتا دو اور نوٹس بھی دے دو پھر اپن کا نوٹ بھی بن جائے گا۔''

جاوید یہ اردو سن کر سوچنے لگا کہ اب اپنی اردو کا خدا ہی حافظ ہے۔ کس شہر سے کس شہر میں آ گیا۔ اس کا مزاج کبیدہ ہو گیا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد کینٹین میں جا کر بیٹھ گیا تا کہ ذہن کا تناؤ ذرا کم ہو جائے۔ اسی وقت ایک زولوجی کے پروفیسر آئے۔ چائے پیتے ہوئے جاوید نے سلام کیا۔

زولوجی کے پروفیسر نے کہا۔ ''کیا سر منہ نیچے گرا کر کیا کریلا ہے۔ سر زیادہ ٹنشن نہیں لینے کا۔ تم کدھر رہتا سر؟''

''نیہا جی نگر میں۔'' جاوید نے کہا۔

''اچھا ادھر وہ جدھر میتھس کا پروفیسر رہتا۔ سر اس سے ذرا ہوشیار رہنے کو مانگتا۔ وہ بہت بڑا کھڑوس اور پھینکی باز ہے۔ سر اپن جدھر رہتا ادھر آ جاؤ۔ اپنا سب ساتھی لوگ ادھر ہی رہتا تم بھی موج کرے گا۔ یہ تم کدھر سالا فالتو لوگوں کے ساتھ پھنسے لا ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

جاوید نے دیکھا کہ طالب علم تو طالب علم یہاں تو پروفیسر کا بھی انداز نرالا ہے۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ جاوید خاموش رہا تو پروفیسر نے کہا۔

''سر ادھر تمہارے یوپی کا اردو نہیں چلتا۔ تم لوگ بولتے لطیفہ سنئے، آیئے

جایئے، تشریف لایئے، تشریف رکھئے سب بے کار ہے سر۔''

لطیفہ اور تشریف پر جاوید کو پچھلے دو واقعات یاد آ گئے جو عربی کے پروفیسر مولانا کو پیش آئے تھے۔ اسٹاف روم میں مولانا اور جاوید گفتگو کر رہے تھے۔ اسی وقت سائنس کے ایک پروفیسر آئے۔ مولانا نے سلام کیا۔ پروفیسر وعلیکم السلام بول کر کھڑے رہے۔

''تشریف رکھئے۔'' مولانا نے کہا۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے۔'' پروفیسر نے کہا

''تشریف رکھئے۔'' مولانا نے کہا

''ہاں کل اپن وہاں گیا تھا کل ہی آیا۔'' پروفیسر نے کہا۔

''ارے یار بیٹھو تو'' مولانا نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

پروفیسر نے کہا۔'' ہاں ہاں بروبر۔ یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔''

دوسرے دن ایک پروفیسر نے مولانا کو بتایا کہ سرکل تم نے پروفیسر شیخ سے کون سی اردو میں بات کی تھی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' مولانا نے پوچھا۔

پروفیسر نے بتایا۔'' ارے وہ تمہارے ہیڈ سے پوچھ رہا تھا کہ تشریف رکھئے کسے کہتے ہیں؟ اسکا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' جب صدر شعبہ نے اسے بتایا کہ بیٹھنے کو کہتے ہیں تو اس نے کہا ہاں یہی تو کل اسی لیے پروفیسر مولانا نے اپن کو بار بار بیٹھنے کو بولا تھا۔

اور لطیفہ کا لطیفہ یہ ہوا کہ مولانا نے کینٹین میں زولوجی کے پروفیسر کو ایک لطیفہ اردو میں سنایا۔ وہ ہاں ہاں کرتے رہے۔ لطیفہ ختم ہونے کے بعد چلے گئے۔ مولانا نے سمجھا کتنا بدذوق آدمی ہے۔ کمبخت نے کوئی ردعمل بھی نہیں کیا۔ تین دن بعد مولانا کی ملاقات اسی پروفیسر سے اسی کینٹین میں ہوئی۔ پروفیسر ہنستے ہوئے آئے اور آتے ہی مولانا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔

''ارے سر تم نے اس دن کتنا زبردست جوک مارا تھا۔ تم کو کیا بولوں میں نے آج

ایک سر کو مطلب پوچھا تب سے تمہیں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ سہی میں فرسٹ کلاس جوک سنایا تم نے۔ کوئی اور سناؤ نا۔ تمہارے پاس ایسا اسٹاک ہے اپن کو پتہ نئی تھا۔''

''نہیں سر ابھی اور کوئی یاد نہیں اور میرا ابھی لیکچر ہے۔ مولانا نے سوچا یہ تین دن بعد لطیفہ کا مطلب سمجھ کر آیا ہے ابھی سناؤ نگا تو پھر تین دن بعد ہنسے گا اس سے بہتر ہے یہاں سے نکل لو۔ اس سے جان چھڑانے کا یہی طریقہ ہے۔

لطیفہ اور تشریف کے ان واقعات کو یاد کر کے پروفیسر سے مزید گفتگو فضول تھی۔ اس کے ساتھ تھوڑی دیر اور رہے تو دوسرا ابھی آئے گا۔ اور کہیں اس نے بھی تشریف کی جگہ بیٹھنے کا آنے کا جانے کا شروع کر دیا تو موڈ آف ہو جائے گا۔ گھنٹوں ان کی سڑک چھاپ اردو ذہن میں کچوکے لگاتی رہے گی۔ یہی سوچکر جاوید کینٹین سے باہر چلا گیا۔

وہاں کلاس کو لیکچر کہا جاتا تھا۔ لیکچر پورے ہو گئے۔ امتحان کے فارم بھر دیے گئے اور معینہ وقت پر امتحان شروع ہو گیا۔ ایک بار بھی ایسا نہ ہوا کہ امتحان طے شدہ تاریخ پر نہ ہوا ہو۔ ورنہ دوسری ریاستوں میں تو ایک ہی امتحان ایک ہی سال میں کئی بار ہوتے ہیں۔

ایڈمیشن کا مہینہ آیا۔ کیمپس میں ہر طرف گہما گہمی شروع ہو گئی۔ جدھر دیکھو چار پانچ طالب علم ایک جگہ جمع ہیں اور ایڈمیشن کی بات کر رہے ہیں۔ دو طالب علم ایسے تھے جن کے پاس نئے طالب علموں کی سب سے زیادہ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ دونوں کامرس میں گریجویشن کر رہے تھے۔ ان دونوں سے سارے پروفیسر ڈرتے تھے۔ ان کا ہر کام کر دیتے تھے۔ جس طالب علم کا رزلٹ فی صد کم ہوتا اور داخلہ کی تمام کوشش کر کے اور پرنسپل سے بار بار ملکر تھک جاتا تو ان دونوں سے ملتا۔ یہ کہتے۔

''دیکھو تمہارا کام ہو جائے گا۔ لیکن اس کے لیے تھوڑا خرچ کرنا پڑے گا۔ اب ٹائم بھی بہت نکل گیا ہے اور اس پر سنٹیج پر شہر کے کسی بھی کالج میں تمہارا ایڈمیشن نہیں ہو سکتا۔ یہی ایک کالج بچے لا ہے۔ بولو پرنسپل سے بات کروں؟''

''لیکن پرنسپل سے میں ملا تھا۔ انھوں نے کہا نہیں ہو سکتا۔''

''ارے وہ تم ملا تھا اس لیے۔ میری بات الگ ہے۔ اپن کو معلوم ہے پرنسپل ایسا کام کس طرح کرتا ہے۔ تم کو اس سے کیا لینے کا۔ تم کو ایڈمیشن مانگتا؟''

''ہاں ایڈمیشن چاہئے۔''

''تو الگ سے خرچا پانی دینا پڑے گا۔''

''الگ سے کتنا؟''

''جو ہوتا ہے۔''

''کیا ہوتا ہے؟''

''یہی کوئی پچیس ہزار۔''

''پچیس ہزار؟ یہ تو بہت ہے۔''

''ارے اس کو تم بہت بولتا۔ پرنسپل کو پٹانا کوئی آسان کام ہے۔ آخر اس کے بھی بیوی بچے ہیں۔ سب انگلش میڈیم میں پڑھتے ہیں۔ کالج کار سے آتا ہے۔ اس میں پیٹرول جلتا ہے۔ تو کیا اس کو چاکلیٹ دیں گے؟''

''اچھا شفیق بھائی ہم دیں گے۔'' طالب علم نے کہا۔

سودا طے کرنے کے بعد اس نے طالب علم سے ایڈمیشن فارم لے لیا اور کہا تم ادھر کینٹین میں جا کر بیٹھو میں آدھے گھنٹے بعد تمکو ادھر ہی ملتا۔ شفیق فارم کے ساتھ پرنسپل چیمبر میں بغیر ناک کیے سیدھا داخل ہوگیا۔ امیدوار طالب علم اپنے فارم کے ساتھ اسی چیمبر میں پرنسپل سے کئی بار گذارش کر چکا تھا۔ پرنسپل نے کہا تمہارا پرسینٹیج کم ہے۔ آخری تاریخ گذر چکی ہے۔ اب کسی صورت میں داخلہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ شخص شفیق پھر اسی پرنسپل کے پاس گیا ہے۔ خدا معلوم کیا کر کے آتا ہے۔ پرنسپل فارم پر میرا نام دیکھکر پہچان جائے گا کہ اسے تو وہ پہلے ہی انکار کر چکا ہے۔ خیر آدھے گھنٹے بعد دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ وہ کینٹین میں جا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ بھلا ایک بار انکار کرنے کے بعد پرنسپل فارم پر دستخط کیسے کرے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ

شفیق اپنے ہاتھ میں اس کا فارم لئے اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف آرہا ہے۔ سامنے آکر اس نے فارم میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ یہ لو اپنا فارم۔ دیکھ لو تمہارا کام ہوگیا۔ جاکر ابھی ایڈمیشن لے لو۔ طالب علم نے جب فارم کو الٹ کر دیکھا تو اس پر پرنسپل کا دستخط موجود تھا۔

شفیق کے لیے ایڈمیشن اور امتحان کا مہینہ آمدنی کا موسم ہوتا تھا۔ ان مہینوں میں وہ لاکھوں کما لیتا تھا اور سال بھر آرام کرتا۔ پانچ دس کم نمبر والے طالب علم اسے ہر سال مل جاتے۔ اب وہ ماروتی کار پر نظر آنے لگا۔ یہ دونوں شفیق اور جبران اپنی غرض کے لئے کسی حد کو بھی پار کر سکتے تھے۔ تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف کو کبھی بھی کسی وقت کسی کے سامنے ذلیل کر دیتے اور کوئی ان کے خلاف چوں تک نہیں کرتا۔ یعنی پورے کالج پر ان کی دھاک قائم تھی۔

ایڈمیشن بہتا دریا تھا جس میں جس کو موقع ملتا ہاتھ دھو لیتا۔ جاوید کالج آفس میں رجسٹرار کے پاس بیٹھا تھا۔ رجسٹرار چیمبر سے ملحق ایک بڑا ہال نما دفتر تھا جس میں دس کلرک یہاں سے وہاں تک اپنی اپنی میزوں پر مصروف نظر آتے۔ نذیر نام کا کلرک اپنا کام کر رہا تھا۔ پروفیسر مولانا نذیر کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ نذیر نے سلام کرتے ہوئے طنز و مزاح کے پیرائے میں کہا'' کیا حضرت اس بار کا ایڈمیشن کیسا گزرا کوئی مرغا پھنسا کہ نہیں۔ قربانی کا مہینہ آرہا ہے کیسے کریں گے؟''

یہ سن کر مولانا کو غصہ آگیا جواب دیا۔'' میں کیوں مرغا پھنساؤں، تم پھنساؤ اور ایسے پیسے سے قربانی تم جیسے لوگ کرتے ہیں ہمارے جیسے نہیں۔''

''حضرت لگتا ہے آپ نے یہ کاروبار چھوڑ دیا ہے؟ نذیر طنز کیا۔

''میرا کوئی کاروبار نہیں ہے تم اپنے کاروبار کا خیال کرو۔'' مولانا نے جھنجھلا کر کہا۔

''ہاں انتظامیہ بدلنے سے دشواری تو ہوتی ہی ہے۔''

''دشواری ان لوگوں کو ہوگی جو ایسا کرتے ہیں مجھے اس سے کیا لینا دینا۔''

''جاوید نے دیکھا کہ سوال و جواب میں تلخی آتی جارہی ہے۔ دخل در گفتگو کرتے ہوئے کہا....

''ارے نذیر صاحب خیریت تو ہے۔''

''خیریت ہی تو پوچھ رہا ہوں آپ کے دوست سے مگر وہ بتا نہیں رہے ہیں۔''

''چلئے اس بحث کو ختم کیجئے اور میرے ریفریشر کورس کا فارم دیجئے۔'' جاوید نے کہا

''ہاں وہ تیار ہے۔ لے لیجئے۔'' مولانا اس اثناء میں آفس سے باہر جا چکے تھے۔ جاوید نے نذیر سے پوچھا۔

''یہ مصنوعی الزام تراشی تھی یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟'' نذیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں تو۔ میں تو سمجھ رہا تھا آپ دونوں مذاق کر رہے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''ارے نہیں جاوید صاحب۔ یہ کہانی تو مشہور ہو چکی ہے۔'' نذیر نے کہا۔

''کیا؟'' جاوید نے حیرت سے پوچھا۔

نذیر نے بتایا کہ جناب ان حضرت کا تعلق بہار کے ایک شہر گیا سے ہے لیکن یہ خود کو ہر جگہ دلی والا بتاتے ہیں جو صد فی صد غلط ہے۔ ہم لوگ آفس والے ہیں۔ ہر پروفیسر کی سروس بک آفس میں ہے اس کے باوجود ہم سے جھوٹ بولتے ہیں۔ مسجدوں میں تقریر کے لیے گروپ بندی کرتے ہیں۔ یہ پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ یہ ہر سال ایڈمیشن کے موقع پر کم نمبر والے طالب علموں کو اپنے وطن سے بلاتے ہیں ان کا داخلہ کراتے ہیں اور وہی کمیشن لیتے ہیں جو شفیق اور جبران لیتے ہیں۔ شفیق اور جبران کا ریٹ تو آپ کو معلوم ہے۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' جاوید نے حیرت سے پوچھا۔

نذیر نے کہا۔ ''آپ کو یقین نہیں آتا تو ہم دوسروں سے پوچھوا دیتے ہیں۔''

تب اچانک جاوید کو یاد آیا کہ واقعی کئی بار پروفیسر مولانا نے اپنے وطن کے طالب علموں کا داخلہ یہاں کروایا ہے جو کم نمبر والے تھے اور وہ دوسری جگہوں سے ناامید ہو کر یہاں آئے تھے ایسے طلباء سے مولانا نے ملاقات بھی کروائی تھی اور کہا تھا کہ یہ میرے وطن کا بچہ ہے۔

مولانا ایم۔ اے۔ کر کے جاوید کے ایک سال بعد اس کالج میں آئے تھے۔ میانہ

قد، صاف رنگ، ہلکی داڑھی مونچھ، کرتا پاجامہ اور چپل میں پوری طرح مولوی صاحب معلوم پڑتے تھے۔ ابتدائی ثانوی تعلیم مدرسہ کی تھی۔ مدرسہ کی سند پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سیدھے ایم۔اے میں داخلہ لیا اور اس کی سند حاصل کی۔ یونیورسٹی میں طلباء کی ایک مذہبی تنظیم تھی۔ یہ اپنے وطن میں گھر اور محلے میں حافظ جی کے نام سے پکارے اور جانے جاتے تھے۔ یہاں بھی حافظ جی اور مولانا کے نام سے مشہور ہو گئے۔ مسجدوں میں نماز پڑھاتے اور اپنی تنظیم کے حوالے سے تقریر بھی کرتے تھے۔ اسی بنیاد پر اسٹوڈنس یونین کے الیکشن میں کھڑے ہوئے اور جیت گئے۔ یونین کے وائس پریسیڈنٹ بنے۔ اقلیتی یونیورسٹی تھی۔ مذہبی ماحول تھا۔ مدرسے کے طلباء کی خاصی تعداد تھی۔ سبھوں نے ووٹ دیئے اور حضرت کامیاب ہو گئے۔ نیتا گری اور مذہبی خدمات میں دن گذار رہے تھے۔ کہیں سے معلوم ہوا کہ بحر الاسلام کالج میں اسامی آئی ہے۔ پہنچ گئے۔ ایک محترمہ نے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے لئے دو سال کی چھٹی لی تھی۔ لیو ویکیسنی پر ان کا تقرر ہو گیا۔ محترمہ جب لوٹ کر آئیں تو سڑک پر آ گئے۔ قریب میں خواتین کا کالج تھا۔ وہاں لگ گئے جہاں تمام پروفیسروں کی پاس بک کالج سوسائٹی کے چیرمین کے پاس جمع رہتی تھی۔ انھیں آدھی تنخواہ دی جاتی تھی اور نصف تنخواہ کالج ڈیولپمینٹ فنڈ کے نام پر رکھ لی جاتی تھی۔ ادھر محترمہ بحر الاسلام کالج میں رٹائر ہوئیں پھر انٹرویو ہوا۔ جنوبی ہندوستان سے ایک تجربہ کار امیدوار ڈاکٹر واحد آ گئے۔ ظاہر ہے ان کے سامنے پروفیسر مولانا ایم۔اے کا کیونکر ہوتا۔ دو سال بعد ڈاکٹر واحد کا اچانک ہارٹ اٹیک میں انتقال ہو گیا۔ پھر انٹرویو ہوا اور پروفیسر مولانا خواتین کالج سے پھر بحر الاسلام کالج میں آ گئے۔ سچ ہے حیلے روٹی بہانے موت۔ یہ سب اپنی جگہ مگر مولانا کی نیتا گری اور مسجدوں میں تقریریں ہوتی رہیں۔ انھیں طلباء و طالبات اور محلے کے لوگ مولانا کے نام سے پکارتے تھے۔ غالباً دو سال بعد مولانا نے مولانا کہنے والوں سے کہا کہ مجھے مولانا مت کہو پروفیسر کہو۔ آہستہ آہستہ مولانا کی جگہ لوگ انھیں پروفیسر کہنے لگے۔ اب وہ پروفیسر بھی تھے اور مولانا بھی۔

کالج کیمپس سے باہر پانچ منٹ کے فاصلے پر ایک پریسیڈنٹ نام کا ایرانی ہوٹل تھا۔ہوٹل کے سامنے پورب پچھّم روڈ تھی جس پر ہر وقت ٹریفک ہوتی تھی۔لوگوں کو روڈ کراس کرنے میں گاڑیوں کے دائیں بائیں ہوکر جانا پڑتا تھا۔کالج کے زیادہ تر پروفیسر اسی ہوٹل میں چائے پینے جاتے تھے۔روڈ سے لگ کر کئی چھوٹی دکانیں کالج کے طالب علموں کے رشتہ داروں کی تھیں۔صبح نو بجے میں مولانا پروفیسر دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔اسی وقت ایک آٹو رکشا ٹریفک میں پھنسا نظر آیا۔اس میں بی۔کام کی ایک طالبہ بیٹھی تھی۔مولانا نے جلدی سے چائے کا گھونٹ حلق میں اتارا اور بہ آواز بلند کہا۔

''ارے کہاں جارہی ہو؟'' سب چونکے مولانا کو کیا ہوا۔کس کو آواز دے رہے ہیں۔آٹو میں بیٹھی طالبہ نے جان بوجھکر دھیان نہیں دیا۔آس پاس کے دکانداروں نے بھی مولانا کی آواز سنی۔ممکن ہے ان میں سے کوئی طالبہ کے جاننے والے بھی رہے ہوں۔جب طالبہ نے مولانا کی چیخ پر کوئی دھیان نہیں دیا تو وہ اٹھے اور روڈ کے کنارے جاکر رکشا کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ٹریفک جام تھی۔

مولانا نے کہا۔''ارے تم مجھکو پہچان نہیں رہی ہو۔میں نے تمہیں پڑھایا ہے۔تم میری شاگردہ ہو۔شاگرد کا استاد سے کیا شرمانا۔بولو جواب دو۔تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟''

طالبہ نے دیکھا کہ اب اگر وہ کچھ نہیں بولی تو ممکن ہے یہ آٹو رکشا کے اندر آجائیں گے۔اس لئے اس نے کہا

''ہاں..... ہاں..... سر میں کالج جارہی ہوں۔''

مولانا نے کہا''تو تم کو بولنا چاہئے نا۔بھئی تم میری شاگردہو۔'' جب تک ٹریفک کھل گئی اور رکشا آگے بڑھ گیا۔وہ ہوٹل میں اپنی جگہ پر واپس آگئے۔تینوں دوست مولانا کا لاابالی پن دیکھ رہے تھے۔مسکرارہے تھے۔انھیں آتے دیکھکر سب خاموش ہوگئے۔

''بھئی یہ میری شاگردہ تھی۔میں اسے پڑھاتا ہوں۔'' مولانا نے کہا۔

''ہاں بھئی آپ کو تو بہت لوگ جانتے ہیں۔'' کیمسٹری کے پروفیسر فیض اللہ نے

طنز کیا۔

''ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔ آخر میں یونیورسٹی میں یونین کا پریسیڈنٹ رہا ہوں۔'
مولانا نے دعوے سے کہا۔''پریسیڈنٹ نہیں وائس پریسیڈنٹ۔''فیض اللہ نے لقمہ دیا۔

''ہاں.... ہاں..... وہی دراصل تھوڑے ووٹ کم پڑ گئے تھے ورنہ میں ہی پریسیڈنٹ ہوتا۔''

''ہوئے نہیں نا۔ ایک ووٹ سے بھی آدمی ہار جاتا ہے۔''فیض اللہ نے کہا۔

''لیکن پریسیڈنٹ نہیں ہونے کے باوجود یونین کے سارے کام میں ہی کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ کام کرنے والوں کی ٹیم رہتی تھی۔''مولانا نے بتایا۔

''یونین میں کام ہی کیا ہوتا ہے اور جتنے بے کار طالب علم ہوتے ہیں وہ یونین بازی کرتے ہیں۔''فیض اللہ نے تنقید کی۔

''وہ جو ابھی ملک کے وزیر اعظم شری واجپائی جی ہیں ان دنوں مرکز میں وزیر تھے۔ ہم اپنا وفد لے کر ان سے ملنے گئے تھے۔ انھوں نے ہم سب کو چائے پلائی تھی۔ بڑی دیر تک باتیں بھی کیں۔''مولانا نے فخر سے بتایا۔

''وزیر اعظم کے ساتھ چائے پیتے وقت آپ کی تنظیم کی پالیسی کدھر گئی تھی جس کے نام پر طلباء نے آپ کو ووٹ دیا تھا اور آپ وائس پریسیڈنٹ بنے تھے۔ آپ کی تنظیم سیاسی پارٹی کے اصولوں کو نہیں مانتی۔ تو پھر چائے پیتے وقت یہ خیال نہیں آیا۔ وزیر سے ملنے کی خوشی میں پالیسی کو جیب میں رکھ لیا۔ سب آپ لوگوں کا دکھاوا ہے۔ لوگوں کو بے وقوف بناتے رہتے ہیں۔''فیض اللہ نے دلیل دی۔

''آپ کو کیوں تکلیف ہے؟ آپ کو چائے نہیں ملی اس لیے۔''

''ایسی چائے آپ ہی کو مبارک۔''

تمام پروفیسران کی باتوں کو سنتے رہے لطف لیتے رہے اور سچ جھوٹ کو آنکتے رہے۔
ان دنوں مولانا گرلس کالج میں پروفیسر تھے۔ امتحانات کا زمانہ تھا۔ ہر لکچر ہال

میں دو دو شفٹ میں امتحان ہو رہے تھے۔ اکزام سپرنٹنڈنٹ پروفیسر نادرہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت صرف ایک کمرے میں امتحان ہو رہا تھا۔ مولانا سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں گئے اور پوچھا۔

''کیا اس وقت بھی امتحان ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔ ہال نمبر تیرہ میں ہو رہا ہے۔''

''ذرا دیکھتا ہوں میں بھئی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہال نمبر تیرہ کی طرف جانے لگے۔ ان کے پیچھے سپرنٹنڈنٹ بھی چلنے لگیں۔ جیسے ہی تیرہ نمبر ہال آیا۔ پروفیسر نادرہ ان کے آگے جا کر ہال کے دروازے پر دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر ان کو روک کر کھڑی ہوگئیں اور کہا: ''آپ ہال کے اندر نہیں جاسکتے۔''

''کیوں نہیں جاسکتے؟''

''میں نے کہا نہ آپ نہیں جاسکتے۔''

''آخر کیوں نہیں جاسکتا بھئی۔ ہماری کئی شاگردہ امتحان دے رہی ہیں۔ میں نے انھیں پڑھایا ہے۔ میں ان کا استاد ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کا امتحان کیسا ہو رہا ہے۔''

''نہیں جیسا بھی ہو رہا ہے آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ اس وقت میں سنٹر سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ میں آپ کو ۴۵ لڑکیوں کے درمیان تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ چاہے اس کے لیے جو ہو جائے۔''

بحث زوردار ہونے لگی۔ چپراسی آ گیا۔

''کیا ہوا میڈم؟'' چپراسی نے پوچھا۔

''تم جا کر پرنسپل کو بلا کر لاؤ اور کہو پروفیسر مولانا جبراً لڑکیوں کے امتحان ہال میں گھسنا چاہتے ہیں۔ میں منع کر رہی ہوں لیکن وہ زبردستی کر رہے ہیں۔''

چپراسی بھاگتا ہوا گیا اور دو منٹ میں پرنسپل صاحب آ گئے۔

''کیا ہوا؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''ان کودیکھئے۔ یہ زبردستی اندر جانا چاہتے ہیں۔'' نادرہ نے بتایا۔

''آپ کو ابھی اکزام ڈیوٹی ہے۔'' پرنسپل نے مولانا سے پوچھا۔

''نہیں ابھی تو نہیں ہے لیکن کل ہے۔ اس ہال میں ہماری شاگردہ امتحان دے رہی ہیں ذرا انھیں دیکھنا تھا۔'' مولانا نے گھسنے کی وجہ بتائی۔

''آپ کی ڈیوٹی نہیں ہے تو آپ کو نہیں آنا چاہئے۔ آپ واپس جائیں یہ میرا حکم ہے۔'' پرنسپل نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

مولانا کا چہرہ اتر گیا۔ بار بار ہال کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر جی سر کہتے ہوئے کھسک گئے۔

نادرہ نے پرنسپل سے کہا۔ ''سر یہ اکزام ہال میں جا کر لڑکیوں سے ہنسی مذاق شروع کر دیتے ہیں اور کہنے سے بھی نہیں نکلتے۔ لڑکیاں بات نہیں کرتیں پھر بھی یہ انھیں کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں۔ یہ مدرسہ کے مولانا ہیں۔ کبھی لڑکیوں سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں سیدھے گرلس کالج میں پروفیسر ہو گئے اب کھُل کھیلنا چاہتے ہیں اور ان کی فطرت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ بہر حال آپ نے ٹھیک کیا اور آئندہ بھی ان سے ہوشیار رہئے''۔ پرنسپل نے تاکید کی۔

جاوید کو مولانا پہلی ملاقات میں ہی مدرسہ سے تازہ وارد اور مولوی صاحب لگے۔ پاؤں میں چپل پائجامہ ٹخنوں کے پاس سکڑا ہوا، سفید کرتا، خشخشی داڑھی ہلکی مونچھیں اس حلیہ میں ایسے لگے جیسے شادی میں نکاح پڑھا کر سیدھے یہیں پہنچ رہے ہوں۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا بخار ابھی اترا نہیں تھا۔ بات بات میں بہک جاتے تھے اور لمبی لمبی ہانکنے لگتے تھے۔ پھر تو روزانہ ہی ملاقاتیں ہونے لگیں اور جب ملتے۔ ایک نئی مہم سر کر کے آئے ہوتے۔ دن رات خود کو بڑا آدمی، بڑا آدمی، بڑے بڑے نیتا اور وزیر سے جان پہچان رکھنے والا بتاتے رہتے تھے۔ لیکن حرکات وسکنات چھوٹے چھچھوڑے انسانوں جیسی کرتے تھے۔

گویا قول وفعل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ جتنی نماز پڑھتے تھے اس سے زیادہ اس کا اشتہار کرتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ چائے پی رہے ہوں، جوس، لسّی یا شربت کو آدھی پونی ہی چھوڑ دیتے اور کہتے کہ دیکھئے اذان ہورہی ہے آپ لوگ نماز نہیں پڑھتے ہیں میں چلا نماز کو، نماز کے بعد یہیں ملتے ہیں کہیں جائیے گا نہیں ابھی گیا ابھی آیا اور بہت تیزی سے بھاگنے لگتے۔

دوستوں نے کہا اماں پورا جوس یا پوری لسّی تو پی لیجئے۔ کہتے نہیں آپ اذان نہیں سن رہے ہیں۔ پھر کبھی پوری لسّی پی لیں گے۔ انھوں نے بار بار ایسا کیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ کینٹین میں کرسی پر بیٹھتے ہی ان کے دوست پوچھتے مولانا دیکھ لیجئے کہیں اذان تو نہیں ہونے والی ہے۔ ایسا کیجئے پہلے آپ نماز پڑھ آیئے پھر چائے پیجئے گا ورنہ آپ کی بھاگم بھاگ ہوجائے گی۔ پہلے آپ پڑھ آیئے۔

مولانا کہتے۔ ''نہیں جی ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا ہے یا ابھی دیر ہے۔''

کوئی کہتا۔ ''گھڑی اور وقت کو اچھی طرح دیکھ لیجئے پھر چائے پینا شروع کیجئے گا۔''

تمام پروفیسران کی عادت سے واقف ہوگئے تھے اس لیئے ان کو ساتھ لے جانے سے گریز کرتے تھے۔

کالج سے دس منٹ کی دوری پر مثال ہاؤسنگ سوسائٹی تھی۔ اس کے سکنڈ فلور پر ایک بیڈ روم اور کچن کا چھوٹا سا فلیٹ خالی تھا۔ کمرے میں آرام سے صرف ایک بستر اور ایک میز کرسی کو لگایا جا سکتا تھا لیکن یہ جگہ کالج سے بہت قریب تھی۔ جاوید، مولانا اور فیض اللہ تینوں دور دراز مقامات پر الگ الگ رہتے تھے۔ روزانہ کی دوڑ بھاگ سے تنگ تھے۔ مولانا نے کہا دیکھئے فلیٹ تو چھوٹا ہے لیکن بقیہ تمام پریشانیوں سے ہمیں نجات مل جائیگی کیونکہ دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر کالج، ہوٹل، بس اسٹینڈ، بازار سب کچھ ہے۔ ان کا کہنا صحیح تھا۔ آخر کار تینوں مثال سوسائٹی میں آگئے۔

بابری مسجد کی شہادت کی تیاری ہوگئی تھی۔ فرقہ واریت نے ماحول کو کشیدہ کر دیا تھا۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی شناخت کرنے لگے تھے۔ تمام مذہبی تنظیموں پر حکومت کی لگام

سخت ہوگئی تھی۔ انٹیلیجنس کو تیز کر دیا گیا تھا۔ کسی سیاسی پارٹی نے ایک دن شہر بند کر دینے کا اعلان کیا۔ روز بروز تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کسی وقت کسی طرف سے کہیں کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ جاوید سکنڈ فلور کی بالکونی سے نیچے بلڈنگ کے کھلے صحن کو دیکھ دیا تھا۔ جاوید کے نیچے فرسٹ فلور کی بالکونی سے گردن نکال کر ایک نوکرانی بلڈنگ کے صحن میں صفائی کرتی ہوئی نوکرانی سے ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے بات کر رہی تھی۔ جھاڑو لگاتی ہوئی نوکرانی نے اشارے سے پوچھا ''ایودھیا کا کیا ہوا؟'' فرسٹ فلور والی ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کے اوپر اور پھر دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں کرتے ہوئے برابر کا اشارہ بتایا یعنی مسجد کو پوری طرح زمین دوز کر دیا گیا ہے۔ تب ہی جھاڑو والی مہترانی کی نگاہ جاوید پر پڑ گئی اور اس نے فرسٹ فلور والی کو اشارہ کیا کہ تمہارے اوپر ایک شخص ہے۔ اس نے گردن موڑ کر جاوید کو دیکھا اور پھر چپ چاپ نیچے کی طرف دیکھنے لگی جیسے اس نے ابھی کوئی بات ہی نہیں کی ہے۔ ماحول اتنا کشیدہ ہو گیا تھا کہ ایک مہترانی تک کو اس امر سے دلچسپی تھی کہ مسجد آج مسمار کر دی گئی ہے تو بھلا سماج کے دوسرے طبقے کے افراد کے ذہنوں کی کیا حالت ہوگی۔

شام کے چھ بج رہے تھے جاوید فلیٹ میں پہنچا تو پیچھے سے مولانا آئے۔ اپنے کمرے میں گئے۔ کپڑا تبدیل کیا۔ لائٹ آف کی اور فوراً بستر پر لیٹ گئے اور چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ لی۔

''کیا ہوا مولانا کہیں طبیعت تو خراب نہیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''نہیں طبیعت ٹھیک ہے پر شہر کی طبیعت خراب ہے۔'' مولانا نے بتایا۔

''کیوں آپ کو کیا ڈر ہے۔ آپ تو نظام مصطفےٰ قائم کرنے والے ہیں؟

''انشاءاللہ وہ تو ایک دن کریں گے ہی مگر فی الوقت پولیس ہر ایسے شخص کے پیچھے پڑی ہے جس کا کسی نہ کسی تنظیم سے تعلق ہے۔''

''اچھا اس لیے آپ چھ بجے سے ہی خانہ دوز ہو رہے ہیں۔ آپ تو بڑی سے بڑی طاقت سے لڑ سکتے ہیں۔ اہل ایمان ہیں پھر یہ پولیس کیا چیز ہے۔ لگتا ہے شہادت بابری

مسجد اور بمبئی کے واقعات سے آپ گھبرا گئے ہیں۔''

''ارے آپ نہیں جانتے۔ گرفتار ہونے سے کون ڈرتا ہے لیکن یہ پولیس والے جیل میں بڑی اذیت دیتے ہیں۔ جم کر پٹائی کرتے ہیں۔ ہڈی پسلی برابر کر دیتے ہیں۔ بھئی یہ مصیبت کون مول لے گا۔ سی آئی ڈی والے بھی ایسے لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''آپ قوم کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟''

''کریں گے وقت آنے پر کریں گے۔ ابھی حالات غیر موافق ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ چادر میں سرتاپا روپوش ہو گئے اور بالکل خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اچانک اٹھے اور سوٹ کیس کھول کر بیٹھ گئے۔ پھر ایک کے بعد ایک کاغذ نکالتے اور پھاڑتے جاتے۔

''یہ اتنے سارے کاغذ کیوں پھاڑ رہے ہیں؟''

جواب ندارد۔ خاموش۔ پھر اٹھے۔ پھاڑے ہوئے کاغذات کو اٹھایا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ آ کر پھر سو گئے۔ صبح جاوید کی نظر ڈسٹ بن پر پڑی تو دیکھا کہ ایک لیٹر ہیڈ پر مولانا کی مذہبی تنظیم کا نام لکھا تھا۔ مولانا شہر میں مختلف مقامات پر اور مسجدوں میں مذہبی تقریریں کیا کرتے تھے۔ یکلخت انھوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ باہر دیر تک رہنا بند کر دیا۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔

مولانا کرتا پاجامہ اور چپل میں کالج جاتے تھے۔ کرتا پاجامہ اور چپل کے موضوع پر جاوید، فیض اللہ اور مولانا کے درمیان اکثر بحث ہوتی تھی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ایک بار فیض اللہ نے کہا مولانا اس کرتے پاجامے میں کالج جاتے ہوئے آپ کو اچھا لگتا ہے۔ ارے یونیورسٹی کے دنوں نیتاگری میں چلا لیے اب تو اسے بدلیے۔

''کیوں بدلونگا؟ میں کبھی نہیں بدلونگا۔ میں آپ لوگوں کی طرح نہیں ہوں۔ یہ میرا مذہبی لباس بھی ہے اور کالج کا بھی۔''

''کالج کا کیسے؟''

''کیونکہ یہ مذہبی اور اقلیتوں کا کالج ہے۔''

''آپ کو تو سمجھانا ہی مشکل ہے۔''

''آپ مجھے کیا سمجھائیں گے؟''

''اکثر ایسی طنزیہ بحثیں ہوتی رہتی تھیں لیکن مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے۔''

گرما کی تعطیل میں مولانا اپنے وطن گئے۔ جہاں سے آتے (دلی، حیدرآباد، بمبئی، ناگپور) نئی داستان لاتے۔اسی لیے فیض اللہ نے پوچھا....

''کہیئے وطن کی کیا خبر ہے۔کوئی تازہ روداد۔''

''نہیں بھئی ایسا کچھ نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور ایک شرٹ اور پتلون کا کٹ پیس جاوید اور فیض اللہ کے سامنے رکھ دیا۔ان دونوں نے سوچا کہیں ہم لوگوں کے لئے تو نہیں لائے۔حیران ہوئے۔

''یہ کیا ہے؟'' فیض اللہ نے پوچھا۔

''یہ سوٹ ہمارے بھائی امریکہ سے لائے تھے۔کہا لیتے جاؤ وہیں سلوا لینا۔'' مولانا نے بتایا۔

''سوٹ تو اس میں کوٹ کدھر ہے۔یہ تو شرٹ پتلون کے کپڑے ہیں۔''

''ہاں بھئی وہی شرٹ پتلون امریکہ کا ہے۔''

''اچھا تو راستے پر آ ہی گئے۔''

''میں کوئی راستے پر نہیں آیا۔میں اسے سلوا نہیں رہا ہوں۔''

''تو لائے کیوں؟''

''بڑے بھائی صاحب نے دیا تو انکار کیسے کرتا۔اب اسے یادگار کے طور پر رکھوں گا۔''

''گویا آپ اب بھی پاجامے میں رہیں گے۔''

''ہاں جناب ایک بار کہہ دیا نا۔آپ لوگ یقین کیوں نہیں کرتے۔''

اس دن جاوید کی طبیعت ناساز تھی۔کالج نہیں گیا۔طالبات کو کسی نے بتا دیا کہ جاوید صاحب کو بخار ہے اس لیے آج کالج نہیں آئے۔ایک بجے دوپہر میں آٹھ دس

طالبات جاوید کو دیکھنے فلیٹ پر پہنچیں۔مولانا بھی آ گئے۔اپنے فلیٹ میں دس طالبات کو دیکھ کر وہ بے چین ہو گئے۔کرسیاں چار تھیں۔چار کرسیوں پر اور بقیہ فرشی بستر کے کنارے بیٹھ گئیں۔جاوید بستر کے دوسرے کنارے پر بیٹھا تھا۔باتیں ہو رہی تھیں۔مولانا کچن سے آئے اور کرسیوں کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔لڑکیاں احتراماً کھڑی ہو گئیں۔انھوں نے کہا۔سر آپ بیٹھیے۔مولانا نے کہا۔نہیں نہیں آپ لوگ بیٹھیے۔یہ کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔طالبات بستر کے کنارے بیٹھ گئیں۔اس حالت میں جاوید کیا بات کرے۔مولانا طالبات سے اس طرح گفتگو کرنے لگے جیسے وہ ان کی کلاس فیلو ہوں۔وہ ہچکچا رہی تھیں مگر مولانا کی داستان شروع۔

"آپ لوگوں کی طرح ہماری بھی بہنیں ہیں۔وہ بھی پڑھتی ہیں۔اس بار امتحان دیا ہے۔کیا آپ کے بھی بھائی ہیں؟ بڑے یا چھوٹے۔میں تو اپنی بہن کو ڈانٹتا بھی ہوں اور پیار بھی کرتا ہوں۔ان کے لئے کپڑے بھی لاتا ہوں۔"

غرضیکہ مسلسل بات کرتے رہے پھر اچانک اٹھے کچن میں گئے اور ٹرے میں چائے لائے۔ایک ایک کو اپنے ہاتھوں سے پیالی دی۔کہا آپ لوگ شرمایئے نہیں۔یہاں پر ہم آپ کے استاد نہیں بلکہ میزبان ہیں۔(خدا معلوم دل میں میزبان تھا یا کچھ اور) آپ لوگ کھانا کھا کر جایئے۔یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ان کی باتوں اور بے تکلفی پر لڑکیاں چونکتی رہیں۔جاوید کو تو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔وہ صرف ہوں ہاں کرتا رہا۔اس نے انھیں کمرے سے ہی رخصت کر دیا۔مولانا سیڑھیوں تک چھوڑنے گئے۔

دوسرے دن جب جاوید کالج میں انھیں طالبات کی کلاس لینے گیا تو انھوں نے کہا۔"سر مولانا سر اس طرح کیوں بول رہے تھے؟"

"سر وہ اس طرح بات کر رہے تھے جیسے ہم لوگ ان کی رشتے دار ہوں۔"

"سر ان کو بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں ہم لوگوں کے بازو میں آ کر بیٹھ گئے۔"

"سر وہ کالج میں بھی ہم لوگوں کو جہاں دیکھتے ہیں روک کر نہ جانے کیا کیا باتیں

کرنے لگتے ہیں۔''

''سروہ نہ جگہ دیکھتے ہیں نہ مقام زبردستی روکتے ہیں، سلام کرتے ہیں اور امی ابا تک کے بارے میں پوچھنے لگتے ہیں۔''

''سران کو سمجھائیے منع کیجئے۔ میرے بھائی نے کل ان کی یہ حرکت کالج میں دیکھی تھی۔ وہ غصہ ہیں۔ سر کالج میں مولانا نے ہی کہا کہ تمہارے سر جاوید صاحب بیمار ہیں کیسی شاگرد ہو جاؤ ان کی مزاج پرسی تو کرو۔ ہم لوگ چلے تو پیچھے پیچھے وہ بھی آ گئے۔''

جاوید کو یہ سب سن کر بڑی شرم آئی۔ وہ کیا جواب دے۔ یہ تو مولانا کی اوچھی حرکت تھی۔ اس نے بڑی نرمی سے انھیں سمجھایا اور انھیں یقین دلایا کہ ہم انھیں سمجھا دیں گے۔ آئندہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔

امتحانات ہو رہے تھے۔ مولانا کی انویجلیشن تھی۔ ایک طالبہ سے امتحان ہال میں کہنے لگے گھبراؤ نہیں۔ آرام سے لکھو۔ اگر تمہیں جواب معلوم نہیں ہو تو قریب کی طالبہ سے پوچھ لو۔ بھئی ہم تمہارے ہمدرد ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کالج کی ایک طالبہ کو وہ تمام سوالات بتا دیے جو امتحان میں آنے والے تھے کیونکہ سوال انھوں نے ہی بنائے تھے۔

دوسرے دن مولانا کی ڈیوٹی ہال نمبر ۳۲ میں تھی۔ اور یہ ہال نمبر ۳۳ میں جا کر ایک طالبہ سے خیریت پوچھنے لگے۔ کیسا امتحان ہو رہا ہے۔ کتنے سوال کئے۔ کون سا جواب نہیں آتا ہے۔ اس ہال کے انویجلیٹر سے سپلیمنٹ لے جا کر اس کو دیا۔ دھاگا لے گئے۔ اپنے ہاتھوں سے سپلیمنٹ کو آنسر پیپر سے باندھا۔ آس پاس کے طالب علم اور انویجلیٹر یہ منظر دیکھتے رہے اور یہ سبھوں سے بے پروا دھاگا پروتے رہے۔ وہ لڑکی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ انویجلیٹر کو ناگوار گذر رہا تھا لیکن یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں مگن تھے۔

بحرالاسلام کالج کے قریب آدم کیمپس کے گرلس اسکول میں گیارہویں بارہویں کے امتحانات ہو رہے تھے۔ مولانا وہاں بھی پہنچ گئے۔ ایک دو ٹیچر کو سلام کرتے ہوئے کوریڈور میں چلتے ہوئے دائیں بائیں کے کمروں میں تاک جھانک کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر

ایک ٹیچر نے پوچھا آپ کس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

''بھئی شگفتہ نام کی طالبہ کہاں ہے میں اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں وہ کمرا نمبر ۳ میں ہے۔ وہاں دیکھئے۔ پنسل بنانے میں اس کی انگلی کٹ گئی ہے وہاں ادھر کنارے۔ مولانا بھاگتے بھاگتے وہاں پہنچ گئے۔ کہا لڑکیوں ہٹو ہٹو کیا ہوا مجھے بتاؤ۔''

''سر ہم لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔''

''نہیں نہیں تم لوگ ہٹو۔ ایک کپڑا لاؤ۔ کہیں سے لاؤ۔''

ایک لڑکی کہیں سے ڈھونڈ کر کپڑے کا ٹکڑا لائی۔ مولانا نے جلدی سے اسے چاک کیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کی انگلیوں میں باندھنے لگے۔ باندھنے کے بعد پوچھا۔ درد تو نہیں ہو رہا۔ اس نے کہا نہیں ٹھیک ہے۔ مولانا نے کہا گھر جا کر دوا لے لینا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔ کچھ ہو تو بتاؤ یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر آئے اور کسی اور سے ملنے کیمپس کے دوسرے اسکول میں چلے گئے۔

لڑکی سے ٹیچر نے پوچھا۔ ''ارے یہ کون تھے؟ تمہارے رشتہ دار ہیں کیا؟''

لڑکی نے بتایا۔ ''نہیں میڈم یہ بحر الاسلام کالج کے پروفیسر ہیں۔ یہ ایک دن میرے بھائی سے ملنے گھر آئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا یہ دونوں ایک ہی مذہبی تنظیم کے ممبر ہیں۔''

استانی نے کہا۔ ''بس اتنا ہی۔ لیکن وہ تو ایسے دکھا رہے تھے جیسے تمہارے کوئی بڑے ہی قریبی رشتہ دار ہوں۔''

''نہیں میڈم میں نے بتایا نا بس ایک بار میں نے ان کو اپنے گھر پر دیکھا ہے۔''

کامرس کے پروفیسر شارق امام اور مولانا ٹرین میں ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ بارہ گھنٹے کا سفر تھا۔ حیدر آباد جانا تھا۔ رات کی گاڑی تھی۔ رزرو ڈبوگی میں سوار ہو گئے ہفتوں پہلے مولانا سے کہا کہ رزرویشن پہلے کرالیں تو بہتر ہوگا۔ مولانا نے کہا ارے رزرویشن کے لئے چنداں فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے تعلقات ریلوے بکنگ کلرک

سے لے کر ٹریول ایجنٹ اور ایم ۔ ایل ۔ اے تک سے ہیں ۔ کسی نہ کسی کوٹا سے ہم رزرویشن حاصل کرلیں گے ۔ آخر تعلقات کس دن کام آئیں گے ۔

شارق نے سفر کے دو دن پہلے پوچھا کہ حضرت کیا پوزیشن ہے ۔ بولے اطمینان رکھیں ۔ ہم ایک گھنٹہ پہلے بھی انتظام کر سکتے ہیں ۔ سفر کے ایکدن پہلے پوچھا تو فرمایا اسٹیشن پر انتظام ہو جائے گا ۔ ڈی ۔ آر ۔ ایم آفس سے اسپیشل کوٹا میں مل جائے گا ۔ اسٹیشن پہنچے رزرویشن کا دور دور تک پتہ نہ تھا ۔ یہ کبھی ڈی ۔ آر ۔ ایم کبھی ٹی ای دفتر کبھی اسٹیشن مینیجر دفتر کبھی اسٹیشن ماسٹر دفتر کے چکر لگا رہے تھے ۔ اور کہتے جاتے تھے یہ دلی نہیں ہے ورنہ ریلوے منسٹر کا کوٹا لے لیتا ۔

آخر کار ٹرین پلیٹ فارم پر آگئی سلیپر کلاس میں یہ سوچکر داخل ہو گئے کہ رزرویشن نہیں تو کم از کم کہیں پر بیٹھنے کی جگہ تو مل جائیگی ۔ مولانا ایک خالی برتھ پر جا کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے رزرویشن ٹکٹ ان کے پاس ہو ۔ ایک گھنٹہ بعد ٹی ٹی آیا ۔ ٹی ٹی نے ٹکٹ دیکھ کر کہا ۔

''آپ کے پاس رزرویشن نہیں ہے ۔ دوسرے ڈبے میں جائیے ورنہ اگلے اسٹیشن پر میں نیچے اتار دونگا ۔''

''ٹی ٹی صاحب ذرا ہم لوگوں کا خیال کیجئے ۔ ہم لوگ کالج کے پروفیسر ہیں ۔ آپ کے بچے بھی کالج میں پڑھتے ہونگے ۔ ہمارے پاس کالج کا کارڈ بھی ہے ۔ یہ دیکھئے ۔ ہم تو منتری کے کوٹا سے ہی ہمیشہ رزرویشن کرواتے ہیں ۔ اس بار ذرا دیر ہوگئی ۔'' مولانا نے کہا ۔

''آپ کسی کالج کے پروفیسر ہوں یا پرنسپل، منتری کے جاننے والے ہوں یا کچھ اور قانون سب کے لئے برابر ہے ۔ آپ کو اترنا پڑے گا ۔ ورنہ میں فائن کر دونگا ۔'' ٹی ٹی نے سختی سے کہا ۔

''کیا پروفیسر سے اس طرح بات کرتے ہیں ؟'' مولانا نے کہا ۔

''نوے روپے فائن کے دیجئے ۔ پھر ہم بتاتے ہیں کیسے بات کرتے ہیں ۔ آپ فائن سیدھی طرح دیتے ہیں یا نہیں ۔'' ٹی ٹی نے ڈانٹا ۔

ٹی ٹی نے یہ جملے ایسے تیور میں کہے کہ مولانا کی سٹی گم ہوگئی۔ دو ٹکٹ کے ۸۰ روپے دیے جس کی رسید دی گئی۔ ٹرین کی اسپیڈ کم ہوگئی تھی اسٹیشن آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ گاڑی رک گئی۔ اسٹیشن آگیا۔

''اپنا سامان اٹھایئے اور نیچے اتریے۔'' ٹی ٹی نے کہا۔

''ہم دوسرے ڈبے میں چلے جاتے ہیں۔'' مولانا نے درخواست کی۔

''کچھ نہیں پہلے اترو پھر تم کو جہاں جانا ہے جاؤ۔'' ٹی ٹی نے غصے میں کہا۔

آخر کار ٹی ٹی نے دونوں کو پلیٹ فارم پر اتار دیا۔ بھاگتے ہوئے دوسرے ڈبے میں گھسے۔

شارق حیدرآباد پہنچ تو گئے لیکن ٹرین میں رات بھر ٹوائلٹ کے پاس بیٹھنا پڑا۔ اور اس کے بعد کان پکڑ لیا کہ اس شخص کے ساتھ کبھی سفر نہیں کرونگا۔

مولانا کو پروفیسری کا خبط تھا۔ کسی سے بھی اور کہیں پر بھی پروفیسر پروفیسر رٹنے لگتے۔ حتیٰ کہ ہوٹل اور ریسٹوران اور چائے خانے میں بھی ویٹر سے کہتے ارے یار ہم لوگ پروفیسر ہیں، بحرالاسلام کالج میں ذرا اچھی چائے پلاؤ۔ یہی نہیں بلکہ سبزی منڈی میں سبزی والی سے کہتے کہ ہم پروفیسر ہیں بھاؤ ٹھیک سے بتاؤ۔ تم زیادہ بتا رہی ہو۔ تمہارا بچہ بحرالاسلام کالج میں تو نہیں پڑھتا۔

ایک دن جاوید ایک بجے دن میں کالج سے جب فلیٹ میں پہنچا تو دیکھا کہ اس کے اور فیض اللہ کے بستر کے درمیان ایک اور بستر لگا ہوا ہے اور مولانا ایک اجنبی سے وہ محو گفتگو ہیں۔

''یہ کس کا بستر ہے؟'' جاوید نے پوچھا۔

''یہ صاحب اخبار کے رپورٹر ہیں اور دو مہینے کے لئے یہیں رہیں گے۔ یہ انھیں کا بستر ہے۔'' مولانا نے کہا۔

''لیکن یہاں تو اتنی جگہ نہیں ہے۔ دو بستر ہی کافی ہے۔''

''جیسے بھی ہو یہ صاحب یہیں رہیں گے۔''

''ایسی حالت میں تو ہم لوگوں کو دقت ہو جائیگی ۔ یہ دوسری فیلڈ کے آدمی ہیں۔ کب آئیں گے کب جائیں گے آپ نے بغیر پوچھے یہاں بستر لگوا دیا؟''

''ہاں کیا ہوا؟ میں نے لگوایا ہے۔ میں نے اس فلیٹ کا انتظام کیا ہے اس لیے میں کسی کو رکھ بھی سکتا ہوں۔''

''ارے یہ تو دادا گیری ہے۔ آپ جو چاہیں گے وہ کریں گے۔''

''ہاں بالکل کریں گے۔ میں نے اس فلیٹ کا انتظام کیا ہے۔''

آخر کار جاوید کو خاموش ہو جانا پڑا۔ مجبوری یہ تھی کہ آسانی سے کوئی فلیٹ ملتا نہیں تھا۔ جو ملتا تھا اس کا کرایہ زیادہ تھا۔ اکیلے رہ کر اتنا کرایہ دینا آسان نہ تھا۔ شہر سے دس کیلو میٹر دور ملتا تھا۔ لیکن وہاں سے ٹرانسپورٹ کے جھمیلے تھے۔ ساڑھے سات بجے کی کلاس لینے کے لئے دو دو بس میں سفر کرنا وہ بھی وقت پر آجائے تو ورنہ آٹو رکشا جو مہنگا پڑتا تھا۔ یہ سب سوچ کر جاوید کو مولانا کی جھڑکیوں کو سن لینا پڑتا تھا۔ دو مہینے اس رپورٹر کی وجہ سے ایسی ایسی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جسے دونوں زندگی بھر نہیں بھلا سکتے۔

فلیٹ میں تینوں اپنے اپنے بستر پر آرام کر رہے تھے۔ شادی کا موضوع زیر بحث آگیا۔ مولانا فرمانے لگے۔

''میرے ہاں شادی خان کی خان میں ہوتی ہے۔ ہم لوگ سید، مرزا اور شیخ کو لڑکی نہیں دیتے۔''

''آپ کے ہاں پردہ سسٹم ہے۔ آپ شادی کس طرح کریں گے لڑکی دیکھ کر یا؟'' فیض اللہ نے پوچھا۔

''ہمارے یہاں لڑکے لڑکی کو نہیں دیکھتے بلکہ گھر کے بڑے بزرگ یہ کام انجام دیتے ہیں۔ لڑکے کا لڑکی کو دیکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور پردہ سسٹم میں لڑکا لڑکی کو کہیں دیکھ بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن یہاں تو آپ دن بھر لڑکیوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ بلکہ دوسرے کالج اور اسکول تک پہنچ جاتے ہیں۔''

''میں کیوں اسکول اور دوسرے کالج میں جاؤنگا؟''

''ثبوت دوں؟''

''میں نے کوئی جرم کیا ہے؟''

''جرم نہیں۔ آپ ایک طرف پردہ سسٹم کی تبلیغ کرتے ہیں اور دوسری طرف پردہ نشین اور غیر پردہ نشین لڑکیوں سے گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ اس وقت معیوب نظر نہیں آتا۔ گویا آپ کے گھر کی خواتین سے کوئی بات کرنا چاہے تو یہ غلط ہے۔ پردہ سسٹم ہے اور آپ دوسروں کے گھر کی خواتین سے باتیں کریں اس وقت پردے کی اہمیت کا خیال نہیں آتا۔ یہ جو آپ ہر مہینے ہم سب کا کرایہ لے کر بلڈنگ نمبر دو کے فلیٹ نمبر ۳۳ میں دینے جاتے ہیں۔ وہاں دو دو گھنٹے کیا کرتے ہیں۔

''کیا کرتے ہیں؟'' مولانا نے پوچھا۔

''آپ مسجدوں میں تقریریں کرتے ہیں کہ ٹی وی مت دیکھو۔ اس پر فحش تصویریں آتی ہیں۔ اس سے بچوں اور جوانوں کا اخلاق خراب ہوتا ہے اور آپ خود فلیٹ اونر کے گھر دو دو گھنٹے ٹی وی دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فلیٹ اونر کا جوان بیٹا اور اس کی جوان بیٹی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کا سبجکٹ الگ ان کا کالج الگ اس وقت آپ کا ٹی وی کا مخرب اخلاق ہونا اور پردہ سسٹم مزاج شریف میں نہیں آتا؟ فیض اللہ نے غصے میں کہا۔

''فلیٹ اونر کا بیٹا اور اس کی بیٹی ہماری تنظیم کے ممبر ہیں اس لیے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ اور ٹی وی پر ہم لوگ خبریں اور معیاری سیریل دیکھتے ہیں۔ گانا نہیں سنتے، فلم نہیں دیکھتے اور بھئی ان لوگوں سے ہمارے تعلقات ہیں۔ کیوں نہ بیٹھیں؟'' مولانا نے اطمینان سے کہا۔

''اس جواب کا جواب ہے میرے پاس۔ کہونگا تو برداشت نہیں ہوگا۔ آپ دوسروں کو الو سمجھتے ہیں کیا؟ اپنے لئے نصیحت دوسروں کے لئے فضیحت۔'' فیض اللہ کا غصہ برقرار تھا۔

''کیا جواب ہے وہ دیجیے۔'' مولانا نے پھر اطمینان سے پوچھا۔

جاوید نے دیکھا کہ فیض اللہ کا جواب بڑا سخت ہوگا۔ کیونکہ فیض اللہ کو جب غصہ آتا تھا تو اسے روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہی سوچ کر اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہے جاوید نے گفتگو کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ باکسنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

دراصل فیض اللہ کے غصہ کی ایک اور وجہ تھی۔ مولانا نے ایک مہینہ کے لئے اپنی بہن کو اپنا کالج اور شہر دکھانے کے لئے بلایا تھا۔ اس کے رہنے کا انتظام قریب کی ایک رہائشی کالونی میں کیا تھا۔ اس کی خبر جاوید اور فیض اللہ کو نہ تھی۔ مولانا چھپ کے دن وہاں گذارتے تھے اور رات میں جاوید اور فیض اللہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دن کسی ضرورت سے مولانا سے ملنا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ البیلا سوسائٹی میں ملیں گے دونوں (جاوید اور فیض اللہ) ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچے۔ دروازہ ناک کیا۔ ایک برقع پوش نے تھوڑا ساہ دروازہ کھولا اور اندر سے ہی پوچھا۔

''کیا کام ہے؟''

''ہم لوگ پروفیسر صاحب کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کیا وہ یہیں رہتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی مولانا نے جلدی سے اس محترمہ کو پیچھے کیا اور خود جھانکتے ہوئے بولے۔ ''ہاں میں یہیں رہتا ہوں آپ لوگوں سے رات میں اپنے فلیٹ میں ملاقات ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

''یہ محترمہ کون تھیں؟ کوئی لڑکی لگ رہی تھی اور مولانا یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

فیض اللہ نے جاوید سے پوچھا۔

''اماں یہ اس کی بہن ہے اس لیے ہم لوگوں کو اندر نہیں بلایا۔ نہ ملوایا۔ اس کے یہاں پردہ سسٹم ہے نا۔'' جاوید نے کہا۔

''بھاڑ میں گیا پردہ سسٹم۔ میں خوب جانتا ہوں اس کی پردہ گیری کو۔ ڈھکوسلہ باز کہیں گا۔'' فیض اللہ نے غصے میں کہا۔

''ارے کیا ہوا؟ اس میں غصہ کی کیا وجہ ہے اس کی بہن ہے چاہے وہ جس سے ملوائے یا جس سے نہ ملوائے۔'' جاوید نے کہا۔

''ہم لوگ کیا بدمعاش لچے اور لفنگے لگتے ہیں۔ دیکھا آپ نے دروازہ سے باہر بھی نہیں نکلا۔ خود بھی پردہ نشین کی طرح دروازے کی اوٹ میں سے بات کر رہا تھا۔ باہر تک نہیں نکلا۔ اس کو اور اس کی رگ رگ کو میں یونیورسٹی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ صرف آپ کی وجہ سے اس کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا مہاتما اور سادھو سمجھتا ہے۔ کتنا پارسا ہے میں خوب جانتا ہوں۔'' فیض اللہ نے غصہ میں کہا۔

''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کل یہ اپنی بہن کو لے کر پروفیسر جلیل کے گھر گئے تھے اور پرسوں پروفیسر کوکنی کے ہاں مدعو تھے۔ ان لوگوں سے اس کی بہن کا پردہ سسٹم نہیں ہے۔ ہم لوگ ہم وطن ہیں۔ جامعہ اور علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہیں۔ ایک فلیٹ میں رہتے ہیں اس لئے ہم ناقابل اعتبار ہیں، غیر ہیں اور وہ لوگ جن کا تعلق دوسری ریاستوں سے ہے جن کا پیشہ مختلف ہے وہ بھروسہ مند ہیں، اپنے ہیں، قریبی ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''یہ اصل میں دوسری لڑکیوں کو جس نظر سے دیکھتا ہے وہی تصور ہم لوگوں کے بارے میں رکھتا ہے۔ سوجھوں کی یہی ایک وجہ ہے۔ توبہ کیجئے ایسے آدمی کے ذکر سے اور ان کے سلوک سے میری تو اس سے بات کرنے کی طبیعت نہیں ہوتی ہے۔'' فیض اللہ نے غصہ میں کہا۔

ایک مہینہ بعد مولانا کی بہن اپنے وطن لوٹ گئی۔ پھر تینوں کی زندگی پہلے کی طرح معمول پر آ گئی۔

شام میں ہمیشہ تینوں ہوا خوری کے لئے ایم جی روڈ بازار کی طرف نکل جاتے تھے۔ اس دن مولانا اپنے بستر پر دراز تھے۔ چہرے سے اداسی عیاں تھی۔ فیض اللہ سیر کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ چلئے۔ جاوید نے کہا۔

''میں نہیں جاؤنگا۔ آپ لوگ جائیے۔'' مولانا نے کہا۔

''کیابات ہے حضرت؟اداس اور خاموش۔'' جاوید نے پوچھا۔

''مت پوچھئے!''

''کیوں کیا ہوا؟''

''بھئی جس لڑکی سے میرے رشتہ کی بات چل رہی تھی اس کی کہیں اور شادی ہوگئی۔''

''کیوں۔وجہ؟''

''وہ لوگ جلد شادی کرنا چاہتے تھے۔میرے گھر والے کو کچھ اور وقت چاہئے تھا۔''

''تو اس میں اتنی اداسی کی کیا بات ہے۔تو نہیں اور سہی۔کوئی اور آئے گی اور اس سے بہتر آئے گی۔''

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہے دراصل وہ لڑکی مجھے پسند تھی۔خوبصورت تھی۔اٹھارہ سال کی تھی۔''مولانا نے کہا۔

جاوید نے دیکھا مولانا کے ہاتھ میں اس کی تصویر تھی۔جاوید نے تصویر دیکھی۔اس نے کہا واقعی خوبصورت ہے لیکن آپ کی قسمت میں نہ تھی۔

''یہ اٹھارہ سال پر کیوں اصرار ہے۔آجکل تو لوگ پچیس سال اور اٹھائیس تیس سالہ سے بھی شادی کرتے ہیں۔'' جاوید نے پوچھا۔

''اٹھائیس سال میں تو لڑکی بڑھیا ہو جاتی ہے۔میں تو اتنی عمر رسیدہ بڑھیا سے نہیں کر سکتا۔مولانا نے زور دے کر کہا۔''

دوسرے دن مولانا نے فرمایا میں کل کی گاڑی سے وطن جا رہا ہوں۔ایک ضروری کام ہے۔

''اچانک!''

''ہاں.....''

''کیا کوئی بُری خبر خدانخواستہ، کس لیے جا رہے ہیں۔؟''

''آکر بتاؤنگا۔''

ایک ہفتہ بعد لوٹے۔ جاوید نے پوچھا تو شرماتے ہوئے بولے۔

''آپ کی بھابی کا انتخاب ہو گیا ہے۔''

''اچھا یہ بات ہے۔ کیسی ہیں۔ گویا آپ لڑکی دیکھنے گئے تھے۔''

شرماتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے۔ خوبصورت ہے۔ مگر پہلے والی کی بات ہی الگ تھی۔ اب تو خیر......''

''ارے چھوڑیئے۔ جو گذر گیا اس کا کیا ذکر۔ چلئے مبارک ہو۔ منہ میٹھا کرائیے۔'' جاوید نے کہا۔

سوٹ کیس میں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی تین چار اشیاء نکالی۔ دونوں کو دیتے ہوئے کہا لیجئے۔ یہ مٹھائی ہے۔ دونوں نے ایسی مٹھائی پہلی بار زندگی میں دیکھی تھی۔

''یہ تو کچھ الگ طرح کی ہے۔ کیا ہے یہ؟''

''ہاں یہ خصوصی طور پر ہم لوگوں کے یہاں بنائی جاتی ہے۔''

دونوں نے جی مار کے زہر مار کیا اور کہا مبارک ہو۔ پہلے کہتے تھے لڑکی دیکھنا بزرگوں کا کام ہے اب خود دیکھ کر آئے تھے۔ خدا معلوم وہ جو کہتے تھے وہ سچ تھا یا جو کرتے تھے وہ سچ اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ دن گذرے، مہینے گذرے، سال گذرے۔ دوسرا موسم گرما آیا۔ تعطیل میں سب اپنے اپنے وطن گئے۔ مولانا بھی گئے۔ جب لوٹ کر پونا آئے تو معلوم ہوا شادی کر کے آئے ہیں۔ تنہا آئے تھے۔ فیض اللہ اور جاوید دونوں نے پوچھا۔

''کمال ہے آپ نے شادی کر لی اور ہم لوگوں کو دعوت تک نہیں دی۔''

''وہ ایسا ہوا کہ سب کچھ اچانک ہو گیا اس لئے آپ لوگوں کو خبر نہ کر سکے۔''

سب سے حیرانی کی بات تو کچھ اور ہی تھی جو جاوید اور فیض اللہ کو نظر آئی اور جس پر دونوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ آیا وہی شخص ہے یا کوئی اور۔ یعنی مولانا شرٹ پتلون اور جوتے میں کرتا پاجامہ غائب۔ اتنی بڑی تبدیلی کیونکر ہوئی۔ مولانا پتلون پر ایمان کیسے لائے۔

''جو کام پوری دنیا والے نہیں کر پائے اسے ایک عدد بیوی نے کر دکھایا۔ اسے

کہتے ہیں عورت کی طاقت ۔آخر انھوں نے آپ کی دنیا بدل ہی دی ۔ ماشاء اللہ آپ تو سسرال والے شرٹ پتلون میں جچ رہے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

مولانا مسکراتے اور شرماتے ہوئے بولے:'' وہ ذرا بیگم نے اصرار کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔''

'' اچھا ذرا سے اصرار کا یہ نتیجہ ہے آگے خدا ہی حافظ ہے۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے...''فیض اللہ نے کہا۔

'' انشاءاللہ نتیجہ اچھا ہی رہے گا۔''مولانا نے بھاری آواز میں جواب دیا جیسا کہ ان کی عادت تھی۔

ایک بار جاوید اور فیض اللہ کو وہ بات سنائی کہ دونوں پوری رات نہ سو سکے۔مولانا دیر رات کہیں سے فلیٹ میں آئے اور کہنے لگے ایسا ہے پروفیسر صاحبان تیسرے دن آپ لوگ یہ فلیٹ خالی کر دیجئے۔

'' کیوں؟''فیض اللہ نے حیرت سے پوچھا۔

'' دو مہینے کے لئے ایک فیملی آرہی ہے۔اسے قیام کرنا ہے۔دو مہینے کے بعد پھر آجائیے۔''

'' تو ہم لوگ کہاں جائینگے؟' جاوید نے پوچھا۔

'' کہیں بھی جائیے۔''

'' آپ نے اچانک اور اکیلے یہ فیصلہ کیسے کرلیا۔ہم سے پوچھا بھی نہیں۔''

'' آپ سے کیا پوچھنا؟ یہ فلیٹ میں نے ڈھونڈا تھا۔میں اس میں کسی کو لاؤں آپ کو کیا ہے۔تیسرے دن خالی کر دیجئے گا۔''

'' یہ تو زیادتی ہے۔دو دن میں نئی جگہ کہاں ملے گی؟''

''جہاں جائیے۔''

آخر کار دونوں نے فلیٹ خالی کر دیا۔مجبوراً جاوید کو ایک لاج میں جانا پڑا اور فیض اللہ

احمد نگر روڈ کی طرف وشرانت واڑی میں چلے گئے۔ پتہ نہیں اس فلیٹ میں ایک فیملی آئی یا انکی اپنی بیگم۔ دو کی جگہ دس مہینے گزر گئے۔ جاوید اور فیض اللہ کبھی دوبارہ اس فلیٹ کی طرف نہیں گئے۔

پروفیسر فیض اللہ سے جاوید کی ملاقات مولانا نے کرائی۔ جاوید کالج آفس کے پاس سے گذر رہا تھا۔ سامنے سے مولانا آرہے تھے۔ قریب آئے سلام خیریت ہوئی۔ ان کے ساتھ میانہ قد کا چھبیس ستائس سالہ ایک نوجوان شخص تھا۔ ہلکی چگی داڑھی، چھوٹی مونچھ، چھوٹا چہرہ، یعنی قد کے لحاظ سے چہرہ چھوٹا تھا۔ اوپر کا ہونٹ درمیان سے اس طرح کٹا ہوا جیسے انگریزی حرف وی کی الٹی شکل ہوتی ہے اور اردو کے ہندسہ آٹھ کی سیدھی۔ رنگین ٹی شرٹ، بلیو جینز اور لیو اسپورٹس جوتے میں وہ مسکرا رہے تھے۔ مولانا نے کہا یہ پروفیسر فیض اللہ ہیں۔ انھوں نے سینیر کالج میں شعبۂ کیمسٹری میں دو دن پہلے بحیثیت لکچرر جوائن کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم ایس سی ہیں۔ جاوید نے مبارکباد دی۔

پروفیسر فیض اللہ کو دیکھکر جاوید کو محسوس ہوا کہ ابھی ان کا طالب علمی کا روغن اترا نہیں ہے۔ لگتا ہے پڑھانے نہیں بلکہ خود پڑھنے آئے ہیں۔ سلام کلام سے اندازہ ہوا کہ تہذیب وتمدن بھی خام ہے۔ لباس سے طالبعلمانہ مزاج ظاہر ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی سے آرہے ہیں۔ یہاں کالج کا ماحول اور مزاج کچھ اور ہے۔ دیکھیئے اسے کیسے جھیل پاتے ہیں۔ جاوید کا پہلا تاثر یہی قائم ہوا۔

جاوید، مولانا اور فیض اللہ تینوں نے ایک دو سال کے فرق پر ملازمت جوائن کی تھی۔ کالج سے سات آٹھ کیلومیٹر دور الگ الگ مقام پر کرایے کے کمروں میں رہ رہے تھے۔ تینوں نے ارادہ کیا کہ ملکر ایک فلیٹ کرایہ پر لیا جائے۔ ایک شخص کے لیئے ایک فلیٹ مہنگا ہوگا۔ تین کے ساتھ رہنے سے کرایہ تقسیم ہو جائیگا۔ کھانا بھی فلیٹ میں پکے گا۔ ہوٹل کی حاضری بھی بند ہو جائیگی اور سب ایک ساتھ کالج جایا کریں گے۔ رکشا میں بس میں یا پیدل۔ اگر فلیٹ کالج کے قریب مل جاتا تو مزہ آجاتا۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا اگر یہی بات ہے تو میں آج سے ہی کوشش کرتا ہوں۔ میرا جس مذہبی تنظیم سے تعلق ہے اس کی

شاخیں ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں۔اس شہر میں بھی ہیں جس کا میں صدر ہوں۔صدر کے ناتے میں شہر کے تمام نوجوانوں کو جانتا ہوں جو اس کے ممبر ہیں۔اس شہر میں ہمارے اچھے تعلقات ہیں۔وہ کب کام آئیں گے۔انشاءاللہ میں اپنے تعلقات کے رسوخ پر ایک اچھے فلیٹ کا انتظام کرتا ہوں۔انھوں نے تعلقات کے 'ق' پر زور دے کر کہا۔

ایک ہفتے بعد مولانا نے جاوید اور فیض اللہ سے کہا کہ آپ دونوں کے لئے خوشخبری ہے۔وہ یہ ہے کہ رہائش کا مسئلہ ختم ایک شاندار فلیٹ کا انتظام ہوگیا ہے۔

''بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔''فیض اللہ نے خوشی سے کہا۔

''میں نے کہا تھا نہ آپ لوگوں سے۔تو کب چل رہے ہیں فلیٹ دیکھنے سیتا ہاؤسنگ سوسائٹی۔یہاں سے آٹو رکشا کو دس منٹ لگے گا اور پیدل بیس پچیس منٹ۔جناب آخر ہمارے تعلقات کس دن کام آئینگے؟''مولانا نے جوش میں کہا۔

''کیوں جاوید صاحب آج ہی چلتے ہیں کلاس ختم کر کے دو بجے؟''فیض اللہ نے پوچھا۔

''ہاں بہتر ہوگا۔''جاوید نے کہا۔

دو بجے دن میں کلاس ختم ہوئی۔تینوں آٹو رکشا میں بیٹھے۔سیتا ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچے۔وہاں ایک ضعیف میاں بیوی تینوں کا انتظار کر رہے تھے۔سکنڈ فلور پر دو بیڈ روم کا فلیٹ تھا۔کشادہ، ہوادار اور صاف ستھرا۔سب کو پسند آ گیا۔جاوید نے کہا فوراً طے کر لیجیے۔ہملوگ آج ہی اپنا سامان لے آئینگے۔مولانا نے میاں بیوی سے ڈھائی ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر پیمان کر لیا۔تینوں پروفیسر رات گئے نئے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔تینوں روم پارٹنر بن گئے۔ایسا کئی بار ہوا۔تینوں ایک ساتھ ہو جاتے پھر الگ اور پھر ایک ساتھ۔

جاوید نے کہا بھئی مجھے پی۔ایچ۔ڈی کا کام سمیٹنا ہے اسلئے میں ایک کمرے میں تنہا رہونگا۔آپ دونوں ایک کمرے میں شیئر کر لیجئے۔فیض اللہ مولانا کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تھے۔جاوید نے اسے سمجھایا کہ دن میں تو سب کالج میں رہینگے۔شام میں ٹہلتے ہیں۔

رات میں تھوڑی دیر کے لئے سبھوں کی ملاقات ہوگی اور صبح ساڑھے سات کی بھاگم بھاگ۔فیض اللہ تیار ہو گئے۔

جاوید دیر رات تک مطالعہ کرتا تھا۔اس کا کمرا الگ تھا۔اس لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔فیض اللہ رات گئے فلیٹ میں آتے۔کبھی شرٹ پینٹ کبھی جیکٹ جینز پہنے سو جاتے۔کبھی تبدیل کر لیتے۔کبھی فوراً سو جاتے۔کبھی دیر رات تک مطالعہ کرتے رہتے۔جس رات مطالعے کا بھوت سوار ہو جاتا رات کے دو بجا دیتے۔مولانا کو پڑھنے لکھنے کی اچھی عادت نہ تھی۔نو دس بجے بستر پر دراز ہو جاتے۔بار بار کروٹ بدلکر فیض اللہ کو لائٹ آف کرنے کا احساس دلاتے مگران سب سے بے خبر فیض اللہ اپنے مطالعے میں مصروف رہتے۔تھک ہار کر مولانا کہتے۔

''بہت رات ہوگئی۔مجھے نیند آرہی ہے۔لائٹ آف کیجئے۔''

''کیوں؟لائٹ آف نہیں ہوگی آپ ایسے ہی سو جایئے۔''فیض اللہ جواب دیتے۔

''آپ کو جاگنا ہے تو جاوید صاحب کے کمرے میں جایئے۔''

''میں کیوں جاؤں اس کمرے میں۔کیا میں کرایہ نہیں دیتا ہوں۔میں ابھی پڑھوں گا۔''

''مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی اور صبح اٹھنا ہے۔''مولانا اٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتے اور کہتے۔

''صبح مجھے بھی اٹھنا ہے اور کالج جانا ہے۔''فیض اللہ جواب دیتے۔

مولانا بستر سے اٹھے سوئچ آف کیا اور بستر پر دراز ہو گئے۔

فیض اللہ بستر سے اٹھے سوئچ آن کیا اور کتاب ہاتھوں میں لے لی۔

''تو آپ ایسے نہیں مانیں گے۔''

''تو آپ مجھے پڑھنے نہیں دینگے۔''

''تو آپ مجھے سونے نہیں دینگے۔آپ چاہتے کیا ہیں؟''مولانا نے گرج کر کہا۔

''وہی جو آپ چاہتے ہیں۔''فیض اللہ نے آنکھیں گھما کر کہا۔

جاوید نے اپنے کمرے سے دونوں کی تو تو میں میں سن کران کے کمرے میں گیا اور مولانا سے کہا بھئی یہ آدھا گھنٹہ مطالعہ کے بعد لائٹ آف کردینگے جبتک آپ کو بھی آہستہ آہستہ نیند آجائیگی۔اچانک تو آئیگی نہیں۔فیض اللہ سے کہارات واقعی زیادہ ہوگئی ہے۔ایسا ہے دس پندرہ منٹ بعد لائٹ آف کردیجئے۔فیض اللہ نے کہا ان کو سمجھایئے یہ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے تنہا یہی فلیٹ کا کرایہ دیتے ہیں۔جاوید نے کہا چھوڑیے ان باتوں کو بحث میں اور بھی رات ہوجائے گی۔صبح آپ کو بھی کالج جانا ہے۔مولانا نے کہا اچھا ٹھیک ہے آدھا گھنٹہ دیکھتے ہیں۔فیض اللہ نے دس منٹ بعد لائٹ آف کردی۔جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

مولانا اور فیض اللہ کی بحث اور رسہ کشی میں یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کس کا مزاج، ذہنیت اور پسندوناپسند کیا کیا ہے۔دونوں پوسٹ گریجویٹ تھے۔ایک آرٹس دوسرا سائنس۔اسطرح مضمون کا فرق تو تھا ہی۔مولانا کالج کے علاوہ مذہبی امور میں بھی لگے رہتے۔مذہبی جلسوں میں شرکت کرنے شہر کے دوردراز علاقوں میں جاتے اور لوٹتے لوٹتے رات کے گیارہ بج جاتے۔اتنا تھک جاتے کہ آتے ہی انھیں نیند آنے لگتی اور لائٹ آف کر دیتے۔فیض اللہ کو یہ پسند نہ تھا۔وہ اتنے مذہبی نہ تھے۔مذہب کے بنیادی احکامات کی تعمیل کرلیتے تھے بس۔اس لیے جاوید کو مولانا سے زیادہ فیض اللہ اپنے قریب محسوس ہوئے۔ اکثر شام کو دونوں سیر کرنے نکل جاتے۔

ہر دوسرے تیسرے دن مولانا دوران گفتگو ضرور کہتے کہ یہ فلیٹ میں نے اپنے تعلقات پر آپ لوگوں کو دلایا ہے ورنہ کہاں کہاں مارے مارے پھر رہے تھے۔حالانکہ خود بھی اکیلے مارے مارے ہی پھر رہے تھے لیکن یہ انہیں یاد نہیں رہتا تھا۔کالج جوائن کرنے کے بعد مولانا چھ مہینے تک ایک مسجد کے فرسٹ فلور پر رہے تھے۔گراونڈ فلور پر مسجد تھی اور فرسٹ فلور پر اسلامی کتب خانہ۔اسی میں مذہبی تنظیم کا دفتر بھی تھا۔اوران دنوں اس تنظیم کے سٹی برانچ کے مولانا صدر تھے۔یہ سوچ سمجھ کراس شہر میں آئے تھے کہ رہائش تنظیم کے دفتر

میں اور ملازمت کالج میں۔ یہی انہوں نے کیا۔ ایک کونے میں سوٹ کیس رکھا اور بیچ دفتر میں اپنا بستر بچھا دیا اور رہنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ خبر دیگر ارکان تنظیم اور شہر والوں تک پہنچی۔ مسجد کمیٹی والوں کو بھی معلوم ہوا۔ انہوں نے میٹنگ لی اور طے کیا کہ انہیں منع کر دیا جائے۔ انہیں منع کیا گیا کہ یہاں سونا ممنوع ہے لیکن خاں صاحب کی ایک ہی ٹر ''میں شہری برانچ کا صدر ہوں، خاموش رہیے، میں تنظیم کا علاقائی صدر ہوں۔'' آخر کار مسجد کمیٹی والوں نے ان کا سامان مسجد کے باہر پھینک دیا اور دفتر میں تالا لگا دیا کہ نہ دفتر کھلے گا اور نہ ہی یہ داخل ہونگے۔ اس طرح یہ وہاں سے نکالے گئے اور اب فلیٹ دلا کر پھر وہی ٹر اور دوسروں سے کہنا کہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ مولانا سے فلیٹ کے طعنہ جاتی جملے سن سن کر جاوید اور فیض اللہ کے کان پک گئے۔ مہینہ گزرنے پر دونوں نے اپنے اپنے حصے کا کرایہ دیا تو مولانا نے کہا 667 روپے مزید دیجیے۔

''کس بات کے 667 روپے؟ فیض اللہ نے پوچھا۔

''اتنے بڑے شہر میں اتنی اچھی رہائشی سوسائٹی میں اتنا شاندار فلیٹ کیا یونہی مل جاتا ہے؟'' مولانا نے فرمایا۔

''کیا مطلب؟'' فرض اللہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ ہے کہ دو ہزار روپے ایجنٹ کو کمیشن دینا ہے۔ بھئی میں نے ایجنٹ سے کہا تھا کہ شاندار فلیٹ کسی اچھی سوسائٹی میں دلاؤ۔ بڑی مشکلوں کے بعد اس سوسائٹی میں یہ فلیٹ اس نے ڈھونڈا۔ اس نے محنت کی ہے تو اس کا کمیشن تو دینا پڑیگا۔'' مولانا نے وضاحت کی۔

''پہلے تو آپ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ اچانک آپ کمیشن کہاں سے لے آئے؟ آپ کیا ہمیں بیوقوف سمجھتے ہیں؟ میں آپ کو یونیورسٹی سے ہی جانتا ہوں۔''

''کمیشن تو دینا ہی پڑیگا۔''

''آپ تو تعلقات تعلقات رٹا کرتے تھے۔ اس کا کیا ہوا؟''

''ارے تو تعلقات ایجنٹ سے نہیں ہوتے کیا؟ ایجنٹ ایرے غیرے کو فلیٹ نہیں دلاتا۔ وہ ہم تھے اس لئے جلد اس نے انتظام کردیا۔'' مولانا نے کہا۔

''آپ کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی اسلئے تو آپ لوگوں کو......''

جاوید نے فیض اللہ کا ہاتھ پکڑ کر کنارے کیا ورنہ وہ بخشنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھے۔ جاوید کے کہنے پر اس نے کمیشن کے روپے دے دیے۔

جو میاں بیوی فلیٹ کی چابی لے کر آئے تھے ان میں ایک بحرالاسلام کالج میں پروفیسر تھیں۔ راشدہ نام تھا ان کا۔ ان کا سبجکٹ بھی عربی تھا جو مولانا کا تھا۔ ظاہر ہے اسطرح شعبہ بھی ایک ہوگیا۔ پروفیسر راشدہ سے کرایے کے فلیٹ کے لیے مولانا نے پوچھا تھا۔ وہ بولیں میرا فلیٹ خالی ہے اسے لے لیجیے۔ پروفیسر راشدہ کسی شریف کرایہ دار کی تلاش میں تھیں۔ ہم شعبہ اور اپنے ہی کالج کے پروفیسر سے زیادہ شریف کرایہ دار اور کون ہوسکتا تھا۔ وہ فوراً کرایہ پر دینے کو تیار ہوگئیں۔ اس بیچ ایجنٹ کہاں سے آن پڑا؟ وہ کون تھا؟ کہاں دفتر تھا؟ یہ کہانی جاوید اور فیض اللہ کی سمجھ میں نہ آئی۔ دونوں نے کمیشن کے پیسے مولانا کو دیے۔ آخر تعلقات بھی تو کوئی چیز ہے۔

کچھ دنوں بعد مولانا نے جاوید اور فیض اللہ کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا کہ جب ہم تینوں ایک ساتھ رہتے ہیں تو کیوں نہ ایک باورچن کو رکھ لیں۔ یہ دن رات ہوٹل کا کھانا صحت کے لیئے مضر ہے اور پیسے بھی زیادہ خرچ ہوتے ہیں۔

''خیال تو بہتر ہے۔ میں تیار ہوں۔'' جاوید نے کہا۔

''آپ لوگوں کی کھانے بازی میں میں شریک نہیں ہوں۔'' فیض اللہ نے دو ٹوک جواب دیا۔

''کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ جب دو راضی ہیں تو آپ کو انکار کیوں ہے؟ مولانا کا چہرہ اتر گیا۔ اداس ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کہہ دیا نا، میری مرضی۔ میں کسی بھی حالت میں حصہ دار نہیں بن سکتا۔''

فیض اللہ نے روکھا سا جواب دیا۔

اگلے دن کالج میں فیض اللہ سے جاوید کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہاں پر کوئی نہ تھا۔ جاوید نے فیض اللہ سے کالج میں پوچھا کہ آپ مشترکہ کھانا کھانی میں کیوں نہیں شریک ہو رہے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا۔ تو اس نے تناؤ بھرے لہجے میں کہا کہ میں کبھی بھی اس کھانا کھانی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً اس شخص کے ساتھ۔ اگر آپ اکیلے ہوتے تو میں شامل ہو جاتا لیکن وہ آپ کے ساتھ ہے اس لئے نہیں ہو سکتا۔ فیض اللہ کسی بھی طرح کھانے میں شرکت کے لیے تیار نہ ہوئے۔

مولانا نے پچاس سالہ باورچن کا انتظام کیا۔ وہ روزانہ بارہ بجے دن میں آتی اور دن رات کا کھانا ایک ساتھ پکا کر چلی جاتی۔ ضعیفہ تھیں۔ دور سے بس سے آنا پڑتا تھا اسلئے دو وقت کا کھانا دن میں ہی پکا دیتی۔ ایک بجے مولانا اور جاوید فلیٹ واپس آجاتے۔ فیض اللہ ہوٹل چلے جاتے۔ باورچن کھانا پکا رہی ہوتی اور مولانا کچن میں بیٹھ کر اس سے کالج اور اپنے گھر کی باتیں کرنے لگتے۔ وہ باورچن کو خالہ کہتے تھے۔ پوچھتے خالہ آج کیا کھانا پکا رہی ہیں۔ ہماری بہنیں بھی اچھا کھانا پکاتی ہیں۔ ہماری والدہ کو مختلف اقسام کے کھانوں کا شوق ہے اور پکانا بھی جانتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ باورچن کی جھونپڑپٹی میں کسی شادی میں شرکت کرنے پہنچ گئے اور جھونپڑپٹی میں چٹائی پر بیٹھ کر اتنی بے تکلفی سے کھانا کھایا جیسے ان کے اپنی بہن کی شادی ہو۔

ایک مہینہ بعد مولانا باورچن خالہ سے اپنی پسند کا کھانا پکوانے لگے۔ جاوید کو وہ کھانا پسند نہ بھی ہوتا تب بھی اسے ہی پکواتے۔ ایک دن چھٹی مانگتے یہ دو دن دیتے۔ پروفیسر جلیل کے یہاں زچگی ہوئی تو باورچن خالہ کو ایک مہینہ کے لیے ان کے یہاں بھیج دیا۔ ہر مہینہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کرنے لگے۔ باورچن رہنے کے باوجود کھانے کی دقت ہونے لگی۔

''آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''بھئی باورچن کا انتظام میں نے کیا ہے۔ میں جیسا چاہوں اس سے کام

لونگا۔ اپنے فلیٹ میں اور دوسروں کے یہاں بھی۔'' مولانا جواب دیتے۔

جن دنوں باورچن پروفیسر جلیل کے یہاں کام کرنے بھیج دی گئی جاوید فیض اللہ کے ساتھ ہی ہوٹل میں کھانا کھانے جاتا تھا۔

''جاوید صاحب آپ لوگ تو گھر کا کھانا کھا رہے تھے تو اچانک پھر ہوٹل؟''

فیض اللہ نے پوچھا۔

''ارے یار مولانا کی حرکتوں سے میں عاجز ہوں۔ باورچن پر اپنا حق جتاتے ہیں اور دوسرے پروفیسروں کے ہاں بھی کھانا پکانے بھیج دیتے ہیں۔ جو کھانا مجھے پسند نہیں اسے بھی پکواتے رہتے ہیں۔ میں اعتراض کرتا ہوں تو کہتے ہیں باورچن کا انتظام میں نے کیا ہے۔ میں اپنی مرضی کا کھانا پکواؤنگا۔ میرا تو ناک میں دم آگیا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ یہی سب ہوگا۔ اس لیے میں نے فوراً انکار کر دیا تھا۔ میں اس شخص کو یونیورسٹی کے زمانے سے جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں۔ اوپر کچھ اندر کچھ۔ میں نے یہ کیا۔ میں نے یہ کرایا۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ لفاظی، جھوٹ، چاپلوسی، نیتا گری، روزانہ بیسیوں افراد سے ملنا خود ستائی اور مذہبی نمائش اس کی فطرت ہے۔ نہ اسکول، نہ بارہویں اور نہ کالج، مدرسہ سے سیدھے ایم۔اے یونیورسٹی میں۔ پہلے لنگی قمیص، پھر کرتا پاجامہ پھر شرٹ پتلون۔ پہلے حافظ جی پھر مولانا اور اب پروفیسر شرم نہیں آتی۔ میں اس کے ساتھ کسی بھی حال میں فلیٹ میں بھی نہیں رہتا آپ کے کہنے پر تیار ہوگیا۔ مجھے تو اس شخص سے کراہیئت ہوتی ہے۔

موسم گرما کی تعطیل کے موقع پر جاوید اور فیض اللہ نے پروگرام بنایا کہ بیجاپور، بنگلور اور برندابن کی سیر کی جائے۔

رزرویشن نہیں مل پایا۔ چار بجے شام میں ٹرین تھی۔ کالج ورکنگ ڈے کا آخری دن تھا۔ کلوزنگ میٹنگ تین بجے سہ پہر میں تھی۔ دونوں اپنا رخت سفر کالج لے آئے تھے۔ اس لیے جیسے ہی ساڑھے تین بجے میٹنگ ختم ہوئی دونوں میٹنگ ہال سے بھاگتے ہوئے

نکلے۔ چپراسی ہاتھوں میں چائے سے بھرا ٹرے لے کر آ رہا تھا۔ فیض اللہ کا ہاتھ ٹرے میں لگا۔ چپراسی نے ٹرے کو گرتے گرتے سنبھال لیا۔ فیض اللہ نے سوری کہا اور بھاگتا رہا۔ پیچھے پیچھے جاوید بھاگ رہا تھا۔ اسے اس طرح بھاگتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا۔ اگر میٹنگ ہال سے پرنسپل کی نظر پڑی تو کیا سوچیں گے لیکن وقت بہت کم تھا۔ کالج آفس سے دونوں نے اپنا اپنا بیگ اٹھایا۔ روڈ پر گئے۔ آٹو رکشا میں بیٹھے۔ بیس منٹ میں اسٹیشن پہنچے۔ تین نمبر پلیٹ فارم پر دوڑتے ہوئے گئے۔ پچیس منٹ ہو گئے تھے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ دونوں سلیپر کلاس میں چڑھ گئے۔ پانچ منٹ بعد ٹرین اسٹارٹ ہوگئی۔ تب دونوں کی جان میں جان آئی۔ چلو کسی طرح ٹرین تو مل گئی۔ اب آگے جو ہوگا دیکھ لیں گے۔

دونوں نے بیجاپور، بنگلور اور برندابن کی سیر کی۔ فیض اللہ کے پاس کیمرا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ فوٹو کتنے نزدیک اور کتنی دوری سے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً آدھے فوٹو خراب نکلے۔ کسی فوٹو کو بہت دور سے لیا گیا تھا اس لئے چہرے مدھم پڑ گئے تھے اور کسی کو بہت قریب سے لیا تھا اس لیے صورتیں بے ڈھب ہوگئی تھیں۔ جاوید کہتا کتنا خوبصورت منظر ہے۔ فاضل جواب دیتے مجھے تو اس میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ جاوید دل میں کہتا یار میں بھی کس بدذوق کے ساتھ ان مقامات کو دیکھنے آ گیا۔ سارا لطف جاتا رہا۔

دس دن کے سفر میں جاوید کو فیض اللہ کو نزدیک سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ فیض اللہ نے یونیورسٹی کے دن ہوسٹل میں نہیں بلکہ یونیورسٹی سے پانچ کیلومیٹر دور ایک کرایے کے مکان میں بسر کئے تھے۔ اس لیے ان میں محفل بازی، یار باشی، لطیفہ گوئی اور ہنسی مذاق کی کمی تھی۔ ان احساسات سے وہ کوسوں دور تھے۔ ہر نوجوان غیر شادی شدہ کا مزاج تھوڑا اسا رومانوی ضرور ہوتا ہے۔ فاضل اس مزاج سے پرے تھے۔ رومانی واقعات کو سن کر وہ چونکتے تھے۔ اچھا ایسا ہوتا ہے لیکن کیوں؟ انہیں سمجھانا بڑا مشکل تھا۔ اس لیے جاوید موضوع بدل دیتا تھا۔ کسی لطیفہ پر انہیں ہنسنے اور محظوظ ہونے نہیں آتا تھا۔ لطیفہ پیش کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ ان کا کہنا تھا مجھے لطیفہ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ آخر اسے سن کر لوگ ہنستے کیوں

ہیں۔اخبار کے کارٹون کے نیچے کی عبارت کے بارے میں ان کا یہی خیال تھا کہ یہ جملے مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آتے لوگ انھیں کس طرح کارٹون سے جوڑ کر مسکراتے ہیں۔آخر کار جاوید اس نتیجہ پر پہنچا کہ فیض اللہ سماج اور محفل ہی نہیں شعروادب اور تہذیب وتمدن سے میلوں دور ہیں اس لیے ان سے آدھا میل نہیں تو پون میل دور ضرور رہنا چاہئے۔

لیکن دور رہنا اتنا آسان نہ تھا آخر فلیٹ پارٹنر جو ٹھہرے۔کالج بھی ایک تھا۔ ابھی تو پروفیسر فیض اللہ کی نئی فضیلتوں سے فیضیاب ہونا باقی تھا۔ایکدن فیض اللہ نے جاوید سے کہا کہ مجھے اس وقت تین سو روپے کی اشد ضرورت ہے۔تین دن بعد تنخواہ ملے گی تو واپس کردونگا۔جاوید نے روپے دیدیے۔تین دن گذر گئے۔چھ دن گذر گئے۔جاوید نے سوچا ذہن سے نکل گیا ہوگا۔یاد آنے پر خود ہی دیدیں گے۔اتنی چھوٹی سی رقم کی یاددہانی اوچھی حرکت ہوگی۔لیکن چھ پر چھ دن گذرتے گئے۔اور مہینہ بھی نکل گیا۔تو جاوید کو اندیشہ ہوا۔تین دن کا وعدہ جب دو مہینے کے بعد بھی یاد نہیں آیا تو جاوید نے فیض اللہ سے کہا۔

''جناب ہمیں ایک کام میں کچھ پیسے کم پڑرہے ہیں اگر آپ کے پاس ہوں تو........''

''میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں۔صرف کھانے کے بچے ہیں۔''فیض اللہ نے فوراً جواب دیا۔

فیض اللہ کو لئے ہوئے قرض کا خیال نہیں آیا۔مجبوراً جاوید نے یاددلانا ضروری سمجھا ورنہ معلوم نہیں کتنے دن اور لگ جائیں۔جاوید نے کہا فیض اللہ صاحب دو مہینے پہلے تین دن کے وعدے پر آپ نے اس ناچیز سے تین سو روپے لئے تھے؟

''ہاں لئے تھے تو۔''فیض اللہ نے کرختگی سے کہا۔

''کب واپس کررہے ہیں۔'' جاوید نے نرمی سے کہا۔

''جب ہوگا واپس کردیں گے۔ابھی میرے پاس نہیں ہیں۔''فیض اللہ نے پہلے کی طرح کہا۔

’’جناب دو مہینے سے اوپر ہو گئے ہیں۔‘‘

’’ہو گئے تو میں کیا کروں۔ ہو گا تب دونگا۔ ابھی نہیں ہیں۔ فیض اللہ نے پھر کر خنگی سے کہا۔‘‘

جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔ اس شخص کو یہ احساس نہیں کہ آڑے وقت پر اس کی مدد کی گئی۔ وعدہ وفا نہ کیا۔ ذرا نرمی سے بات تو کرے۔ کوئی بہانا کر دے۔ مگر یہ تو اس طرح بات کر رہا ہے جیسے قرض دار میں ہوں اور یہ قرضخواہ۔ اس سے بحث فضول ہے۔ دیا ہے تو بھگتو۔ نہ جانے آئندہ کیا کیا بھگتنا پڑے گا۔

جاوید کے فلیٹ کے داہنی طرف کے فلیٹ میں ایک قریشی فیملی رہتی تھی۔ شوہر صبح صبح دکان پر گوشت بیچنے چلا جاتا تھا۔ فلیٹ میں اس کی ناخواندہ بیوی پورے دن اپنا کام کرتی رہتی تھی۔ پندرہ سال کا بیٹا باپ کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ پانچویں پاس جوان بیٹی گھر میں ماں کی مدد کرتی تھی۔ اس کے فلیٹ میں ٹیپ رکارڈر، ٹی وی، میوزک سسٹم سب تھا۔ کچھ نہ کچھ ہمیشہ بجتا رہتا تھا۔ ایکدن قریشی محترمہ نے تینوں پروفیسروں کو چائے پر بلایا۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ وہ چائے لانے کچن میں گئیں۔ جاوید اور مولانا ٹی وی دیکھنے لگے۔ خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ پروفیسر فیض اللہ نے اپنا منہ ٹی وی سے دوسری طرف کر لیا۔ جاوید نے پوچھا

’’کیا آپ ٹی وی نہیں دیکھتے؟‘‘

فیض اللہ مسکرائے شرمائے اور بولے ’’ہاں میں نہیں دیکھتا۔‘‘

’’کبھی نہیں دیکھا۔‘‘

’’ہاں جب سے مجھے ہوش ہے میں نے ٹی وی نہیں دیکھا۔ یہ غیر اسلامی ہے۔ ٹی وی کیا ہے تصویریں ہیں اور تصویر اسلام میں ناجائز ہے۔ سرکاری فارم پر تصویر لگانا بھی شریعت کے خلاف ہے۔ اسلام میں تصویر کی اجازت نہیں۔ یہ سب امریکہ والوں کی چال ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسلام کی بنیاد کو کمزور کرتا جا رہا ہے۔ بے پردگی، فحاشی، بے حیائی

اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اس نے پوری دنیا کو لہولعب کا غلام بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف تو............''

''سمجھ گیا سمجھ گیا۔ تقریر کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاوید نے کہا۔ جب تک محترمہ چائے لے کر آ گئیں۔ گفتگو منقطع ہو گئی۔

اس روز کالج میں چھٹی تھی۔ جاوید اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ناول پڑھ رہا تھا۔ اس کے پاس اردو کے مختلف رسالے بکھرے پڑے تھے۔ مولانا نہیں تھے۔ فیض اللہ کہیں سے ٹہل کر آئے۔ اپنے کمرے میں گئے دیکھا کوئی نہیں ہے۔ خود سے کہا لگتا ہے کوئی نہیں ہے۔ کہاں گئے یہ لوگ۔ جاوید نے آواز دی میں اپنے کمرے میں ہوں۔ فیض اللہ وہیں آ گئے۔ دیکھا اردو رسالے جاوید کے فرشی بستر پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک رسالہ اٹھایا۔ صفحہ الٹنے لگے۔ ایک صفحہ پر رک گئے۔ کوئی کہانی تھی۔ پڑھنے لگے۔ پہلا جملہ تھا۔ اس دن اتوار تھا.....نہیں.....سوموار تھا۔ بھئی اسلیئے یہ ادب میرے پلے نہیں پڑتا۔ جاوید نے کہا جناب کوئی شخص بیتی باتوں کو یاد کرتا ہے تو صاف صاف سب کچھ یاد نہیں آتا ہے ایسے لمحے کو یاد کرنا کہتے ہیں۔ آدمی کو واقعہ یاد رہتا ہے لیکن دن تاریخ پوری طرح یاد نہیں رہتے کبھی کبھی بالکل ہی یاد نہیں رہتا۔

''تب تو یہ ادب مشکل سبجکٹ ہے۔'' فیض اللہ نے کہا۔

''ہاں آپ کے پلّے نہیں پڑیگا۔ آپ سائنس پڑھئے اور سمجھ کر پڑھئے۔ آپ کے لئے وہی کافی ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''ہاں ہم لوگ خیالوں میں نہیں رہتے حقیقی دنیا میں رہتے ہیں۔'' فیض اللہ نے کہا۔

''ہاں سہی ہے تب ہی تو آجتک نیوٹن کے وہی تین فارمولے پڑھاتے بلکہ رٹاتے رہتے ہیں اور وہ بھی مغربی سائنسدانوں کا دیا ہوا۔ چوتھا قانون ڈھونڈنا آپ لوگوں کا بھی کام ہے نہ کہ وہ بھی انھیں سے تلاش کروائیں گے۔ یہی آپ کی سائنس ہے سب کی سب غیروں کی بخشندہ دہندہ۔ یہ بھی ہمارے پلّے نہیں پڑتی۔ ادب کو آپ خیال کہتے ہیں

جبکہ یہاں ہر شعر میں ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اور ہر کہانی میں زندگی کا نیا رخ ہوتا ہے۔ ادب سے زیادہ نوع بہ نوع خیالات آپ کو کہاں ملیں گے؟''

''اچھا رہنے دیجئے اپنا ادب اور اپنی سائنس۔ مجھے ایک جگہ جانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے فیض اللہ کہیں چلے گئے۔

کب لوٹے معلوم نہیں۔ رات نو بجے فیض اللہ کے کمرے سے روشنی آرہی تھی۔ وہ نہایت یکسوئی سے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔

''لگتا ہے سائنس کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔'' جاوید نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''دکھایئے لگتا ہے آج ہی خریدا ہے۔ یہی خریدنے گئے تھے۔ دکھایئے۔''

فیض اللہ دکھانا نہیں چاہتے تھے لیکن جاوید نے ضد کرکے ہاتھوں سے کتاب چھین لی۔ دیکھا تو وہ ایک انگریزی ناول تھا جو سیکس کی فینٹسی سے بھرا تھا۔ نینسی فرائیڈے کی کتاب تھی۔

جاوید نے کہا ''تو یہ آپ کو سمجھ میں آرہی ہے اس لیے اتنے دھیان سے اس کا مطالعہ کیا جارہا ہے۔''

فیض اللہ شرمائے، لجائے اور مسکرائے لیکن کچھ بول نہ سکے۔

پروفیسر فیض اللہ عجوبۂ روزگار نکلے۔ ان کی حرکتیں عجیب وغریب ہوا کرتیں۔ ایکدن جب وہ فلیٹ پر آئے تو لونا کے ساتھ تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے سکنڈ ہینڈ لونا انھیں مل گیا۔ کہنے لگے یہ روز روز رکشہ کرو۔ نہ ملے تو پیدل جاؤ۔ تنگ آگیا تھا۔ یہ سستے میں مل گئی میں نے لے لیا۔ اب اس سے جب چاہو کہیں بھی جاسکتے ہیں۔ جاوید نے کہا اچھا ہے آپ نے ٹھیک کیا۔ یہ پوری طرح تندرست تو ہے کیونکہ سکینڈ ہینڈ گاڑی بہت جھیلواتی ہے۔ فیض اللہ نے بتایا نہیں نہیں ابھی تو میں چلا کر آیا ہوں۔ کوئی شکایت نہیں ہے۔ تمام اعضاء درست ہیں۔

اگلے دن فیض اللہ جاوید اور مولانا سے پہلے نکلے۔ جاوید نے پوچھا اجی اب کیا

ہے آپ کے پاس لونا ہے ہم لوگوں سے بعد میں بھی چلے تو پہلے پہنچ جائیں گے۔ بولے ایک ضروری کام ہے۔ آپ لوگ آیئے۔ وہ لونا پر بیٹھ کر چلے گئے۔ جاوید اور مولانا کو رکشا نہیں ملا۔ دونوں پیدل جا رہے تھے۔ آدھے راستہ کے بعد یکھا کہ بیچ سڑک پر پروفیسر فیض اللہ لونا کو بار بار پاؤں مارر ہے تھے۔ جاوید نے کہا یہ آپ سے نخرے کر رہی ہے۔ کل آئی ہے اور آپ کو آنکھ دکھا رہی ہے۔ چھوڑیے مت اپنے پاؤں ہاتھ دکھا دیجئے۔ یہ کہتے ہوئے جاوید اور مولانا آگے بڑھ گئے۔ فیض اللہ ایک گھنٹہ دیر سے کالج پہنچے۔

جاوید نے پوچھا۔ ''بی بی لونا کے رہتے ہوئے ایک گھنٹہ دیر اور وہ بھی ان کی آمد کے دوسرے دن؟''

فیض اللہ بولے'' ہاں لاکھ لات مارنے پر بھی اسٹارٹ نہ ہوئی تو ایک مستری کے پاس لے گیا۔ اس نے بتایا اس میں ایک سے زیادہ خرابی ہے۔ یہیں چھوڑ جایئے۔ کل لے جایئے گا۔ اس لیے کالج آنے میں تاخیر ہوگئی۔''

دوسرے دن جب لونا لانے گئے تو مستری نے ایک لمبا بل انھیں پکڑایا اور کہا اس میں کئی پارٹ کو بدلنا پڑا اور اس لونا کو خریدنے کے لئے کس نے آپ سے کہا تھا؟

''کیوں؟ اس میں کیا کمی ہے؟'' فیض اللہ نے کہا۔

مستری نے بتایا۔ ''اجی پروفیسر صاحب کوئی ایک ہو تو بتائیں۔ ٹائر کے علاوہ تمام پارٹس قابل انتقال ہیں۔ کسی نے آپ کو زبردست ٹھگا ہے۔''

فیض اللہ نے کہا۔ ''رہنے دو رہنے دو۔ یہ لو اپنے پیسے۔ کک لگائی۔ فلیٹ آگئے۔''

پھر ایسا ہوا کہ ہر دوسرے تیسرے دن بی بی لونا ان سے اپنا علاج کروانے لگی۔ پروفیسر فیض اللہ عاجز آگئے۔ اکثر کسی نہ کسی سڑک پر لونا کو لات مارتے نظر آتے یا کھینچ کر لاتے دکھائی دیتے۔ لونا چلاتے ہوئے ان کی ہیئت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ وہ مسلسل دائیں بائیں الو کیطرح دیکھتے رہتے تھے۔ جسے دیکھتے بھرپور اور اطمینان سے۔ انھیں خیال نہیں رہتا کہ گاڑی آگے جا رہی ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں دائیں بائیں۔ اس

دیکھنے میں وہ بھول جاتے تھے کہ کون ان کے پیچھے ہے اور کون آگے۔ ایک دفعہ ایسی ہی بے خیالی میں وہ ڈرائیو کر رہے تھے۔ پیچھے سے سرکاری بس ہارن دے رہی تھی لیکن انھیں کچھ نہیں سنائی دے رہا تھا۔ بس ڈرائیور تھک گیا۔ اس نے غصے میں بس کے بمپ کو لونا کے پچھلے مڈگارڈ میں بھڑا دیا۔ لگتے ہی فیض اللہ چونکے۔ بیدار ہوئے اور کنارے ہوئے۔ کبھی کبھی تو یہ ہوا کہ پیچھے سے آتی بس کے ہارن دینے پر بھی جب انھوں نے سائڈ نہیں دیا تو قریب کی پولیس چوکی کی پولیس کو مداخلت کرنا پڑی۔ پولیس نے کئی ڈنڈے لونا کی دم پر لگائے تو فیض اللہ گھبرا کر اپنے سہی مقام پر آگئے۔ کئی بار غلط پارکنگ کی بنا انھیں جرمانہ بھرنا پڑا۔ پارکنگ کے وقت وہ کبھی بھی آس پاس کے بورڈ کو نہیں دیکھتے تھے۔ جہاں بھی خالی جگہ دیکھی لونا کھڑی کر دی۔ ایک دفعہ غلط پارکنگ کی وجہ پولیس لونا کو اٹھا رہی تھی کہ یہ دوڑتے آگئے اور کہا گاڑی مت اٹھاؤ۔

''کیوں نہ اٹھاؤں۔ غلط پارکنگ کی سزا یہی ہے۔''

''میں پروفیسر ہوں۔ گاڑی مت اٹھاؤ۔''

''اچھا تم پروفیسر ہے۔ تم کو یہاں پر بورڈ نہیں دکھتا۔ تم بچے کو کیا پڑھاتا ہوگا۔ پتہ چل رہا ہے۔ اب تم ڈبل فائن بھروائے سی آفس میں آکر۔ پروفیسر ہے۔ پڑھ لکھ کر قانون توڑتا ہے۔''

وہ لونا لے گئے۔ فیض اللہ کو ان کے آفس جا کر جرمانہ دینا پڑا تب گاڑی ملی۔ جب جرمانہ دیتے دیتے اور علاج کراتے کراتے تھک گئے تو جان ہار کر اسے بڑی خوشامد کے بعد ایک مستری کے ہاتھوں اونے پونے داموں فروخت کر دیا۔ اور جاوید اور مولانا کے سامنے قسم کھائی کہ زندگی میں کبھی وہ سیکنڈ ہینڈ لونا نہیں خریدیں گے۔ اس سبق آموز واقعہ کے بعد تینوں پھر سے رکشا میں کالج جانے لگے۔

وہ شام بڑی خوشگوار تھی۔ جاوید فیض اللہ اور مولانا تینوں مارکیٹ میں فٹ پاتھ پر ٹہل رہے تھے۔ مارکیٹ میں بڑی رونق تھی۔ خوبصورت چہرے جب ماڈرن لباس میں نظر

آتے تو تینوں اپنی اپنی آنکھوں کو سینکنے لگتے۔ اس بازار میں ٹہلنے کا پہلا مقصد یہی ہوتا تھا۔

کبھی کبھی اس عینی مشاہدے کے بیچ اذان ہو جاتی۔ مولانا فرماتے میں ذرا نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ آپ لوگ ادھر ہی رہیے گا۔ فٹ پاتھ پر ایک آدمی چھولے بیچ رہا تھا۔ تین روپیہ تین روپیہ آواز دے کر۔ چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں تین تین روپے کے چھولے تقسیم کرر کھے تھے۔ فیض اللہ وہاں پر گئے۔ چھولے فروش نے ایک کٹوری پیش کی۔ فیض اللہ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا ساٹھ پیسے کے چھولے دو۔ اس نے کہا تین روپے کی کٹوری ہے۔ فیض اللہ نے پھر کہا مجھے تین روپے کے نہیں چاہئے تم ساٹھ پیسے کے دو۔ اس نے کہا نہیں اس نے کہا دو۔ آخر کار مولانا نے فیض اللہ سے کہا کہ وہ کٹوری تین روپے میں بیچے گا آپ کو اپنی ضد کیوں ہے۔ ساٹھ پیسے میں کچھ اور لے لیجئے چاکلیٹ مل جائے گی۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ آگے بڑھ گئے۔ چٹ پٹ والے سے ساٹھ پیسے کا چٹ پٹ لیا اور کھانے لگے۔ سامنے سے اس کے شعبہ کی پروفیسر آسیہ آ رہی تھیں۔

فیض اللہ نے کہا ''آسیہ چٹ پٹ کھاؤ۔''

''نہیں سر شکریہ۔'' آسیہ نے جواب دیا۔

''نہیں کھاؤ نا کھانے میں کیا ہے۔''

''نہیں نہیں آپ کھایئے۔''

فیض اللہ نے زور دے کر۔ نہیں کھاؤ نا کھانے میں کیا ہے۔ لو تھوڑا سا لو۔

آسیہ کے چہرے پر تناؤ آ گیا۔ جیسے وہ فیض اللہ کو سخت سست سنائے گی۔ جاوید نے آسیہ سے کہا۔ میڈم آپ جائیے۔ یہ آج سب کو پتہ نہیں کس بات پر چنا زور گرم کھلا رہے ہیں۔ میڈم چلی گئیں۔

جاوید کی جان میں جان آئی۔ فیض اللہ سے کہا۔ ''آپ لیڈیز سے اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں؟''

فیض اللہ بولے۔ ''ہاں دیکھئے نا چنا زور کھانے میں اس کا کیا ہو جاتا۔''

''اس کا کچھ نہیں ہوتا آپ کا بہت کچھ ہو جاتا۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ نے کیا سمجھا وہ آپ کے سبجکٹ کی ہے تو آپ اسے کچھ بھی بھرے بازار میں کہیں پر کھلا دیں گے اور وہ کھا لے گی۔ آپ نے اس کا بدلتا تیور نہیں دیکھا۔ بچ گئے۔ آئندہ اس طرح خاتون کے ساتھ بے تکلفی مت برتیئے۔ آخر آپ پروفیسر ہیں۔ لونڈوں کی حرکات کرنے لگتے ہیں۔''فیض اللہ شرمائے لجائے مسکرائے اور آگے چلنے لگے۔

جاوید فیض اللہ اور مولانا تینوں فلیٹ میں اپنے اپنے بستر پر لیٹے شہروں میں فلیٹ کی زندگی پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ جاوید نے کہا اب ہر شہر میں فلیٹ سسٹم شروع ہو گیا ہے۔ پہلے یہ سسٹم بڑے شہروں تک محدود تھا۔ چھوٹے شہروں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ فلیٹ شہر کے اندر مل جاتا ہے جہاں سے سب کچھ قریب ہوتا ہے۔ نوکری کی جگہ بازار، اسکول، ہسپتال وغیرہ۔ زمین لے کر کوئی مکان بنانا چاہتا ہے تو اس کے لئے پلاٹ شہر سے باہر بیس تیس کیلومیٹر کی دوری پر ملتا ہے جہاں کسی قسم کی سہولت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں فلیٹ کلچر عام ہوتا جا رہا ہے اور فلیٹ کا خریدنا بہتر سمجھا جاتا ہے۔

مولانا نے کہا۔''فیض اللہ صاحب یہ آپ اپنی کتابوں کو اپنے بستر سے دور دور یہاں وہاں اور میرے بستر کے قریب کیوں رکھتے ہیں۔ کسی ایک جگہ رکھئے۔''

''تو کہاں رکھوں۔ اتنے چھوٹے کمرے میں دو آدمی کا کون کون سامان رکھا جا سکتا ہے۔''فیض اللہ نے تناؤ میں کہا۔

جاوید نے کہا۔''فیض اللہ صاحب ایک تین شیلف کا لکڑی کا بک ریک (BOOK RACK) لے لیجئے۔ آپ کی ساری کتابیں اس میں آجائیں گی۔''

''کہاں ملے گا اور کتنے میں؟''

''یہیں قریب کے مارکیٹ میں پانچ سو میں آجائیگا۔''

فیض اللہ اچانک بستر سے اٹھے۔ جاوید اور مولانا کے سامنے لباس تبدیل کیا اور

دروازے کی طرف جانے لگے۔

''ارے اتنی دھوپ میں، دو بج رہے ہیں کہاں جارہے ہیں؟'' جاوید نے کہا۔

''ریک دیکھنے جارہا ہوں۔''

''چلے جایئے گا۔شام میں ہم سب لوگ جائیں گے۔ابھی تو شاید دکان بھی بند ہوگی۔''

''نہیں مجھے ابھی لینا ہے۔آپ لوگ بیٹھیے میں دیکھکر آتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے۔وہ دروازے سے باہر چلے گئے۔مولانا اور جاوید ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

دیکھیے اس شخص کو۔یہ کوئی وقت ہے باہر جانے کا۔تب ہی تو میں اسے ڈھیلا دماغ کہتا ہوں۔اس وقت لوگ باہر سے گھر آتے ہیں۔یہ باہر گیا ہے۔لاحول ولاقوۃ۔ مولانا نے کہا۔

جاوید نے کہا۔''جانے دیجیے۔دیکھیے گا ایک گھنٹہ میں تھکا ماندہ پسینہ پسینہ واپس آئیگا۔دکان بند ہوگی۔وہ سڑک پر ہر چلنے والے آدمی سے پوچھے گا دکان کب کھلے گی۔ پوچھتے پوچھتے خود ہی تھک جائے گا اور لوٹ آئے گا۔''

مولانا اور جاوید ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔جاوید نے کہا چلئے اب تھوڑ آرام کر لیتے ہیں شام میں بازار کی طرف چلیں گے۔اسی وقت دھڑام سے دروازہ کھلا۔فیض اللہ پسینہ میں شرابور، اندر آئے، پنکھے کے ریگولیٹر کو فل اسپیڈ کیا اور اسی لباس میں اپنے بستر پر اوہ کرتے ہوئے دراز ہوگئے۔جاوید اور مولانا ششدر۔

جاوید نے کہا۔''آپ کا ریک کہاں ہے۔لیا نہیں؟''

فیض اللہ چپ کوئی آواز نہیں۔

جاوید نے پھر پوچھا۔''کیا ہوا۔خاموش کیوں ہیں۔ریک پسند نہیں آیا؟''

فیض اللہ نے کہا۔''خواہ مخواہ پریشان ہوگیا۔دکان بند تھی۔پورے مارکیٹ میں

ادھر سے ادھر گیا کوئی دکان کھلی نہیں تھی۔‘‘

جاوید اور مولانا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں مسکرائے۔ بھئی مجھے نیند آرہی ہے۔ یہ کہتے ہوئے جاوید اپنے کمرے میں آرام کرنے چلا گیا۔

فیض اللہ، مولانا اور جاوید جس ہاؤسنگ سوسائٹی میں مقیم تھے۔ وہ اس علاقے کی پہلی رہائشی سوسائٹی تھی۔ اس میں ننانوے فی صد امیر کبیر لوگ رہتے تھے۔ زیادہ تر فلیٹ اونر، تعلیم یافتہ، اچھی ملازمت اور بڑی تجارت سے وابستہ تھے۔

ان کے بچے مہنگے انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ ایک پوش اور ماڈرن سوسائٹی تھی۔ لڑکیاں جدید طرز کا لباس پہنتی تھیں۔ لڑکے لڑکیاں دونوں کا عام لباس جینز اور ٹی شرٹ تھی۔ سوسائٹی کے درمیان میں بیضوی شکل (OVAL SHAPE) کا ایک باغیچہ تھا جس میں مختلف رنگ کے پھولوں کے پودے تھے۔ اس باغیچہ کے چاروں طرف دس میٹر چوڑا بیضوی ورکنگ پلازا بنا تھا۔ اور اس کے باہر چاروں طرف سوسائٹی کی عمارتیں کھڑی تھیں۔ گویا باغیچہ سوسائٹی کا مرکزی مقام تھا۔

رات میں آٹھ بجے کے بعد سوسائٹی کے بڑے بوڑھے بچے اور جوان لڑکے لڑکیاں باغیچہ کے چاروں طرف ورکنگ پلازا میں چہل قدمی (واکنگ) کرتے تھے۔ تین تین، چار چار یا پانچ پانچ کا جھنڈ آپس میں باتیں کرتا ہوا چلتا رہتا۔ یہ قافلہ رات کے گیارہ بجے تک چلتا رہتا۔ کچھ لوگ ادھر ادھر اپنی اپنی بلڈنگ کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے اس خوبصورت ٹولی کو دیکھتے رہتے۔

فیض اللہ نے جاوید اور مولانا سے کہا۔ ’’آیئے ہم لوگ بھی واکنگ پلازا میں چکر لگائیں گے۔ جاوید اور مولانا کو بحیثیت پروفیسر ان لڑکے لڑکیوں کی ٹولی کے ساتھ واکنگ کرنا عجیب سا لگا۔ اس لئے انکار کر دیا۔ فیض اللہ نے کہا تو میں اکیلے ہی چلونگا۔ آپ لوگوں کو شرم آتی ہے تو جایئے۔ دونوں فلیٹ میں چلے آئے۔ فیض اللہ بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ رات کے گیارہ بجے فلیٹ میں آئے۔ اب ان کا روز کا یہ معمول ہو گیا۔ رات کا کھانا کھاتے

اور بھیڑ میں کھو جاتے۔

ایک رات مولانا اور جاوید سوسائٹی کے باہر سے ٹہل کر آرہے تھے۔ واکنگ پلازا کے پاس آئے۔ دیکھا بھیڑ چل رہی ہے مگر فیض اللہ غیر حاضر۔ کہاں گئے۔ وہ کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ آج کہاں چلے گئے۔ دونوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ واکنگ پلازا کے قریب کی دو بلڈنگ کے درمیان چھوٹے سے قطعہ زمین میں دس بارہ چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ درختوں کے بیچ میں گھاس تھی۔ اگر کوئی شخص اس گھاس پر بیٹھ جاتا تو رات میں بجلی کی روشنی میں بھی اسے آسانی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ جاوید اور مولانا نے ایک بار پھر بھیڑ کو غور سے دیکھا مگر فیض اللہ ندارد۔ ہو سکتا ہے کہیں اور چلے گئے ہوں۔ جب دونوں اپنی بلڈنگ کی طرف مڑ رہے تھے تو مولانا کی نظر ان چھوٹے چھوٹے درختوں کی طرف گئی۔ دیکھا گھاس پر کوئی گول چھجے والی کیپ لگائے بیٹھا ٹولیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ مولانا نے جاوید سے کہا اس گھاس پر کیپ میں کون بیٹھا ہے۔ جاوید نے غور سے دیکھا اور کہا کون ہے وہی اپنا شکاری ہے۔ بیٹھا بیٹھا بھیڑ میں شکار ڈھونڈ رہا ہے۔ مولانا نے کہا اس لیے تو یہ جنسی ناول پڑھتا رہتا ہے۔ دیکھئے کس طرح احمقوں کی طرح جھاڑیوں میں تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ جاوید نے کہا اس وقت وہ اعتکاف میں ہیں نہیں آئیں گے۔ چلیے۔

گیارہ بجے فیض اللہ فلیٹ میں آئے۔

''کہئے کہاں سے تشریف آرہی ہے؟'' جاوید نے پوچھا۔ فاضل چونکے کہیں ان لوگوں نے دیکھ تو نہیں لیا۔

''ایسے ہی ادھر ادھر سے آرہا ہوں۔'' فیض اللہ نے کہا

''ادھر ادھر سے نہیں کہئے جھاڑیوں میں سے آرہے ہیں۔'' مولانا نے طنز کیا۔

فیض اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں نے کیسے دیکھ لیا۔''

''جناب ہم اڑتی چڑیا کے پنکھ شمار کر لیتے ہیں آپ ہیں کس فردوس خیال میں۔ خیر کوشش کرتے رہئے۔ محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''کہیں پھل کڑوا نہ مل جائے۔'' مولانا نے پھر چوٹ کی۔

سب مسکراتے ہوئے اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔

ان دنوں ریلوے کا رزرویشن دو مہینے پہلے ہوا کرتا تھا۔ برتھ رزرویشن کے لئے اسٹیشن پر کمپیوٹر نہیں آیا تھا۔ کلرک ہاتھ سے لکھکر رزرویشن ٹکٹ دیتا تھا۔ چھوٹے سے ٹکٹ کی پشت پر برتھ نمبر ٹرین نمبر اور تاریخ قلم سے لکھا ہوتا تھا۔ دو مہینے ایڈوانس کے حساب سے دن گن کر لوگ اسٹیشن جاتے تھے۔ ورنہ ایکدن لیٹ ہونے پر بھی رزرویشن ختم ہو جاتا تھا۔

مسافر رزرویشن لائن میں کھڑے ہونے کے لئے صبح اندھیرے ہی اسٹیشن پہنچ جاتے تھے۔ دس بجے کھڑکی کھلتی تھی۔ چار بجے شام تک اس مسافر کا نمبر آتا تھا۔ جو تیس چالیس آدمی کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ جتنا سویرے جاؤ بیس تیس آدمی لائن میں کھڑے نظر آتے تھے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے جو سب سے پہلے قطار میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو رات میں رزرویشن آفس کے باہر سو جاتے تھے۔ صبح جیسے ہی آفس کا گیٹ کھلتا دوڑ کر سب سے آگے کھڑے ہو جاتے۔ چھ گھنٹے مسلسل کھڑا رہنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کبھی کبھی چھ گھنٹے کھڑے ہونے کے بعد جیسے ہی اس مسافر کا نمبر آتا اور وہ ٹکٹ کے لئے کھڑکی میں ہاتھ ڈالتا تو کھڑکی بند کر دی جاتی یعنی چھ بج گیا رزرویشن ٹائم ختم۔

جاوید اور فیض اللہ صبح آٹھ بجے اسٹیشن پہنچے تو دیکھا کہ لائن تو پوری طرح تیار ہے۔ اتنا پیچھے کھڑے ہونے پر رزرویشن شاید ہی ملے۔ پھر بھی دونوں لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ایک ایک مسافر پر بیس منٹ لگ جاتے تھے۔ لائن میں کھڑے کھڑے تین گھنٹے سے اوپر ہو گئے تھے۔ ٹانگوں میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ جاوید کے آگے دس مسافر اور تھے۔

فیض اللہ نے جاوید سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب میں اس قطار سے نکل رہا ہوں۔''

''کیوں تین گھنٹے سے کھڑے ہیں تھوڑی دیر اور رک جایئے۔'' جاوید نے کہا۔

''تھوڑی دیر اور رکے تو میری سانس رک جائیگی۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔''

''میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ میں لائن سے نکل رہا ہوں۔کل آؤنگا۔ کل اور سویرے آونگا تاکہ آدھا گھنٹہ میں اپنا کام ہوجائے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہوسکتا ہے کل اور زیادہ مسافر ہوں اور زیادہ دیر کھڑا ہونا بھی پڑے۔''

جاوید نے بہت روکا لیکن فیض اللہ چلے گئے۔چار بجے شام میں جاوید کو رزرویشن ٹکٹ ملا۔فیض اللہ دوسرے دن پھر اسٹیشن پہنچے۔آج بھیڑ کل سے بھی زیادہ تھی۔ بھیڑ کو دیکھکر واپس آگئے۔ایک ٹکٹ ایجنٹ سے بات کی۔ٹکٹ کے برابر کمیشن دے کر اس سے رزرویشن کروایا۔

فیض اللہ ہفتہ دو ہفتہ میں کوئی نہ کوئی عمل ایسا کرتے تھے جسے دیکھ کر روم پارٹنر چونک پڑتے تھے۔فیض اللہ کے بستر پر فیزکس کے بجائے پرائمری سطح کی کچھ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔مراٹھی، تیلگو، کنڑ، ملیالم اور فارسی کی۔

جاوید نے پوچھا۔''پروفیسر صاحب آپ نے کب سے فیزکس چھوڑ کر جنوبی ہندوستان کی زبانیں پڑھنا شروع کر دی ہیں۔''

''بس ایسے ہی میرا شوق ہے ان زبانوں کو سیکھنے کا۔'' فیض اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ بہ یک وقت پانچ زبانیں آپ ایک ساتھ کیسے سیکھ لیں گے اور وہ بھی بغیر استاد کے؟''

''اس میں کچھ مشکل نہیں ہے۔دو مہینے کے بعد میں آپ کو یہ ساری زبانیں بول کر اور پڑھ کر بتاؤنگا۔''

''خدا کرے وہ دن جلد آئے تب تو آپ ماہر لسانیات ہوجائیں گے۔واہ کیا ذہن ہے آپ کا۔''

فیض اللہ اس طرح خوش ہوئے جیسے یہ زبان سیکھنا بچوں کا کھیل ہے۔

جاوید نے پوچھا۔ ''یہ فرانسیسی اور جرمن لغت کیوں لائے ہیں۔لگتا ہے آپ فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی جانتے ہیں۔بھئی آپ تو چھپے رستم نکلے۔''

''یہ دونوں زبان جانتا تو نہیں ہوں مگر انھیں بھی جلد سیکھ لونگا۔کوئی مشکل نہیں ہے۔''

''ماشاءاللہ ملکی غیر ملکی زبانیں ایک ساتھ تمام سیکھنا واقعی آپ کی ذہانت وفطانت کا جواب نہیں۔''

فیض اللہ مسکرائے اور خوش ہوئے۔

فیض اللہ انگریزی اردو اور ہندی جانتے تھے۔ملکی اور غیر ملکی سات زبانیں سیکھ رہے تھے۔لیکن کالج میں انھیں تھیوری کی کلاس نہیں دی گئی تھی۔ان کے صدر شعبہ نے اس کی وجہ بتایا کہ وہ کلاس میں انگریزی میں جو کچھ بتاتے ہیں۔وہ طلباء کی سمجھ میں نہیں آتا۔اس لیے تھیوری کی جگہ صرف پریکٹیکل دی گئی ہے۔

جاوید نے پوچھا۔''یہ کب تک چلے گا۔کیا وہ ہمیشہ پریکٹیکل ہی کراتے رہیں گے۔''

صدر شعبہ نے کہا۔''ہاں جب تک وہ اس لائق نہ ہو جائیں کہ طلباء ان کی انگریزی سمجھ لیں وہ صرف پریکٹیکل ہی کراتے رہیں گے۔''

فیض اللہ کی عجیب وغریب حرکتوں سے فلیٹ پارٹنر جیسے جیسے واقف ہو رہے تھے ویسے ہی تنگ بھی ہوتے جا رہے تھے۔ان کی حرکتوں کو مولانا زیادہ جھیلتے تھے کیونکہ وہ ان کے روم پارٹنر تھے۔دونوں کمروں کے درمیان باتھ روم اور پانچ میٹر لمبی راہ داری تھی گویا دونوں کمرے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھے۔جاوید ایک کمرے میں تنہا رہتا تھا اس لئے فیض اللہ کی ہرنا گہانی آفت سے محفوظ تھا۔مولانا سے فیض اللہ کی شب وروز کی صحبت تھی۔دونوں کے فرشی بستر میں ایک میٹر کا فرق تھا۔فیض اللہ اکثر دیر رات آتے اور بغیر لباس تبدیل کئے سو جاتے تھے چاہے جیکٹ ہو یا جینز۔کبھی کبھی تو جوتا اتارنا بھی بھول جاتے تھے۔ان کی جیکٹ بھی خوب تھی۔رات میں جب وہ کروٹ بدلتے تھے تو جیکٹ چر چر بولتی تھی اور مولانا کی نیند ٹوٹ جاتی تھی۔وہ کہتے ارے جیکٹ تو بدل لیجئے لیکن فیض اللہ دنیا و

مافیہا سے بے خبر سوتے رہتے۔صبح میں ان سے بتایا جاتا ارے آپ کی جیکٹ رات میں بولتی ہے۔وہ مسکراتے ہوئے کہتے ایسا کیا میں نے تو نہیں سنا۔اب ان کو کیا کہا جائے جب وہ مولانا کی بانگ نہیں سن پاتے تھے تو اپنی جیکٹ کی چرچوں بھلا کیسے سن پاتے۔تنگ آکر مولانا نے بھی کہنا چھوڑ دیا۔اور جب جب فیض اللہ بغیر لباس تبدیل کئے سوجاتے مولانا ایک بڑے رومال سے اپنے سر کو باندھ لیتے جس میں دونوں کان چھپ جاتے۔

فلیٹ کی چابی تینوں کے پاس تھی۔ایکدن جاوید اکیلے ہی فلیٹ پہنچا۔اس نے دیکھا کہ دروازے میں لوہے کا وہ دائرہ جس میں تالا لگاتے ہیں اکھاڑ دیا گیا ہے اوراس کی جگہ دوسرا دائرہ لگا ہوا ہے۔پتہ چلا یہ حرکت فیض اللہ کی ہے۔

جاوید نے پوچھا۔''آپ نے دروازے کی فٹنگ توڑی ہے؟''

''ہاں میری چابی کھوگئی۔ضروری سامان فلیٹ میں سے لینا تھا۔اس لیے کارپینٹر کو بلا کر میں نے تڑوادیا اوراس کی جگہ دوسرا دائرہ لگوادیا ہے۔''

اسی طرح پھر ایکدن کالج سے واپس آنے پر مولانا نے دیکھا کہ دروازے میں دوسرا تالا لگا ہوا ہے۔اس کی چابی ان کے پاس نہیں تھی۔ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دوسرا تالا کس نے لگایا ہے۔تھوڑی دیر بعد فیض اللہ آئے۔انھوں نے تالا کھولا۔

مولانا نے پوچھا۔''پہلے کا تالا کہاں گیا؟''

''وہ میں نے توڑ دیا۔''فیض اللہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''میری چابی کھوگئی تھی اس لیے توڑنا پڑا۔یہ لیجئے نئے تالا کی چابی۔''

''آپ نے تالا کو کیوں توڑا۔ہم لوگوں کے پاس چابی تھی۔تھوڑی دیر انتظار کرلیتے۔''

''دراصل مجھے ایک ضروری ڈکومنٹ کمرے سے لینا تھا اس لیے ایسا کرنا پڑا۔ اور دروازے کی فٹنگ (تالا جس دائرے میں لگاتے ہیں) کو اس لیے نہیں توڑا کیونکہ اسے

ایک بار پہلے توڑا جا چکا ہے۔ دوسری فٹنگ کرنا ممکن نہ تھا۔''

مولانا نے کہا۔''واہ آپ نے بڑا خیال رکھا۔ ایک بار فٹنگ کو توڑا۔ دوسری بار تالا کو۔ اب آگے کیا ارادہ ہے۔''

''آگے تو دروازہ ہی بچتا ہے۔'' جاوید نے کہا۔

فیض اللہ نے ہونٹ ہٹا کر دانت دکھائے، مسکرائے مگر کچھ بولے نہیں۔

ایک بار پھر فیض اللہ کی چابی کھوگئی۔ لیکن اس بار انھوں نے کچھ توڑا نہیں بلکہ چابی بنانے والے کو بلا لائے۔ اس نے مختلف چابیوں سے ٹسٹ کے بعد ایک سہی چابی بنادی۔ پتہ نہیں انھوں نے یہ عقلمندی پہلے کیوں نہیں کی۔ دراصل ان کا دماغ سہی وقت پر سہی کام کم ہی کرتا تھا۔

کالج سے واپسی کے بعد جاوید اور مولانا نے خالہ کا پکا ہوا کھانا ایک ساتھ کھایا اور جب کچن سے باہر اپنے کمرے میں آئے تو دیکھا کہ فیض اللہ چیون پراش چمچ سے کھا رہے ہیں۔

مولانا نے پوچھا۔''یہ کیا ہے کسی وید جی نے مشورہ دیا ہے کیا؟''

''آپ کو مطلب میں کچھ بھی کھاؤں۔'' فیض اللہ نے جواب دیا۔

''شاید دماغی طاقت بڑھانے کے لئے کھا رہے ہیں کیوں؟'' جاوید نے پوچھا۔

فیض اللہ مسکرائے اور چپ رہے۔ وہ منہ کھول کر قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔ شاید ایسا کرنے سے انکا اوپری ہونٹ جو بیچ سے پھٹا تھا برا نظر آتا یا دانت کھولکر مسکرانا ہی ان کی عادت ہو۔ خدا معلوم۔

چیون پراش کے دوسرے دن سرخ سرخ چیری کھاتے نظر آئے۔ گلاس چیری سے بھرا تھا۔ اس میں سے ہاتھوں سے نکال نکال کر کھا رہے تھے۔ بلکہ زبردستی کھا رہے تھے۔

''بھئی جب طبیعت کھانے پر آمادہ نہیں ہے تو کیوں کھا رہے ہیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''ہاں واقعی بے مزہ ہے۔ پتہ نہیں لوگ کیسے کھاتے ہیں۔''

''لیکن آپ کیوں کھا رہے ہیں؟''

''ایسے ہی۔ بازار میں بیچنے والے نے کہا لے جایئے بہت فائدہ مند ہے۔ میں لے آیا۔لیکن اس میں تو بد بو ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ساری چیری کو بالکونی سے دور پھینک دیا۔ جاوید اور مولانا دیکھتے رہے۔ سوچتے رہے نہ جانے آئندہ اب کیا کھانے والے ہیں۔

سہ پہر کی ہلکی نیند آوری کے بعد جب جاوید اور فیض اللہ بیدار ہوئے تو فیض اللہ نے کہا چلئے ایک نئی جگہ چلتے ہیں۔

''کہاں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''آپ پہلے چلئے تو سہی۔''

دونوں تیار ہوئے۔ باہر نکلے۔ جاوید سوچ رہا تھا۔ خدا معلوم اس کی کون سی نئی جگہ ہے۔ کہیں پھر کوئی اوٹ پٹانگ نہ کرے۔ فیض اللہ نے ایک آٹو رکشا کو آواز دی۔ دونوں بیٹھ گئے۔

رکشا والے نے کہا۔ ''کہاں چلیں سر؟''

''سیدھے چلتے رہو۔'' فیض اللہ نے بتایا۔

کچھ دور جانے کے بعد رکشا والے نے پوچھا۔ ''کدھر چلنا ہے سر؟''

''میں نے کہا نا چلتے رہو۔ جگہ آئیگی تو میں بتا دونگا۔''

اب رکشا چوراہے پر آ گیا تھا۔ رکشہ والے نے پوچھا۔ ''چار راستے ہیں کدھر جائیں گے؟''

جہاں جانا تھا اس کا راستہ فیض اللہ کو بھی نہیں معلوم تھا۔ رکشا والے سے کہا۔

''ریس کورس کا راستہ کدھر سے جاتا ہے؟''

''آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ابتک سر دوسرے راستے سے پہنچ گئے ہوتے۔''

''زیادہ بولو مت چلو ریس کورس۔''

جاوید نے پوچھا ''یہ آپ ریس کورس کیوں جا رہے ہیں۔ کیا ریس کھیلنے جا رہے ہیں؟''

''آپ چلئے تو سہی معلوم ہو جائے گا۔''

جاوید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ ریس کورس آ گیا۔ رکشا سے اترے۔ پیسے دیے۔ ٹیڑھے میڑھے راستہ سے آنے سے تین گنا زیادہ کرایہ دینا پڑا۔ آگے بڑھے۔ فیض اللہ نے ایک شخص سے پوچھا ریس کورس کا دفتر کہاں ہے۔ اس نے کہا۔ آپ کے سامنے ہے۔ ایک دفتر میں داخل ہوئے۔ بڑا سا کمرا تھا۔ ادھر ادھر کرسیوں پر ملازمین کام کر رہے تھے۔ ایک شخص سے فیض اللہ نے پوچھا۔

''یہاں گھوڑا کہاں ملتا ہے؟''

اس آدمی نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ فیض اللہ کو غور سے دیکھا۔ چہرے پر شکنیں آئیں اور کہا ''آپ کو گھوڑا کس لئے چاہئے۔ کیا نمبر لگانا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو کیا خریدنا ہے؟''

''نہیں۔''

''آخر کس لئے چاہئے؟''

''دیکھو چلاؤ مت۔ بات کو سمجھو۔ تم کو جتنے پیسے چاہئے دونگا۔ اس کی فکر مت کرو۔''

''ارے بھئی تم کو کیا کام ہے۔ تم کون ہے پہلے یہ بتاؤ۔'' کلرک نے غصے میں کہا۔

''میں، ہم دونوں پروفیسر ہیں بحرالاسلام کالج میں۔''

''فیض اللہ نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دکھایا اور کہا اس کے لئے چاہئے۔''

''کیا مطلب پیٹ کے لئے گھوڑا؟''

''جمناسٹک۔'' فیض اللہ نے کہا۔

''اچھاتم کو جوکی بننا ہے۔''

''نہیں نہیں تم نے سمجھانہیں ۔ پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور کہا اس کو کم کرنے کے لئے۔''

کلرک نے حیرت اور مسکراہٹ کے ساتھ فیض اللہ کے ابھرتے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر کہا''اچھا اس کو کم کرنا ہے۔''

''ہاں۔''فیض اللہ نے کہا۔

''تو تم نے اتنے بڑے ریس گراونڈ کو اور اس کے دفتر کو تو ند کم کرنے کا آفس سمجھ لیا ہے۔تمہارے پاس کچھ بھیجا ہے کہ نہیں ۔تم پڑھا لکھا ہے۔ پروفیسر ہے۔تم کو یہ نہیں معلوم کہ ریس گراونڈ میں گھوڑا دوڑتا ہے۔ یہ گھوڑ دوڑ ہے اور اس کا آفس ہے یا پیٹ کم کرنے کا آفس ۔ یہ آفس اور اتنا بڑا گراونڈ دیکھکر تم کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ادھر اتنی دور دور تک صاحب لوگوں کی کھڑی کار،ادھر لائن سے کھڑے گھوڑے،سامنے کا اتنا بڑا گول میدان اور وہ ہزاروں آدمی یہ دیکھکر بھی تم

کو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہے اور آ گیا خالی پیلی میرا دماغ خراب کرنے کو۔تم ادھر سے نکلتا ہے یا سیکوریٹی کو بلاؤں ۔تم مجھے اور کوئی لگتا ہے ۔ مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔اے تم سچی میں پروفیسر ہے یا کوئی اور ۔ مجھے تو شک ہے۔ مجھے تم کوئی اور لگتا ہے ورنہ پیٹ کم کرنے ادھر کیوں آتا۔''

وہ آدمی سیکوریٹی کو آواز دینے ہی والا تھا کہ جاوید نے اس سے کہا جاوید ابتک کے واقعہ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔اسے ہنسی بھی آرہی تھی ۔ حیرانی بھی اور غصہ بھی۔اسے فیض اللہ کی شکل میں ایک ابنارمل آدمی نظر آرہا تھا۔واقعی یہ شخص جس کا نام فیض اللہ ہے دماغ سے ڈھیلا ہے۔اس نے کلرک سے مودبانہ کہا دیکھئے یہ نا سمجھی میں ادھر آگئے ہیں ۔دراصل انھیں جمینزیم میں جانا تھا۔ہم لوگ جمینزیم ڈھونڈتے ڈھونڈتے ادھر آگئے۔ظاہر ہے یہ ریس گراونڈ ہے یہاں تو گھوڑے دوڑتے ہیں ریسنگ ہوتی ہے۔ بھلا یہاں تو ند کا کیا

علاج۔اس میں ان کی غلطی ہے۔آپ کوخواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔ہم معذرت خواہ ہیں۔آپ کو جمینز یم کا پتہ ہوگا۔اگر نہیں معلوم ہے تو ہم کسی اور سے پوچھ لیتے ہیں۔شکریہ آپ کا۔یہ کہہ کر جاوید نے فیض اللہ کو اشارہ کیا جلدی نکلئے۔کلرک کا پارہ اتنا چڑھ گیا تھا کہ وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔جاوید کو کھٹکا ہوا کہیں اس نے سیکوریٹی کو بلالیا اور دھر لیے گئے تو کل کی تازہ خبر کالج میں یہی ہوگی بحرالاسلام کالج کے دو پروفیسر پولیس کسٹڈی میں۔جاوید جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔تاخیر کرنے سے کلرک دونوں کو نکلنے نہیں دیتا۔وہ اپنی کرسی سے پہلے ہی کھڑا ہو چکا تھا۔جاوید نے اس سے نہایت ہی مہذبانہ انداز میں گفتگو کی۔اپنی ناسمجھی اور غلط فہمی پر اظہار تاسف کیا۔معذرت کی تب جا کر اس کا پارہ تھوڑا نیچے آیا۔پھر بھی اس نے پرشکن چہرے اور نصف غصے میں کہا ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔باہر جاؤ داہنے کی روڈ سیدھی ادھر جاتی ہے۔آگے جا کر پوچھنا جمینز یم مل جائے گا۔''

باہر نکل کر جان میں جان آئی۔جاوید کے تو پسینے آگئے تھے۔اس نے فیض اللہ سے کہا ''یہی سب آپ کرتے ہیں۔تو ند کم کروانے گھوڑا سے اور وہ بھی ریس گراونڈ میں۔آپ کو کچھ سینس ہے کہ نہیں۔پہلے بتانا چاہئے تھا۔سیدھے کہیں بھی پہنچ جاتے ہیں۔سیکوریٹی والے آجاتے تو کیا ہوتا۔سب سننے کے بعد فیض اللہ دانت کھول کر مسکرائے اور کہا ''ناریل پانی پیجئے گا۔''

فلیٹ سے ایک کیلومیٹر کی دوری پر کپڑے کا سیل (SALE) لگا تھا۔ہر کسی کو معلوم تھا یہ سیل ایک مہینہ کے لئے ہے۔مولانا اور جاوید بھی اسے دیکھنے گئے۔جینز،جیکٹ،پتلون اور شرٹ کی مختلف ورائٹیز دیکھی۔قیمت پوچھی۔وہاں جیکٹ اور جینز کی ورائٹیز زیادہ تھیں۔مولانا،جاوید جیکٹ جینز نہیں پہنتے تھے۔مولانا نے کہا جاوید صاحب ان کی قیمت معلوم کر لیتے ہیں فیض اللہ کو بتائیں گے۔وہ تو پہنتے ہیں۔سیلز مین نے بتایا اس کلر میں قیمت دو دو سو ہے۔یعنی دو سو جینز کے اور دو سو جیکٹ کے۔دونوں دیکھ کر اور پوچھ کر آگئے۔شام میں فیض اللہ آئے۔ان کے ہاتھ میں ایک کیری بیگ تھا۔

''لگتا ہے کچھ خریداری ہوئی ہے۔'' جاوید نے پوچھا۔

''ہاں کپڑوں کا سیل لگا ہے۔ بڑے سستے میں جینز اور جیکٹ مل رہی ہے۔ یہ دیکھئے میں نے ایک جینز اور جیکٹ خریدا ہے۔''

جاوید اور مولانا نے دیکھا تو وہی جینز اور وہی جیکٹ تھی جسے دن میں دیکھا تھا۔

''کتنے میں خریدا؟'' جاوید نے پوچھا۔

''جینز ساڑھے تین سو میں اور جیکٹ ساڑھے تین سو میں۔ آپ لوگوں کو خریدنا ہو تو مجھے ساتھ کر لیجئے گا ورنہ ٹھگا جائیں گے۔ مجھے پانچ سو بتا رہا تھا۔ میں نے ساڑھے تین سو کرایا۔ آپ لوگوں کو کم نہیں کرے گا۔''

جاوید اور مولانا ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ مسکراتے رہے۔ فیض اللہ کو دیکھتے رہے۔ مسکراتے رہے۔

فیض اللہ کی کسی پتلون میں دو تین جگہ سلائی ٹوٹ گئی۔ قریب ہی ایک ٹیلر کی دکان تھی۔ ٹیلر سے کہا۔

''الٹریشن کرتے ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں کرتے ہیں۔''

فیض اللہ نے چار جگہ کی ٹوٹی ہوئی سلائی بتائی اور پوچھا ''چار جگہ سلائی کرنی ہے۔ ایک جگہ کا کیا لوگے؟''

اس تفتیش پر ٹیلر کی سمجھ میں آ گیا کہ کسٹمر کتنا عقلمند ہے۔ اس نے کہا ''دیکھئے جناب یہ محنت کا کام ہے۔ آگے پیچھے کی سلائی کو بھی کھولنا ہوگا۔ پھر ایک ساتھ ملا کر سینا ہوگا اور یہ کام چار بار کرنا ہوگا کیونکہ چار جگہ سلائی ٹوٹی ہوئی ہے۔''

''وہ سب مت سناؤ۔ یہ بتاؤ ایک سلائی کا کتنا لوگے؟''

''فی الٹریشن یعنی سلائی پچاس روپے۔''

''ٹھیک ہے۔ چاروں کردو۔''

ٹیلر نے کہا۔ ''کل شام میں آجائیے۔ فیض اللہ وقت پر پہنچ گئے اور دوسو روپے دے کر چار الٹریشن سستے میں کرالائے۔ حالانکہ چاروں الٹریشن کے پچاس روپے بھی زیادہ تھے۔ اس کا ذکر اپنے دونوں روم پارٹنر سے بڑے فخر سے کیا۔

مولانا نے فیض اللہ اور جاوید سے کہا کہ ہمارے دوست نے آج شام ہم سب کو افطار پر بلایا ہے۔ اس لیے آج شام کا افطار ایک ساتھ کریں گے۔ تینوں پروفیسر وقت معینہ پر وہاں پہنچ گئے۔ مولانا کے دوست نے افطار کا انتظام اپنی بساط بھر کیا تھا۔ آٹھ دس قسم کی اشیائے خوردنی دسترخوان پر موجود تھیں۔ فیض اللہ نے ایک پکوان کو منہ میں رکھا۔ ذائقہ اچھا نہیں لگا۔ بازو میں بیٹھے ہوئے میزبان سے فوراً کہا یہ تو ٹھیک نہیں ہے کیسے بنایا ہے آپ لوگوں نے۔ ہمارے یہاں ایسے نہیں بنتا۔ وہاں کا ٹسٹ بھی الگ ہوتا ہے۔ پھر دوسرے پکوان کو چکھا۔ اس کا ذائقہ بھی پسند نہ آیا۔ فوراً کہا ارے یہ بھی پہلے جیسا ہے۔ کیا آپ لوگ پکاتے وقت اسے ٹسٹ نہیں کرتے۔ جاوید نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن وہ اپنی رو میں تھے۔ تیسرے پکوان کو چکھا۔ کہا بھئی میں اب کچھ بھی یہاں پر نہیں کھا سکتا۔

''کیوں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''کسی میں لذت نہیں ہے۔ کھاؤنگا تو قے ہوجائیگی۔''

مولانا ہراساں ہوتے رہے کہ فیض اللہ کو کس طرح چپ کیا جائے۔ اس میں میزبان کی سبکی ہورہی ہے۔ لیکن انہیں کچھ احساس ہی نہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ یونیورسٹی ہوسٹل میں دوستوں کے ساتھ افطار کررہے ہیں۔ یہ کسی اور کا گھر ہے۔ یہاں کا ذائقہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شہر شہر اور علاقے علاقے میں کھانے پینے کا اپنا ٹسٹ ہوتا ہے۔ لیکن وہ بولتے ہی جارہے تھے۔ جاوید بھی فکرمند کہ اسے کیسے روکا جائے۔ آخر جاوید کھڑے ہوگئے اور کہا بھئی میں تو چلا نماز نکل جائیگی۔ فیض اللہ صاحب چل رہے ہیں آپ۔ فیض اللہ اس غیر متوقع دعوت کے لئے تیار نہ تھے۔ پھر بھی کہاں چلئے۔ جاوید انھیں باتوں میں الجھا کر میزبان کے گھر سے باہر نکال لایا۔ باہر آکر جاوید نے ان سے کہا۔

''آپ کو کچھ خیال رہتا ہے یا نہیں؟''

''کیوں کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟ آپ کو یاد نہیں رہتا کہ یہ دوسروں کا گھر ہے اور یہاں کے کھانوں کا ذائقہ الگ ہوتا ہے۔''

''ارے ہاں مجھے یاد نہیں رہا۔ کہیں وہ بُرا تو نہیں مان گئے ہونگے۔ ان سے معذرت کر کے آؤں کیا؟''

''چھوڑیئے اب سب کچھ تو کہہ دیا آپ نے۔ اب معافی مانگیں گے تو وہ اور بھی ورغلا جائیں گے۔ آئندہ خیال رکھئے کس کا گھر ہے کون سا مقام ہے۔''

''ہاں..... ہاں۔''

مولانا نے جس باورچن خالہ کو کھانا پکانے کے لئے رکھا تھا اس میں فیض اللہ نے شیئر نہیں کیا تھا۔ مہینوں سالوں تک ہوٹل میں کھاتے کھاتے تھک گئے۔ معدہ خراب ہو گیا۔ بال کم ہونے لگے۔ کبھی کبھی آنکھوں میں جالا آجاتا۔ فیض اللہ کے خیال میں یہ سب ہوٹل کے کھانے سے ہو رہا ہے۔ جاوید نے کہا ''ہم لوگوں کے ساتھ شامل ہو جایئے۔ وہ اس پر تیار نہ ہوئے۔ کہا کہ ''اگر باورچن کا کھانا کھانا ہوگا تو اپنا باورچی میں الگ رکھونگا جو صرف میرے لئے کھانا پکائے گا۔''

جاوید اور مولانا نے کہا۔ ''بہتر ہے۔ کب بلا رہے ہیں؟'' فیض اللہ نے بتایا کہ آج شام میں بات پکّی ہو جائے گی۔

صبح جاوید نے پوچھا۔ ''آج تو آپ کا باورچی آرہا ہے؟''

فیض اللہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہاں آج کی تاریخ اس کو بتایا ہے۔ پھر اچانک کہا ارے ایک چیز تو اس کو بتانا بھول ہی گیا۔''

''وہ کیا؟'' جاوید نے پوچھا۔

''پتہ تو اسے بتایا ہی نہیں۔''

''واہ.....واہ...کیا معاہدہ ہوا ہے۔ یاد کر لیجئے کچھ اور تو نہیں بھول گئے۔''

سوچتے ہوئے فیض اللہ نے کہا ''نہیں اور سب بتا دیا تھا۔''

''ماہانا کیا مقرر کیا؟'' جاوید نے پوچھا۔

پھر چونکتے ہوئے فیض اللہ نے کہا ''ارے ماہانہ مشاہرہ تو اسے بتایا ہی نہیں۔''

''تب تو بہتر ہے کہ وہ نہ آئے۔ جب اسے تنخواہ نہیں بتایا تو بھلا وہ پتہ کیسے پوچھتا۔ اس نے سوچا ہوگا پروفیسر صاحب تفریحاً کھانا پکانے کو کہہ رہے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

فیض اللہ مسکرائے، شرمائے اور چپ رہے۔

فیض اللہ کی منگنی شدہ بیوی امریکہ چلی گئی۔ ان دنوں موبائیل عوامی نہیں ہوا تھا۔ فیض اللہ کے کمرے میں لینڈ لائن فون بھی نہ تھا۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو ایس۔ ٹی۔ ڈی۔ بوتھ سے فون کرتے تھے۔ ایس ٹی ڈی پر دن میں فون کرنا چار گنا مہنگا تھا۔ ایک دن کالج کے پاس آئی ایس ڈی بوتھ سے دن میں اپنی بیوی سے امریکہ بات کر رہے تھے۔ ان کی نظر راستے کی طرف تھی۔ راستے سے ان کا کوئی دوست گذر رہا تھا۔ اس کی نظر فیض اللہ پر پڑ گئی۔ اس نے سلام کیا۔ فیض اللہ نے فون رکھا اور جواب دیتے ہوئے روڈ پر چلے گئے۔ اس سے پوچھنے لگے۔ کیسے ہیں کہاں جا رہے ہیں عزیز و اقارب کیسے ہیں؟ پندرہ منٹ گفتگو ہوتی رہی۔ آئی ایس ڈی والا فیض اللہ کے پاس آیا اور بولا۔

''ارے صاحب وہ فون کا بل کون دے گا؟''

''کتنا ہوا؟''

''پندرہ سو روپے۔''

فیض اللہ کو غصہ آ گیا بھڑکتے ہوئے اس سے کہا۔ ''تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ دو منٹ بات کی ہے اور اس کے پندرہ سو روپے؟''

''آپ نے دو منٹ بات کی پھر آپ ادھر اپنے دوست سے بیس منٹ سے بات کر رہے ہیں۔ ادھر فون تب سے چل رہا ہے۔ میں اندر کمرے میں کام کر رہا تھا۔ جب باہر

جھانک کر دیکھا تو فون آن رکھا ہوا تھا۔ میٹر تو چلے گا نا۔''

فیض اللہ کی سٹی گم۔ چہرہ بدل گیا۔ بالکل ڈھیلے پڑ گئے۔ دوڑ کر گئے اور فون کو کریڈل پر رکھا۔ دکاندار سے کہا ''تم کو فون بند کر دینا چاہیے۔''

''تو کیا ہم کو بول کر روڈ پر گئے تھے۔ وہ تو ہم نے دیکھ لیا ورنہ پانچ سو اور ہو گئے ہوتے۔''

فیض اللہ کے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ آخر اسی دوست سے کہا آپ کے پاس ہزار روپے ہیں۔ اس نے بروقت مدد کی۔ ورنہ معلوم نہیں کیا کرتے۔ اس دن کالج میں کسی سے بات نہیں کی۔ پریکٹیکل کرائی اور چپکے سے فلیٹ چلے گئے۔ بغیر کچھ کھائے پیئے چادر اوڑھ کر سو گئے۔

رزرویشن کی لائن میں کھڑے ہونے کے لئے علی الصباح چار پانچ بجے ہی مسافر رزرویشن آفس کے باہر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جیسے ہی گیٹ کھلتا تھا بھوکے ننگوں کی طرح لوگ بکنگ کاونٹر کی طرف بھاگتے تھے۔ جو آگے کھڑا ہو گیا وہ خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔ فیض اللہ نے بھی دوڑ لگائی لیکن ان سے بھی تیز دوڑنے والے تھے۔ ان کو بیس آدمی کے بعد لائن میں جگہ ملی۔ شام پانچ بجے ٹکٹ ملا۔ تین چار دن سے وطن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انھیں وطن کے لئے دو دو ٹرین پکڑنا ہوتی تھی۔ پہلی ٹرین سے تین گھنٹے کا سفر کلیان ریلوے اسٹیشن تک کا کرتے تھے۔ وہاں اتر کر دوسری ٹرین پکڑے تھے جس سے پینتیس گھنٹے کا سفر ہوتا تھا۔ پہلی ٹرین سے انھوں نے تین گھنٹے گذار لیے۔ کہیں پر ٹی ٹی نہیں آیا اس لیے ٹکٹ دکھانے کا موقع بھی نہیں آیا۔

کلیان اسٹیشن پر دوسری ٹرین میں بیٹھ گئے جہاں سے پینتیس گھنٹے کا سفر تھا۔ ٹرین اسٹارٹ ہو گئی۔ ایک گھنٹہ بعد ٹی ٹی آیا۔ فیض اللہ نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ٹکٹ ندارد۔ خیال آیا ٹکٹ تو کمرے میں بک ریک پر ہی رہ گیا۔ ٹی ٹی نے فائن لے کر بغیر رزرویشن کا ٹکٹ بنا دیا۔ اور کہا کہ جنرل بوگی میں چلے جایئے۔ سلیپر میں بہت رش تھا۔ تہوار

کا زمانہ تھا۔آدمی پر آدمی تھا۔فیض اللہ نے پینتیس گھنٹے جنرل بوگی میں گذارے۔اب جب کوئی ان سے جنرل بوگی کا ذکر کرتا تو وہ کہتے ہیں کہ بھئی جنرل بوگی اور دور کا سفر نہیں کرنا چاہئے۔ جنرل بوگی میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔کھانا پینا الگ ہے پاخانہ تک کی دقت ہو جاتی ہے۔

فیض اللہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے ایم ایس سی کرکے بحرالاسلام کالج میں آئے تھے۔سب کچھ ذہن میں وہی تھا جو سنٹرل یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔کالج میں ششماہی کے سالانہ امتحانات میں جونیر سپروائزر کی ڈیوٹی دی گئی۔اس کمرے میں وہ تمام طلباء امتحان دے رہے تھے جو کالج میں ہر طرح کی شرارت ،مار پیٹ، بدتمیزی، رشوت خوری اور قمار بازی کیا کرتے تھے۔اتفاق سے فیض اللہ ان کے سپروائزر ہو گئے۔ان لڑکوں کو اسکول سے امتحان میں چوری کی عادت تھی۔وہ کہاں اپنی حرکتوں سے باز آنے والے تھے۔پانچ منٹ کے بعد ہی کاغذ پرزے نکالنے شروع کئے اور نقل کرنے لگے۔فیض اللہ نے تاکید کی لیکن وہ مسکرا مسکرا کر دوسری چیٹس نکالتے رہے۔یہ چھینتے رہے وہ نکالتے رہے۔ان کی چیٹس ختم ہو گئی۔فیض اللہ نے انھیں نقل کرنے نہیں دیا۔ان لوگوں نے تنگ آکر اپنی کاپیاں فیض اللہ کی میز پر پھاڑ کر پھینک دیں اور یہ کہتے ہوئے کہ تم ذرا باہر آؤ دیکھتے ہیں تمہیں کون بچاتا ہے ہال سے باہر چلے گئے۔سامنے کے گراونڈ میں جاکر ان کا انتظار کرنے لگے۔فیض اللہ دل کے دھڑکن تیز ہو گئی۔امتحان ختم ہوا۔انہوں نے کاپیاں سینیر سپروائزر کو دیں اور کالج گیٹ کی طرف جانے لگے۔منتظر طلباء نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تو تو میں میں کے بعد فیض اللہ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش ہو گئی۔شرٹ پھٹ گئی۔شور ہو گیا۔کئی پروفیسر اور آفس کے اسٹاف دوڑے۔سب نے بیچ بچاؤ کیا۔فیض اللہ کو آفس میں لے گئے۔روداد سنی۔درخواست لکھی گئی۔پرنسپل نہیں تھے۔پروفیسروں نے کہا یہ ہماری عزت پر حملہ ہے۔یہ درخواست کل پرنسپل کو دی جائے اور ان بدمعاشوں کو کالج سے نکال باہر کیا جائے۔ایک پروفیسر نے فیض اللہ کو فلیٹ تک چھوڑ دیا۔وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ

گئے۔ رات کے نو بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ فیض اللہ نے دروازہ کھولا۔ وہی دس طالب علم زرہ بکتر کے ساتھ فلیٹ کے اندر گھس آئے۔ فیض اللہ حواس باختہ۔

ایک نے کہا۔ ''کیا رے تم ہم لوگوں کے خلاف درخواست دینے والا ہے۔ دیکھو پروفیسر تم ہم لوگوں کے بیچ میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ تم نے ہم لوگوں کو نقل نہیں کرنے دیا۔ ہم لوگوں نے کاپی پھاڑ دیا۔ تم کیا سمجھتا ہے کہ ہم فیل ہو جائیں گے۔ جب رزلٹ آئے گا تو دیکھ لینا سب سے زیادہ نمبر ہم لوگوں کا ہوگا۔ ہم گھر سے کاپی لکھکر تمہارے بنڈل میں آج رات ہی رکھوا دیں گے۔ کالج کا ہر پروفیسر ہم لوگوں کو جانتا ہے کوئی ہم لوگوں سے پنگا نہیں لیتا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''تم باہر سے آئے لا ہے نا اس لیے تم کو پتہ نہیں ہے۔ تم کو کون پروفیسر کام آئے گا۔ ہم لوگ ایک ایک پروفیسر کا کالا چٹھا جانتا ہے۔ پرنسپل اور وائس پرنسپل سب کا سب ہم لوگوں سے کمیشن کھا کے بیٹھے لا ہے۔ ذرا میرے سامنے میں اس کو بولو بولنے کو۔ اگر تم نے درخواست دی اور پرنسپل نے کچھ کیا تو تمہارا ادھر رہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم کو روز روز وہ پرنسپل تو بچانے نہیں آئے گا۔ اور رہی پرنسپل کی بات تو وہ پہلے اپنی فیملی کو بچائے گا پھر اپنے آپ کو اور اس کے بعد تم کو۔ ہم لوگ کل اسی ٹائم میں پھر ادھر تم کو ملنے آتا۔'' دسوں کمرے سے باہر نکلے۔ دھڑام سے دروازہ بند کیا اور پروفیسر اور پرنسپل کو گالی دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔

فیض اللہ نے دوسرے دن درخواست نہیں دی۔ رات میں وہ دسوں پھر آئے اور فیض اللہ سے کہا۔ ''تم نے بڑی ہوشیاری کا کام کیا۔ تم کو ادھر رہنے کا ہے۔ ساری زندگی نوکری کرنے کا ہے۔ تمہارے بال بچے ہونگے۔ ان کو پڑھانے لکھانے کا ہے۔ تمہارے گاؤں میں تمہارے ماں باپ ہیں ان کو خرچا پانی بھیجو۔ آرام سے رہو۔ ہم لوگ کسی کو خواہ مخواہ تنگ نہیں کرتے۔ جب جان پر بن آتی ہے تو ایسا کرتے ہیں۔''

ایک نے کہا۔ ''کیا سر برا مان گئے کیا۔ چلو سر سوری بات ختم کرو۔ چلو ایک بار ہنس دو۔'' اس نے اپنے ساتھی سے کہا چلو رے سر کو ہنسا۔ اس نے فیض اللہ کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا

اور بولا سر ہنس دو۔ ہنس دو۔ فیض اللہ عجیب وغریب کیفیت سے گذر رہے تھے۔ آخر دونوں لب پھیلا کے مسکرا دیے۔ سب نے کہا چلو رے سر نے ہنس دیا۔ چلو۔ یہ کہتے ہوئے سب باہر چلے گئے۔

پرنسپل نے فیض اللہ سے پوچھا۔ ''آپ کو طالب علموں نے مارا۔''

فیض اللہ نے کہا۔ ''نہیں سر یہ بات غلط ہے۔ مجھے کسی نے نہیں مارا۔''

سال میں ایک بار کالج کا سالانہ اجتماع (ANNUAL GATHERING) ہوتا تھا۔ اسے شہر کے کسی بڑے آڈیٹوریم میں منعقد کیا جاتا تھا۔ یہ دراصل سالانہ فنکشن تھا۔ جس میں مختلف طرح کے پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ ڈرامہ، طنز و مزاح، شاعری، قوالی، رقص، تقریر وغیرہ۔ ڈرامہ، قوالی اور رقص میں غنڈے طالب علم بھی حصہ لیتے تھے۔ ان کو حصہ لینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ جس قسم کی بدمعاشی کرتے تھے ویسا ہی کردار اپنے لیے منتخب کرتے تھے۔ یعنی غنڈہ، چور، بدمعاش، قصائی یا قوال کا۔ اس اجتماع کے بعد تقسیم انعامات کا جلسہ ہوتا تھا جس میں وہی غنڈے طلباء کو انعامات بھی دیے جاتے۔ اگر نہیں دیا جاتا تو وہ عین جلسہ میں ہی ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ وہ جب انعام لینے جاتے تو طلباء خوب تالیاں بجاتے پتہ نہیں خوشی سے یا ڈر سے۔

سالانہ اجتماع کے لیے پروفیسر، پرنسپل اور طلباء وطالبات آڈیٹوریم میں جمع ہو رہے تھے۔ مولانا ہال میں اندر بیٹھ چکے تھے۔ ہال کا تین حصہ بھر چکا تھا۔ اسٹیج پر سیٹنگ ہو رہی تھی۔ جاوید پروفیسر ضمیر الدین پروفیسر نیاز احمد آڈیٹوریم کے انٹرنس پر کھڑے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ طلباء و پروفیسر آہستہ آہستہ آڈیٹوریم کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ عین اسی وقت ایک پروفیسر آئے۔ انھوں نے کالی جینز، کالی جرسی اور ایکشن کا جوتا پہن رکھا تھا۔ گمان ہوا کہ سڑک کے کنارے بے کار جوانوں میں سے اٹھ کر کوئی آ گیا ہے۔ لگتا تھا اس لباس میں وہ پروفیسروں کا مذاق اڑانے آیا ہے۔ یہ تھے پروفیسر فیض اللہ۔ جاوید نے دیکھ کر مسکرا دیا۔ فیض اللہ بھی دانت دکھا دکھا کر مسکراتے رہے۔ پروفیسر ضمیر الدین

کوفیض اللہ کا یہ لباس قطعی پسند نہیں آیا۔ وہ بے تاب ہونے لگے کہ کیا کہا جائے۔ اسی وقت پرنسپل کی کار بھی آڈیٹوریم کے کیمپس میں آ گئی۔ وہ کار سے اتر کر انٹرنس کی طرف آنے لگے۔ ان کی نظر فیض اللہ پر پڑی اور چہرے سے گزرتی ہوئی ان کے لباس پر چلی گئی۔ وہ غور سے دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر تناؤ پیدا ہوا۔ انھوں نے پروفیسر ضمیر الدین کو دیکھا اور جیسے بتایا کہ یہ کس قسم کا پروفیسر ہے۔ اس کو لباس کی بھی تمیز نہیں ہے۔ یہاں پورے کالج کا مجمع ہے اور اس لباس میں اس نے خود کو تماشہ بنالیا ہے۔ اس کو ذرا سمجھاؤ۔ ضمیر الدین نے پرنسپل کا منشاء تاڑ لیا۔ اس نے پروفیسر نیاز احمد (حیوانیات) سے کہا اس کا صدر شعبہ کہاں ہے؟

''ان کو کیا کہنا ہے؟ نیاز احمد نے پوچھا۔

''نہیں اس کو ڈانٹ دلوا کر ہی رہیں گے۔ دیکھو اس نمونہ کو۔''

''اس کے صدر شعبہ ہال کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' نیاز احمد نے بتایا۔

''ان کو بلا کر لاؤ۔'' ضمیر الدین نے کہا۔

نیاز احمد صدر شعبہ کو ہال کے باہر لائے۔ فیض اللہ کو ابتک یہ نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ جاوید کو دیکھ کر باہر ہی کھڑے تھے اور ہر آنے والی کی نظر میں کھپتے جا رہے تھے۔ پروفیسر ضمیر الدین صدر شعبہ کو ایک کنارے لے گئے اور وہاں سے فیض اللہ اور اس کے حلیہ کو دکھایا اور کہا اپنے پروفیسر صاحب کو ذرا سمجھائیے کہ لباس کیسا پہنتے ہیں۔ صدر شعبہ نے بھی ان کے لباس کو غور سے دیکھا اور جاوید سے کہا ان کو سمجھائیے۔ جاوید نے صدر کیمیا سے کہا ہمارا شعبہ الگ ہے۔ آپ کے شعبہ کے پروفیسر ہیں اور آپ صدر شعبہ آپ ہی کچھ کہیے۔ انھوں نے کہا انھیں ادھر بلائیے۔ فیض اللہ ان کے پاس آ گئے۔ سلام کیا۔ صدر شعبہ نے کروفر کے ساتھ کہا آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم حاصل کر کے یہاں آئے ہیں۔ پروفیسر ہو گئے ہیں۔ وہاں آپ کو یہ نہیں سکھایا گیا کہ پروفیسر کو لباس کس قسم کا پہننا چاہئے۔ آپ ایک بار کالج میں کالی جرسی اور سرخ پینٹ اور چھاتا جیسا ہیٹ لگا کر آئے تھے۔ آج پھر نیا تماشا۔ کیا یہ جرسی پہننے کا موقع ہے۔ جینز طالب علم کو زیب دیتی

ہے۔اور یہ اسپورٹ شو کیا آپ یہاں کھیل میں حصہ لینے آئے ہیں۔آپ کے حلیہ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ طالب علمی کا بھوت ابھی آپ کا اترا نہیں ہے۔طلباء دیکھ کر آپ کو کیا کہیں گے۔آپ سے زیادہ سنجیدہ لباس طالب علموں نے پہن رکھا ہے۔اس طرح آپ شعبہ اور کالج دونوں کی بدنامی کر رہے ہیں۔ابھی جایئے اور فوراً دوسرا لباس پہنکر آیئے اور کل مجھ سے میرے کیبن میں ملئے گا۔

فیض اللہ آہستہ آہستہ وہاں سے چلے۔آڈیٹوریم کیمپس سے باہر نکلے۔روڈ پر آئے پھر بھیڑ بھاڑ میں کہیں گم ہو گئے۔صدر شعبہ اور دیگر پروفیسر ہال میں آئے۔پروگرام شروع ہو چکا تھا۔انٹرول میں پروفیسر ضمیر الدین نے فیض اللہ کو پورے ہال میں ڈھونڈا کہیں نظر نہیں آئے۔جاوید سے پوچھا وہ آپ کے پروفیسر صاحب کہاں ہیں۔جاوید نے کہا کپڑا تبدیل کرنے گئے تھے۔ضمیر الدین نے کہا آج اس کو اتنا ڈوز ملا ہے کہ ساری رات لباس ہی تبدیل کرتے رہ جائیں گے۔اب تو وہ کل کے لباس کا کلر چوز کر رہے ہونگے۔ قہقہہ لگا اور سب چائے پینے لگے۔

دن مہینے گذرتے رہے۔موسم گرما کی تعطیل ہوئی۔فیض اللہ وطن گئے۔واپس آئے معلوم ہوا شادی کر کے آئے ہیں۔

''آپ نے شادی کر لی اور ہم لوگوں کو دعوت تک نہیں دی؟'' جاوید نے پوچھا۔

''دراصل وہ سب اچانک ہو گیا۔مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔وہ لوگ یعنی ہمارے رشتہ دار امریکہ سے مختصر مدت کے لئے آئے تھے۔دوبارہ جلدی آنا ممکن نہیں تھا اس لے نکاح ہو گیا۔

''بھئی نکاح ہو گیا۔برات تو باقی ہے اس میں ہم لوگ چلیں گے۔'' جاوید نے کہا۔

''نہیں ہمارے یہاں برات کی رسم نہیں ہے اور اس کی مہلت بھی ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔نکاح مسجد میں ہوا۔یہی شادی بھی تھی۔'' فیض اللہ نے بتایا۔

یار یہ کیسی فیملی ہے۔کیسے لوگ ہیں۔نکاح کرتے ہیں برات نہیں جاتی۔مسجد میں

ہی سب کچھ کر لیتے ہیں ۔ یہ سب بھی کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔اس کے بغیر بھی کیا نقصان ہے ۔ کیونکہ شادی کے پہلے اور بعد میں کوئی فرق تو نظر نہیں آ رہا ہے ۔

''بھابی کہاں ہیں؟'' جاوید نے پوچھا یہ سوچتے ہوئے کہ شادی عورت سے ہوئی ہوگی تو بھابی بھی ہوگی ۔

''وہ اپنے باپ کے ساتھ امریکہ چلی گئی ۔ دراصل وہ لوگ امریکہ کے گرین کارڈ ہولڈر ہیں اور باپ بیٹی دونوں وہاں کام کرتے ہیں ۔ امریکہ میں تو کوئی بیٹھ کر نہیں رہتا ۔'' فیض اللہ نے بتایا ۔

''تو شادی کے بعد آپ یہاں اکیلے رہیں گے ۔ پھر شادی کس لیے کی؟''

''وہ ایک مہینہ بعد ہندوستان آئیگی ۔ کچھ دنوں نانی دادی کے پاس رہے گی اس کے بعد میرے پاس ایک مہینہ کے لئے آئیگی ۔''

ایک مہینہ بعد واقعی اس کی بیوی ہندوستان اپنے والدین کے ہاں آ گئی ۔ فیض اللہ نے ایک رہائشی کالونی میں ایک فلیٹ کا انتظام کیا ۔ ایک ڈیڑھ مہینے بعد بیوی فیض اللہ کے پاس آ گئی ۔ دونوں ساتھ ساتھ رہنے لگے ۔ گرمی کا زمانہ تھا سخت دھوپ پڑ رہی تھی ۔ دن کے دو بج رہے تھے ۔ ہر شخص اپنے اپنے فلیٹ میں بند تھا ۔ لو چل رہی تھی ۔ پروفیسر سرمد نصیر اسی کالونی میں رہتے تھے ۔ جاوید ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا تھا ۔ باہر دیکھا ۔ ایک کھلا میدان تھا تقریباً پانچ ایکٹر کا جس کے دونوں کناروں پر فلیٹ بنے تھے ۔ جاوید نے دیکھا کہ مخالف کنارے سے ایک شخص دھوپ میں چلتا ہوا آ رہا ہے ۔اس کے ہاتھوں میں کارٹون جیسا کچھ تھا ۔ جب وہ قریب آیا تو پروفیسر فیض اللہ تھے ۔ ان کے ہاتھوں میں چودہ انچ والا بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی تھا جسے وہ بڑے احتیاط سے اٹھائے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہے تھے ۔ جاوید کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ماجرا ہے ۔ پروفیسر فیض اللہ اور خلاف شریعت عمل یہ کیا پہیلی ہے ۔ ایک گھنٹہ بعد جاوید نے پھر دیکھا کہ فیض اللہ ایک بار پھر میدان کے دوسرے کنارے سے آ رہے ہیں ہاتھوں میں کچھ ہے ۔ ۔ نزدیک آئے تو ان کے ہاتھوں

میں کولڈ ڈرنک کی پانچ بوتلیں تھیں جنہیں رومال سے باندھ کر دونوں ہاتھوں میں دبائے قدم پھونک کر رکھتے ہوئے وہ اپنے فلیٹ کی طرف جا رہے تھے۔

اسی شام جاوید اکیلے ایم۔ جی۔ روڈ پر ٹہل رہا تھا کہ اس کی ملاقات پروفیسر بے گار حسین سے ہوگئی جو فیض اللہ کے پاس ہی رہتے تھے۔ جاوید نے بیگار حسین سے کہا۔

''آج میں نے ایک انہونی دیکھی۔''

''کیا؟'' بیگار حسین نے پوچھا۔

''جناب پروفیسر فیض اللہ اور ان کے ہاتھوں میں ٹی وی توبہ توبہ خلاف شریعت منظر۔''

''اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے یہ منظر دوپہر دو بجے دیکھا ہوگا۔ اسی وقت فیض اللہ میرے یہاں آئے تھے۔ کہنے لگے آپ کے پاس کوئی اکسٹرا ٹی وی ہے۔'' کلر ٹی وی لینے کے بعد میں نے اپنا بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی رکھ دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ بلیک اینڈ وہائٹ چودہ انچ والا ہے لیکن یہ اچانک آپ کو کیا ضرورت آن پڑی۔

''ذرا میری بیگم کو دیکھنا ہے اور ابھی دیکھنا ہے۔ وہ کچھ دنوں کے لئے یہاں آئی ہیں پھر امریکہ چلی جائیں گی۔ ابھی کہاں ملے گا؟'' فیض اللہ نے پوچھا۔

بیگار حسین واقعہ سمجھ گئے۔ اپنی بیٹی سے کہا ''دیکھو بھئی پروفیسر صاحب کو اپنا وہ بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی لاکر دے دو۔'' بیٹی ٹی وی لانے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

فیض اللہ نے پکے دیہاتی کی طرح کہا۔ ''اچھا اب آپ یہ بتائیے ٹی وی کا کتنا روپیہ لیں گے؟''

''پروفیسر بیگار حسین ان کا لب ولہجہ اور انداز گفتگو سن کر چونک پڑے۔ یہ کتنا اکھڑ اور گنوار آدمی ہے۔ اسے یہ تمیز نہیں کہ سامان کس سے کیسے مانگتے ہیں اور خرید وفروخت کس سامان کا ہوتا ہے۔ کیا میں ٹی وی کی دکان کھولے بیٹھا ہوں کہ کسٹمر آیا اور پوچھا یہ ٹی وی کتنے کا ہے۔

بیگار حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اجی فیض اللہ صاحب لے جایئے۔ بھابی

صاحب دیکھیں گی۔ امریکہ سے آئی ہیں۔ پیسے ویسے کو گولی ماریے۔''

''نہیں آپ ابھی بول دیجئے۔ کتنا لیجئے گا۔ فیض اللہ اکھڑ کی طرح پھر بولے۔''

بیگار حسین نے دیکھا فیض اللہ پہلوان کی طرح تن کر کھڑے ہیں اور دعوت دے رہے ہیں کہ لڑنا ہوگا۔ کیا کیا جائے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہا'' چلئے آپ ضد کر رہے ہیں تو حالانکہ مجھے بیچنا نہیں تھا تین ساڑھے تین ہزار دے دیجئے گا۔''

''ہاں میں آپ کو تین ہزار روپیہ دونگا اور یہ تین ہزار تنخواہ ملنے پر دونگا اور تنخواہ ملنے میں دو ہفتے باقی ہیں۔ آپ کو منظور ہے؟'' فیض اللہ نے فیصلہ سنایا۔

بیگار حسین کے دل میں آیا کہ منظور تو یہ ہے کہ جس انداز سے آپ گفتگو فرما رہے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے ہاتھوں سے ٹی وی چھین لی جائے اور آپ کو دھکے مار کر باہر نکال دیا جائے لیکن معاملہ امریکہ والی نئی نئی بیگم کا ہے۔ یہاں جب مجھ سے ایسی گفتگو ہو رہی ہے تو پتہ نہیں یہ امریکن بیوی سے کیا کیا کر کے آیا ہو اور معلوم نہیں اس نے اسے کس حالت میں یہ حکم دیا ہو۔ یہی سب سوچتے ہوئے بیگار حسین ساری باتوں کو پی گئے اور کہا ہاں پروفیسر صاحب ہمیں منظور رہے۔ آپ ٹی وی جلدی لے جایئے بیگم آپ کا انتظار کر رہی ہونگی ورنہ وہ امریکہ لوٹ جائیں گی اور اس کے ساتھ ہی فیض اللہ نے دونوں ہاتھوں میں ٹی وی کو اٹھایا اور چلتے بنے۔

''اچھا تو یہ ہے داستان فیض اللہ و بیگم امریکن بہ متعلق ٹی وی۔'' جاوید نے بیگار حسین سے کہا۔

''جی ہاں۔'' بیگار حسین نے کہا۔

''اچھا وہ کولڈ ڈرنک کی پانچ بوتلوں کی گٹھر آپ نے دیکھی۔''

''نہیں کیسی گٹھر؟''

''آپ سے ٹی وی لے جانے کے ایک گھنٹہ بعد پروفیسر فیض اللہ ہی بوتلوں کی گٹھر لے جا رہے تھے۔''

''اچھا۔ ہوسکتا ہے گیسٹ آئے ہوں۔''

دوسرے دن کالج میں جاوید نے فیض اللہ سے پوچھا: ''اچھا تو آجکل جم کر کولڈڈرنک پی جارہی ہے اور وہ بھی ہم لوگوں سے دور۔''

''آپ نے کہاں دیکھا؟'' فیض اللہ چونکے گھبرائے شرمائے اور بولے۔

''اجی ہم نے بھی جاسوس رکھ چھوڑے ہیں۔ ہمیں خبر ملتی رہتی ہے۔''

فیض اللہ شرماتے رہے، کٹے ہونٹوں سے مسکراتے رہے۔

''یہ ٹی وی کا کیا قصہ ہے۔ آپ اور ٹی وی توبہ توبہ نعوذ باللہ۔

یہ سن کر تو فیض اللہ پانی پانی ہوگئے۔ خاموش رہے۔ جواب سوچتے رہے۔ خلاف شریعت احکام کا جواب ڈھونڈتے رہے۔ بولے۔

''وہ ذرا میری بیوی کو ٹی وی دیکھنا تھا۔ وہ امریکہ میں رہ چکی ہے۔ اس نے کہا میں بغیر ٹی وی کے یہاں ایکدن بھی نہیں رہ سکتی۔ بیگار حسین کے یہاں ایک اکسٹرا ٹی وی تھا وہ لے آیا۔''

''تو ٹی وی بیوی کے لئے ہے۔ آپ گھر میں بھی نہیں دیکھتے ہونگے۔''

''ہاں وہ دیکھتی ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے میں نے ٹی وی کبھی نہیں دیکھا۔''

شہر کے مشہور سینما ہال راہل میں ایک گرم انگریزی فلم لگی تھی۔ اس ہال میں زیادہ تر انگریزی فلمیں ہی دکھائی جاتی تھیں۔ جاوید کے فلیٹ سے سینما دس کیلومیٹر دور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فیض اللہ تو اس کے ساتھ جائیں گے نہیں اور مولانا کے سامنے فلم کا نام لینا گناہ تھا۔ وہ فلم نہیں دیکھتے تھے لیکن اپنے ایک جماعتی دوست کے گھر میں گھنٹوں ٹی وی دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت اس دوست کی جوان خوبصورت بہن بھی گھر کا کام کرتے ہوئے ٹی وی دیکھتی تھی۔ وہاں پر مولانا کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہوتا تھا۔ دوست کے والدین ایک دومنٹ کے لئے ٹی وی روم میں آتے اور انھیں دیکھکر چلے جاتے یہ سوچ کر کہ نوجوانوں کے بیچ بوڑھوں کا کیا کام اور پھر یہ سب تو آپس میں دینی بھائی بہن ہیں ٹی وی بھی دینی نقطۂ

نظر سے دیکھتے ہونگے۔

جاوید تنہا ہی راہل سینما فلم دیکھنے چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو دور سے ہی ہاؤس فل کا بورڈ چمک رہا تھا۔ اب کیا کیا جائے اس نے ادھر ادھر چل کر دیکھا کہ کوئی بلیکیر نظر آجائے تو اس سے بات کریں لیکن کوئی دکھائی نہ پڑا۔ لوگوں کی بھیڑ میں ایک شخص ایسا نظر آیا جس کی شکل فیض اللہ سے ملتی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ فیض اللہ اور یہاں ناممکن۔ میری آنکھوں کا دھوکا ہوگا۔ لیکن وہ شخص برابر جاوید کو دیکھے جا رہا تھا۔ جاوید نے بھی دیکھنا شروع کیا۔ وہ مسکرانے لگا قریب آگیا اور تب معلوم ہوا کہ یہ پروفیسر فیض اللہ ہی ہیں۔

''ارے آپ یہاں خیریت؟'' جاوید نے حیرانی سے کہا۔

فیض اللہ شرمائے لجائے مسکرائے اور بولے۔ ''اکیلے بیٹھے بیٹھے بور ہو رہا تھا سوچا چلو کہیں چلتے ہیں اس لئے یہاں چلا آیا۔''

''لیکن یہ تو انگریزی فلم ہے اور ایکس ٹائپ ہے اور آپ تو ٹی وی تک نہیں دیکھتے اسے برداشت کرلیں گے؟'' جاوید نے کہا۔

فیض اللہ نے اجڈ کی طرح جواب دیا: ''تو کیا میں آدمی نہیں ہوں۔ جوان نہیں ہوں میرے پاس شوق نہیں ہے کیا؟'' ''تو آپ نے چھپایا کیوں؟ ٹی وی دیکھکر تو آپ نے منہ موڑ لیا تھا۔''

''ارے وہاں پر وہ مولانا جو بیٹھا تھا اس کے سامنے کیسے دیکھتا؟''

''لیکن اس نے تو شوق سے دیکھا۔''

''اس کی بات الگ ہے اسے کچھ خیال نہیں ہے تو کیا میں بھی اس جیسا بن جاؤں؟''

''یار میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ آپ دونوں میں کون کدھر ہے کس کا کعبہ ہے اور کس کا کاشی۔ کچھ واضح نہیں ہو پا رہا ہے۔ ایک کوئی کام کرتا ہے اسی کو دوسرا نہیں کرتا اور دوسرا جو کرتا ہے اسے کوئی نہیں کرتا۔ کیا چکّر ہے۔ آخر آپ لوگوں کا اصلی چہرہ کیا ہے۔ ماشاء اللہ آپ دونوں پروفیسر ہیں؟''

"آپ جو دیکھ رہے ہیں یہی اصلی چہرہ ہے۔ چلئے ٹکٹ کا انتظام کیجئے اور چائے پلائیے۔"

ٹکٹ تو ملنے سے رہا۔ ہاؤس فل ہے۔ آیئے چائے پیتے ہیں پھر ٹہل کر تھوڑا وقت گذاریں گے اس کے بعد شام کا شو دیکھ کر جائیں گے۔ دونوں چائے پینے چلے گئے۔ پھر شام کا شو دیکھ کر اپنے اپنے فلیٹ کو لوٹے۔

فیض اللہ ایسی حرکت اکثر کرتے رہتے تھے۔ ایکدن شہر کے مشہور بازار ایم۔ جی روڈ میں مولانا اور جاوید شام کی سیر کر رہے تھے۔ مخالف فٹ پاتھ پر فیض اللہ نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں تھیلا تھا۔ ان کے آگے آگے ایک محترمہ چل رہی تھیں۔ چھوٹے بال، قبول صورت، گیہواں رنگ، جینز ٹی شرٹ جوتا پہنے موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے فیض اللہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح گردن جھکائے چل رہے تھے۔ پھر تو ایسا منظر ہر دوسرے تیسرے دن لوگوں کو نظر آنے لگا۔ کالونی میں لوگوں نے دیکھا کہ فیض اللہ کسی دن ہاتھوں میں ٹماٹر لیے جا رہے ہیں۔ کسی دن پیاز، کسی دن گوبھی۔ وہ کچن کا ہر سامان ہتھیلی میں کیوں لے جاتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم۔ کیری بیگ سے الرجی تھی یا دشمنی خدا معلوم۔

ایک مہینہ بعد بیوی امریکہ چلی گئی۔

کالج میں جاوید نے فیض اللہ سے پوچھا۔ "تو پھر آپ امریکہ کب جا رہے ہیں؟۔ آپ کی بیگم گرین کارڈ ہولڈر ہیں۔ آپ کو بھی کارڈ مل جائے گا۔ چلے جایئے اچھا موقع ہے۔ کہاں امریکہ کہاں یہ کالج اور معمولی تنخواہ۔ وہاں ڈالر جایئے عیش کیجئے گا۔"

"آپ لوگ کیا بات کرتے ہیں۔ میں کبھی امریکہ نہیں جاؤنگا۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتا۔ اس کے پاس گرین کارڈ ہے تو اپنے پاس رکھے۔ مجھے اس سے کیا۔ اس کو رہنا ہے تو میرے پاس رہے۔ میں نہیں جاؤنگا۔"

"یہ ہوئی نہ مردوں والی بات۔ دیکھتے ہیں کون کدھر جاتا ہے۔"

''دیکھئے گا میں جو کہتا ہوں وہی کرونگا۔''

دن گذرتے رہے ۔سال گذرتے رہے۔فیض اللہ کے دو بیٹے ہوئے۔ خوبصورت، گول مول امریکن جیسے۔ ایکدن کالج میں فیض اللہ پروفیسروں کو اپنے بیٹے کی تصویر دکھارہے تھے۔ایک پروفیسر نے کہاارے یہ بچے تو بالکل امریکن لگتے ہیں۔آپ جیسے تو بالکل نہیں ہیں۔آپ ہندوستان میں بیوی امریکہ میں لگتا ہے یہاں سے انڈر رویر بھیج دیا ہوگا۔فیض اللہ پوری طرح شرما گئے۔کوئی جواب نہ بن پڑا۔انہیں مذاق کا جواب مذاق سے دینا نہیں آتا تھا۔اس لیے ایسے موقع پر وہ جلدی سے کھسک لیتے تھے۔وہاں پر بھی یہی کیا۔

بیوی اور سسر نے بار بار پیغام دیا کہ فیض اللہ امریکہ آجائے۔انکی ایک ہی ضد۔''میں نہیں جاؤنگا۔وہ ہندوستان آجائے۔'' رسہ کشی جاری تھی۔ پھر یہ ہوا کہ وہ اچانک غائب ہوگئے۔جاوید اور مولانا دونوں حیران کہ کہاں گئے۔ایکدن کالج میں کسی نے بتایا کہ فیض اللہ نے نوکری سے رزائن کر دیا ہے اور کہیں چلے گئے۔شہر میں فیض اللہ کے ایک رشتہ دار تھے ان سے جاوید کو معلوم ہوا کہ وہ تو امریکہ چلے گئے۔کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔آخر چلے ہی گئے۔سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔فیض اللہ کو بھی لوگ بھول گئے۔

فلیٹ اونر نے ایک مہینہ پہلے جاوید اور مولانا کو فلیٹ خالی کرنے کی نوٹس دے دی تھی۔ایک مہینہ بعد دونوں نے فلیٹ خالی کر دیا۔مولانا کو کسی پروفیسر کے مکان میں ایک کمرا مل گیا اور جاوید نے لاج کی راہ لی۔

دو تین سال بعد جاوید کی ملاقات فیض اللہ کے اسی رشتہ دار سے اچانک ہوگئی۔

''کہئے کیسے ہیں آپ؟ سنائیے آپ کے پروفیسر فیض اللہ کی امریکہ میں کیسی گذر رہی ہے۔عیش کر رہے ہونگے۔ہم لوگوں کو تو بھول ہی گئے۔نہ خط نہ فون۔'' جاوید نے پوچھا۔

رشتہ دار نے بغیر کسی تاثر کے جواب دیا۔''اجی کیسا عیش اور کیسا امریکہ وہ بہت بڑا بیوقوف آدمی ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟'' رشتہ دار نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''نہیں تو کیا بات ہے؟''

''ارے اس کی طلاق ہوگئی۔''

جاوید کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔اس نے کہا''فیض اللہ نے یہ اچھا نہیں کیا۔''

''اجی فیض اللہ نے نہیں اس کی بیوی نے طلاق لے لی۔''

''اور بچے؟''

''بچے دونوں بیوی نے لے لئے۔''

جاوید نے افسوس کا اظہار کیا۔کالج میں جس نے سنا کسی کو یقین نہ آیا۔دن گذرتے رہے۔دنیا چلتی رہی۔دو سال گزر گئے۔جاوید ایم جی روڈ پر ٹرائی لک کیفے میں چائے پی رہا تھا۔شومئی اتفاق قریب کی کرسی پر ایک شخص نظر آیا۔

''سلام علیکم''

''وعلیکم السلام۔'' جاوید نے کہا۔

''اور سب ٹھیک ہے۔کوئی خاص بات۔'' جاوید نے پوچھا۔

''سب خدا کا فضل ہے۔اپنے دوست کا تو معلوم ہوا ہوگا؟''

''ہاں..... ہاں فیض اللہ کا معلوم ہے۔سن کر بڑا افسوس ہوا۔اتنی جلد شادی اور علیحدگی۔اس کے ساتھ بہت بُرا ہوا۔بتائیے یہ طلاق وغیرہ۔زندگی برباد ہو جاتی ہے۔''

''اجی وہ بات تو پرانی ہوگئی۔'' رشتہ دار نے کہا۔

''تو کوئی نئی بات بھی ہے؟''

''ہاں آپ کو معلوم نہیں۔''

''نہیں۔بتائیے۔''

''پہلی بیوی نے طلاق لے لی۔بچے لے لئے۔اس کے بعد فیض اللہ نے دوسری شادی کی۔چھ مہینے بعد اس نے بھی طلاق لے لی۔یہ بیوی بھی ہندوستانی تھی۔''

''یا خدا یہ شخص پتہ نہیں کیا کیا کرنے والا ہے۔ تو اب اس کا مشغلہ کیا ہے؟''

شروع میں کسی فیلوشپ پر کسی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے رکھا تھا۔ پہلی سے جدائی کے بعد کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں نوکری کر لی تھی۔ دوسری سے طلاق کے بعد کبھی یہاں کبھی وہاں کچھ کرتا رہتا ہے شاید شرم سے ہندوستان نہیں آرہا ہے۔ یا ہوسکتا ہے آنے کے پیسے نہ ہوں۔ وہ پہلے سے ہی تھوڑا مینٹل تھا وہاں جاکر پورا ہوگیا۔ پڑا رہتا ہوگا کسی سمندری ساحل پر۔ بھئی وہاں کا کلچر آزاد خیالی ہے۔ سنا ایک دن جب اس کی بیوی کو ایک انگریز نوجوان اس کے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں کِس کر رہا تھا فیض اللہ نے دیکھ لیا تب ہی سے اس کا دماغ چل گیا۔

چپراسی روزانہ کی طرح کالج آفس سے پروفیسر کی ڈاک لے کر ٹیچرس اسٹاف روم میں آیا۔ اسے دیکھ کر مولانا نے کہا ڈاک ادھر لاؤ میں دیکھ کر رکھ دونگا۔ مولانا کو دو رجسٹری خط ملے ایک خود کا اور دوسرا جاوید کا۔ دونوں خط ایک ہی مقام مالیگاؤں سے آئے تھے۔ انہوں نے بقیہ خطوط مخصوص میز پر رکھ دیا اور اپنا خط چاک کیا۔ مالیگاؤں کے کسی کالج میں ایک اردو پروفیسر کا تقرر ہونا تھا جس کی سلیکشن کمیٹی میں ان کو سبجکٹ اکسپرٹ بنایا گیا تھا۔ انٹرویو ایک ہفتہ بعد تھا۔ آٹھ گھنٹے کا سفر تھا۔

مولانا نے جاوید کے خط کا یکساں لفافہ دیکھکر کہا اسے کھولئے آپ کو بھی اکسپرٹ کے طور پر بلایا گیا ہوگا۔ جاوید نے لفافہ چاک کیا۔ لیٹر پڑھا۔ مولانا نے ٹھیک کہا تھا گویا دونوں کو ایک ہی سلیکشن کمیٹی میں ایک ہی سبجکٹ کے اکسپرٹ کے لئے بلایا گیا تھا۔ جبکہ ان کا سبجکٹ عربی تھا۔ خط پڑھتے ہی مولانا کی خوشیوں کو کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اسی وقت سے کہنے لگے کہ جانا ہے اور ضرور جانا ہے آپ بھی چلئے۔ جاوید نے کہا بھئی یہ الٹی جگہ ہے جہاں ٹرین نہیں جاتی۔ بس سے مجھے وحشت ہوتی ہے وہ لوگ بس یا ٹرین کا کرایہ دیں گے۔ میں تو نہیں جاؤنگا۔ آپ چلے جائیے۔ مولانا نے اصرار کیا۔ نہیں نہیں چلنا تو آپ کو بھی ہے۔ میں کالج انتظامیہ سے بات کرونگا۔

دوسرے دن پھر ذکر چھڑا۔ مولانا نے کہا آپ چل رہے ہیں نا۔ میری بات انتظامیہ سے ہوگئی ہے۔ میں نے ان سے بتایا کہ ٹرین آپ کے یہاں جاتی نہیں اگر آپ ٹیکسی کا کرایہ دیجئے تو ہم لوگ آسکتے ہیں۔ وہ تیار ہوگئے۔ ہم لوگ ایک دن پہلے چلیں گے۔ رات میں قیام کریں گے۔ دوسرے دن انٹرویو لے کر واپس ہوجائیں گے۔

''اب ٹیکسی کہاں ملے گی؟ اس کا انتظام کون کرے گا؟'' جاوید نے پوچھا۔

''آپ گھبرائیے نہیں۔ سارا انتظام ہوجائے گا۔ آخر ہمارے تعلقات کس دن کام آئیں گے۔ آرام سے ٹیکسی کا انتظام ہوجائے گا۔ ٹیکسی کیا ہے ہم تو بڑی بڑی بس کا اہتمام بھی کرسکتے ہیں کہیئے تو اگلی بار کالج اسٹڈی ٹور کے لئے بس کا انتظام کردوں؟''

''ٹور کو ابھی دیر ہے۔ تب دیکھیں گے۔ فی الوقت آپ ٹیکسی دیکھ لیجئے اور روانگی کے روز مجھے فون کردیجئے گا اور ناشتہ کرکے یہاں سے چلئے گا تاکہ وہاں شام تک پہنچ جائیں۔'' جاوید نے کہا۔

معینہ روز مولانا نے جاوید کو فون کیا کہ گیارہ بجے تیار ہوکر میری طرف آجائیے۔ جاوید تیار ہوکر مولانا کی بلڈنگ کے نیچے پہنچا۔ آواز دی۔ وہ نیچے اترے۔ جاوید نے کہا ''میں تو حاضر ہوں۔ ٹیکسی کہاں ہے؟''

''ابھی آتی ہے۔ بچے ضد کررہے تھے۔ اس لیے میں نے ڈرائیور سے کہا کہ بچوں کو ذرا چار پانچ کیلومیٹر قریب سے ٹہلا لاؤ۔ ابھی آجائے گا۔ چلئے ہم لوگ سامنے والی دکان پر چلتے ہیں۔ ٹیکسی ادھر سے ہی آئیگی۔''

مولانا نے جاوید کو اپنے فلیٹ میں نہیں بلایا۔ جاوید نے دیکھا کہ یہ تو ابھی سے ٹیکسی میں گھر والوں کو ڈال رہے ہیں۔ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ انہیں پہلے ہی بتادیا تھا کہ ڈرائیور کے علاوہ صرف ہم دو رہیں گے لیکن یہاں آثار کچھ اور نظر آرہے ہیں۔

دس منٹ بعد ٹیکسی پاس آکر رک گئی۔ جاوید نے دیکھا کہ مولانا کا ایک بیٹا اگلی سیٹ پر اور دوسرا پچھلی سیٹ پر بیگ اور کھلونے کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ مولانا نے کہا بیٹے اتر

جائیے پھر کل بیٹھیں گے جب یہ لوٹ کر آئے گی تب۔ بیٹے اترنے کو تیار نہیں۔ کہنے لگے۔نہیں اتریں گے ابھی اور بیٹھیں گے۔ یہ ہماری ٹیکسی ہے آپ ہی نے کہا تھا پھر ہمیں کیوں اتار رہے ہیں۔مولانا نے انھیں سمجھایا اور ہاتھ پکڑ کے نیچے اتارا۔جاوید کو الجھن ہو رہی تھی یار اس نے بچوں کو یہ تک بتا دیا ہے کہ اپنی ٹیکسی ہے اور کل بھی بیٹھیں گے۔آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔بچے اتر گئے انھیں گھر میں پہنچا کر مولانا واپس آئے۔ جاوید تیار ہو رہا تھا کہ دونوں آدمی پیچھے بیٹھ جائیں گے تب ہی مولانا نے کہا''ایسا ہے یہ ٹیکسی انڈیکا بالکل نئی ہے۔پچھلی سیٹ اور پیچھے کی بناوٹ تو عام ہے لیکن آگے دیکھئے سب کچھ ہے میوزک سسٹم ،نظر کے سامنے دیکھئے ایک گلاس بھی ہے۔ جسے آگے پیچھے کر سکتے ہیں تاکہ ڈائرکٹ دھوپ آنکھوں پر نہ پڑے۔آپ بیٹھ کر تو دیکھئے بہت اچھا لگے گا۔جب آپ کا جی چاہے پیچھے آجائیے گا اور یہ ڈرائیور تو ہے نہیں اپنا بھائی ہے نعیم بھائی۔ان کے ساتھ آپ کو بات کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔''

جاوید نے سوچا نئی کار ہے۔ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔چلو تھوڑی دیر آگے بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔جب جی میں آئے گا پیچھے بھی چلے آئیں گے۔اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

پانچ چھ کیلومیٹر چلنے کے بعد جاوید نے ڈرائیور سے کہا۔''یہ کدھر سے لے جا رہے ہو۔ہائی وے تو ادھر سے ہے؟

''ہائے وے کی طرف ہی جا رہے ہیں۔یہ ذرا شورٹ کٹ ہے۔ادھر سے نکلنے کے بعد ہائی وے آئیگا۔''مولانا نے بتایا۔

ٹیکسی چلتی رہی۔اب شہر کا نیم شہری علاقہ شروع ہوگیا تھا۔ایک جگہ مولانا نے ڈرائیور سے کہا''یہاں سے بائیں موڑ کر سیدھے اندر والی گلی میں لے لیجئے۔''

''ادھر کیا ہے؟ کس کے ہاں جا رہے ہیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''یہاں پروفیسر مولانا حکیم کمال الدین صاحب رہتے ہیں یونانی کالج والے۔

ان کا تعلق اسی شہر سے ہے جہاں ہم لوگ جا رہے ہیں۔ ان کو اپنے گھر کے لئے کوئی پیغام دینا ہے۔ وہ لے لیتے ہیں۔ حکیم صاحب کی چائے بھی پی لیں گے۔ اپنی گاڑی ہے کسی وقت بھی پہنچ جائیں گے۔''

جاوید کو پھر الجھن ہوئی۔ یار یہ پہلے بچے کو سیر کروائی ہے۔ اب حکیم صاحب کا پیغام لینا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یہ مولانا کیا کرنے والے ہیں۔ گاڑی پتلی گلی میں گھس گئی۔ اور ایک جھاڑی والے مکان سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ مولانا نے آواز دی پروفیسر حکیم صاحب ہیں کہ نہیں میں پروفیسر مولانا بول رہا ہوں۔ پروفیسر حکیم صاحب آواز دیتے ہوئے باہر آئے۔ سن لیا۔ اچھا آ گئے۔ آیئے آیئے۔ اندر تشریف لایئے۔ یہ وہی حکیم صاحب تھے جو کرتا پاجامہ اور ٹوپی میں یونانی کالج کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔ یہ کالج بحرالاسلام کالج کے پیچھے آدم کیمپس میں تھا۔ جاوید پروفیسر حکیم کے اچھا آ گئے کہنے پر چونکا۔ اسے لگا کہ کہیں پہلے سے ان دونوں میں پروگرام طے تو نہیں تھا۔ ورنہ اچھا آ گئے کہنے کا کیا مطلب۔ چلو دیکھتے ہیں آگے کیا گزرتی ہے۔ حکیم صاحب نے چائے پلائی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔

''آپ کا سامان کہاں ہے؟'' مولانا نے حکیم صاحب سے پوچھا۔

''ہے تیار، کہئے تو رکھ دوں؟'' حکیم صاحب نے کہا۔

''ہاں .... ہاں ڈکی میں رکھ دیجئے۔ ڈکی تو خالی ہی ہے۔''

جاوید کو حیرانی ہوئی۔ اس نے پوچھا ''حکیم صاحب کا سامان ڈکی میں کیوں رکھوا رہے ہیں؟''

''ان کا ضروری سامان ہے۔ گاڑی تو خالی جا رہی ہے۔ اس میں چلا جائے گا۔ اور پیغام بھی دے دیا جائے گا۔'' مولانا نے بتایا۔

جاوید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پانچ چھ سامان کے گٹھر ڈال دیے گئے۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مولانا پچھلی سیٹ پر آ گئے۔ حکیم صاحب کار کے دروازے کے پاس

کھڑے تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

مولانا نے حکیم صاحب سے کہا'' ارے آپ کھڑے کیوں ہیں۔ آیئے اندر آیئے بیٹھئے۔ حکیم صاحب لپک کر اندر آئے اور پچھلی سیٹ پر مولانا کے بازو میں پسر کر بیٹھ گئے۔''

جاوید نے پلٹ کر مولانا کو دیکھا اور کہا'' تو حکیم صاحب بھی جائیں گے کیا؟''

'' ہاں گاڑی خالی جارہی ہے۔ انھیں کے شہر کو جارہی ہے۔ یہ اب بس سے کہاں جاتے۔ دوسے بھلے تین۔ بڑے باذوق آدمی ہیں۔ دیکھئے گا جب یہ باتیں کریں گے تو کتنا لطف آئے گا۔ گل وگلزار شخصیت کے ہیں۔ سفر خوشگوار ہوجائے گا۔ جب یہ گفتگو کریں گے تو آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ سفر کیسے ختم ہوگیا۔ انھوں نے ہماری والدہ کی بھی بڑی خدمت کی ہے۔ بزرگ ہیں کہاں بس میں ہچکولے کھاتے۔ اس لیے میں نے سوچا گاڑی تو خالی ہی جارہی ہے۔ انھیں بھی ساتھ لئے لیتے ہیں۔'' مولانا نے تشریح کی۔

جاوید کو غصہ بھی آیا، ہنسی بھی، افسوس بھی ہوا اور دکھ بھی۔ اب وہ کہے تو کیا کہے اور کرے تو کیا کرے۔ کتنی آسانی سے مولانا نے پہلے ان کے سامان رکھوائے پھر خود انھیں رکھ دیا۔ اور اب صفائی میں دلیلیں دی جارہی ہیں۔ واقعی انھیں تو ٹریول ایجنٹ ہونا چاہئے پروفیسر کیسے ہوگئے۔

کار اپنی منزل کی طرف بھاگتی رہی۔ ڈرائیور خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ پچھلی سیٹ پر پروفیسر مولانا اور پروفیسر حکیم صاحب آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ گل وگلزار شخصیت اور انداز گل افشانئ گفتار کا جاوید انتظار کرتا رہا۔ اگلی سیٹ پر دھوپ سیدھے چہرے پر پڑرہی تھی۔ مالیگاؤں پہنچتے پہنچتے وہ پک گیا۔ دھوپ سے چہرہ سوج گیا۔ کار جب مالیگاؤں میں داخل ہوئی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ مولانا نے ڈرائیور سے کہا پہلے پروفیسر حکیم صاحب کے گھر چلنا ہے۔ انھیں وہاں پہنچا کر ہوٹل جائیں گے جہاں کالج انتظامیہ نے ہم لوگوں کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا ہے۔ گاڑی پروفیسر حکیم صاحب کے گھر کے سامنے جا کر

رکی۔ جاوید پوری طرح جسمانی اور ذہنی طور پر تھک چکا تھا۔ وہ جلد از جلد ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا تاکہ آرام کرے۔ پروفیسر حکیم صاحب نے کہا آپ لوگ یہاں تک آگئے ہیں تو دو لقمہ لے کر جائیے۔ جاوید نے انکار کیا۔ مولانا نے کہا جب یہ اتنی محبت سے کہہ رہے ہیں تو دو لقمہ لئے لیتے ہیں۔ ہوٹل جا کر آرام ہی کرنا ہے۔ سبھوں نے فرشی کھانا کھایا۔ کھانا نہ میٹھا تھا۔ نہ تیز نہ دونوں کا مجموعہ نہ دونوں سے الگ۔ خدا معلوم کچھ تھا جسے کھایا گیا۔ چلتے وقت پروفیسر حکیم نے کہا میں کل صبح ہی حاضر ہوتا ہوں۔

بارہ بجے انٹرویو شروع ہوا۔ کمیٹی میں آٹھ حضرات تھے۔ سب سے زیادہ سوال مولانا نے کئے۔ غالباً یہ ان کی زندگی کی پہلی کمیٹی تھی۔ ایک مضمون کو آپ کیسے پڑھائیں گے۔ کتنے سال پڑھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سارے کے سارے عام سوالات تھے۔ چند ادبی سوالات جاوید نے کئے۔ ایک گھنٹہ تک تین امیدواروں کا انٹرویو ہوا۔ آدھے گھنٹے میں ٹی اے ڈی اے ملا۔ تین بجے دن میں رخصت ہوئے۔

پروفیسر حکیم صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بارہ بجے رات میں رکتے، چلتے، ٹریفک میں اٹکتے پونا پہنچے۔ دوسرے دن کالج میں معلوم ہوا کہ صدر شعبہ نے یونیورسٹی میں شکایت کی ہے کہ اردو سبجکٹ اکسپرٹ کسی عربی پروفیسر کو کیسے بنایا گیا۔ جاوید نے پروفیسر مولانا سے پوچھا کیا کہتے ہیں۔ بولے ارے مجھے یونیورسٹی نے بنایا ہے جب اسے کوئی اعتراض نہیں تو دوسروں کو کیوں شکایت ہے۔

وہ اب بھی لاج (LODGE) میں رہ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کرایے پر فلیٹ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دوستوں کا حلقہ محدود تھا۔ کالج کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے علاوہ کسی اور سے اس کی شناسائی نہ تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ کالج سے ہی تلاش مکان کا آغاز کیا جائے۔ کالج میں ایسے تمام ملنے جلنے والوں کو اس نے بتایا کہ اسے ایک فلیٹ کی سخت ضرورت ہے۔ سننے والوں میں اکثریت ایسے پروفیسروں کی تھی جو اسی شہر کے باشندے تھے یا اس شہر میں پچھلے بیس سالوں سے رہتے آرہے تھے یا جو

اس شہر کے قریبی ضلع سے تعلق رکھتے تھے۔

یوں تو کہنے کو جاوید نے بہتوں سے کہا۔ کسی نے مشورہ دیا اور کسی نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا مگر کیمسٹری کے پروفیسر جہانگیر نے جاوید کو رہائش کے نئے جہانوں کی سیر کرادی۔ جہانگیر صاحب کا قد لمبا تھا۔ چھ فٹ، گول آنکھیں، رنگ سیاہی مائل۔ ٹھڈی پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ جاوید نے ان سے گذارش کی، اپنی مجبوری بتائی یہ بھی کہا کہ میرے لئے کچھ کیجئے۔ جاوید کی بے چارگی سن کر انھوں نے اپنے چہرے پر ایک فلسفی کا تاثر بنایا۔ ایک منٹ تک لیباریٹری کی چھت کو گھورتے رہے جیسے خلا میں چل رہے ہوں پھر آسمان سے زمین پر آئے۔ جاوید کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو جاوید کی طرف سیدھا کرتے ہوئے ایک پہنچے ہوئے انتریامی سادھو بابا کی طرح فرمایا۔

''(بچہ) دیکھو میاں جاوید یہ پونا شہر ہے اسے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہاں کمر ملنا آسان ہے مگر کمرا ملنا مشکل۔ آپ کو شاید نہیں معلوم اس کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ آپ نے ابھی جست لگائی ہے۔ اس کوچے میں قدم رکھا ہے۔ ذرا ان سے پوچھئے جو اس دشت پر خطر سے گذر چکے ہیں۔''

یہ فلیٹ تو گل بکاؤلی میں بدلتا جا رہا ہے فلسفی پروفیسر اسے تاج الملوک کا رول دینے والے ہیں۔ جاوید زیادہ پریشان ہوگیا۔ بابا کوئی راہ نکالئے آپ تو سمسیا کی بکھان لگا رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے فرمایا جاوید صاحب ایسا ہے کہ آپ کل ساڑھے پانچ بجے شام میں کاڈیا کالج کے اسپورٹس گراونڈ میں آجایئے۔ میں آپ کو ایک فلیٹ دکھاؤنگا سستا مضبوط اور آرام دہ۔

جاوید کو حیرانی ہوئی کہ کالج کے اسپورٹس اسٹیڈیم میں یہ کرایے کا فلیٹ دکھائیں گے۔ تعجب ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ خدا معلوم کیا ہونے والا ہے۔ پروفیسر صاحب جاوید کے چہرے کو دیکھ کر بھانپ گئے۔ انھوں نے کہا آپ اسٹیڈیم سے پریشان نہ ہوں۔ دراصل جن صاحب کا فلیٹ میں آپ کو دکھانے والا ہوں ان کا بیٹا اسی کالج میں پڑھتا ہے

اور ساڑھے پانچ بجے وہ اسٹیڈیم گراونڈ میں کریکٹ کی پریکٹس کرتا ہے۔اس سے معلوم کرلیں گے کہ اس کے والد صاحب گھر میں ہیں یانہیں اس کے بعد فلیٹ دیکھنے چلیں گے۔جاوید کوخیال آیا کہ کہیں یہ وہ جگہ تونہیں ہے جہاں انسان آدھا پتھر اور آدھا آدمی اور زمین میں گڑا ہوتا ہے۔خیر اس نے پروفیسر صاحب سے وعدہ کیا کہ کل معینہ وقت پر پہنچ جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ رخصت ہوگیا۔

اتفاق سے دوسرے دن معینہ وقت پر جاوید وہاں نہیں پہنچ سکا جہاں کا وعدہ تھا۔روز وعدہ ایک ایسا ضروری کام آن پڑا کہ ہزار کوشش کے باوجود وہ وقت نہ نکال سکا۔معذرت کے لئے پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا۔انھوں نے ایسی بے رخی دکھائی جیسے وہ جاوید کو جانتے ہی نہ ہوں۔انھوں نے کچھ نہیں پوچھا کہ وہ کل کیوں نہیں ملا۔جاوید کوتو ایسا لگا کہ جیسے پروفیسر صاحب خود ہی کل غیر حاضر تھے۔خیر۔جب وہ زیادہ ہی انجان بننے لگے تو جاوید نے کہا شاید آپ کو یاد نہیں میں جاوید ہوں۔کل مجھے آپ سے اسٹیڈیم میں ملنا تھا لیکن ایک ایمرجنسی کی وجہ میں نہ آسکا۔ یہ سن کر پروفیسر صاحب کے چہرے پر خشوت آئی۔ چہرہ سکڑ گیا پھر ڈھیلا پڑ گیا آنکھیں بھی اسی عمل سے گذریں کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔تب فرمایا دیکھئے جاوید صاحب کل جب آپ نہیں آئے تو اس کے بعد میں نے اس خیال کو ہی اپنے دماغ سے نکال دیا۔اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ کل میں نے آپ سے کیا وعدہ کیا تھا۔

''دراصل کل ایک نہایت ضروری کام اچانک آن پڑا اس لیے میں حاضر نہ ہوسکا'' جاوید نے ملتجیانہ کہا۔

''مگر مجھے تو اب بالکل یاد نہیں۔آپ کے لیے کچھ کرنے کے لئے مجھے دوبارہ اس خیال کو اپنے دماغ میں بٹھانا پڑے گا۔ مجھے پھر سے سوچنا پڑے گا۔دراصل جب کوئی خیال میرے دماغ سے ایک بار نکل جاتا ہے تو اسے دوبارہ لوٹانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔'' انھوں نے کہا۔

جاوید کو غصہ آیا۔نالائق اس طرح اینٹھ اینٹھ کر بات کر رہا ہے جیسے بادشاہ اکبر کا یہی ٹوڈرمل ہے۔لیکن مجبوری تھی کیا کرے۔نہایت خاکساری سے جاوید نے کہا ''پروفیسر

صاحب کچھ کیجئے۔ میں ضرورت مند ہوں اور مجھے رہنے سہنے کی دقت ہو رہی ہے۔''

انھوں نے فرمایا ٹھہریے مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔ میرے پاس وقت ہے یا نہیں۔ جاوید چپ چاپ ایک مہذب طالب علم کی طرح کھڑا رہا اور وہ سامنے کی دیوار کو دیکھتے رہے اور دھیرے دھیرے خود سے بات کرتے رہے۔ کل صبح وہاں جانا ہے۔ دوپہر میں وہاں جانا ہے سہ پہر میں اس سے ملنا ہے شام میں اس سے کام ہے۔ پھر رک گئے اور جاوید سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھئے جاوید صاحب ایسا کیجئے آپ کل شام میں مجھ سے یہیں پر ملئے۔''

''انشاء اللہ حاضر ہو جاؤنگا۔'' جاوید نے فوراً کہا۔

دوسرے دن جاوید معینہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ان کے پاس پہنچ گیا۔

''آپ وقت سے پہلے کیوں آئے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''میں یہاں سے گذر رہا تھا آپ نظر آئے سلام کرنے آگیا۔''

دراصل لمبے کاریڈور سے لگے ہوئے مختلف لکچر ہال اور لیبارٹری بنے ہوئے تھے۔ کاریڈور سے لگ کر ہی ہال کی دیوار اور کھڑکیاں تھیں جن کے کنارے کرسیوں پر پروفیسر بیٹھ کر پریکٹیکل کراتے تھے۔ جاوید جب کاریڈور سے گذر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ پروفیسر کھڑکی کے کنارے کرسی پر بیٹھے ہوئے پریکٹیکل کروا رہے ہیں۔ نظر پڑتے ہی وہ ان کے قریب گیا اور سلام کیا۔ جب انھوں نے اعتراض کیا تو جاوید نے کہا میں ایک گھنٹہ بعد آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کالج کینٹین کی طرف چلا گیا۔

ایک گھنٹہ بعد جاوید پروفیسر کی خدمت میں پھر حاضر ہوا۔ دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھے۔ دس کیلومیٹر جانے کے بعد گاڑی روکی۔ یہ ایسا علاقہ تھا جو آدھا شہر اور آدھا دیہات لگ رہا تھا۔ چھدرے چھدرے کچے پکے مکان، ٹن اور اسبسٹس کی چھت والے چھوٹے چھوٹے مکانوں کا دور دور تک سلسلہ تھا۔ مکانوں کے درمیان اور کنارے کنارے کھیت اور خالی پلاٹ بھی تھے۔ اگر اس علاقے کو ترقی یافتہ گاؤں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایسے ہی

مکانوں کے درمیان ایک بلڈنگ تھی جس میں تین چار فلور تھے۔ پروفیسر صاحب پہلے اپنے فلیٹ میں گئے جو گراونڈ فلور پر تھا۔ چھوٹا سا ڈرائینگ روم تھا جس میں ایک لوہے کی چارپائی تھی۔ چارپائی سے جو جگہ بچتی تھی وہ اندر کے کمرے میں جانے کی راہداری تھی۔ چارپائی پر گندے پرانے کپڑے ادھر ادھر پڑے تھے۔ پروفیسر نے جاوید سے کہا آپ اس پر بیٹھئے میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ انھیں شاید زور کا پریشر آرہا تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ کرتا پائجامہ پہن کر ہاتھ میں چھوٹی سی بالٹی پانی کی اٹھائے اندر کے کمرے سے باہر نکلے اور پھر ڈرائنگ روم سے بھی باہر جانے لگے۔

''حضور کہاں ؟'' جاوید نے پوچھا۔

''بیت الخلا جا رہا ہوں۔ وہ باہر کی طرف ہے۔ گراونڈ فلور کے تمام فلیٹ والے اسی میں جاتے ہیں۔ اچھا ہے۔ ٹھیک ہے۔ کوئی دقت نہیں۔ ہم لوگ پندرہ سال سے اسی میں جا رہے ہیں۔ سب کے بیوی بچے اسی میں جاتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے اور اتنا کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔''

جاوید سوچنے لگا کہ جو فلیٹ اسے دلا رہے ہیں اگر اس میں ایسا عوامی بیت الخلا (جنرل ٹائلٹ) ہوا تو کیا ہوگا۔ مجھ سے تو یہ نہیں برداشت ہوگا۔ دیکھیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ خدا معلوم اس فلیٹ کے چکر میں کیسی کیسی جگہوں کو دیکھنا پڑے گا اور کس کس طرح زندگی گذارنی پڑے گی۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر جہاں ملازم کی رہائش کا انتظام نہ ہو۔ آدمی کی نوکری بھلے ہی معمولی ہو مگر رہنے کا ٹھکانہ تو ہو۔ یہ دربدری تو نہ ہو۔

حاجت ضروریہ سے فارغ ہو کر پروفیسر صاحب ڈرائنگ روم میں آئے۔ چائے پی۔ پروفیسر نے کرتا پائجامہ میں کہا چلئے فلیٹ دیکھنے۔ جاوید ساتھ ساتھ چلا۔ دو فرلانگ پر کاٹج نما اسبسٹس مکانوں کا لمبا سلسلہ نظر آیا جس کی ایک قطار میں پندرہ بیس ایک ایک کمرے والے روم بنے تھے۔ واقعتاً وہ ایک ایک کمرے پر مشتمل دکانوں کا سلسلہ تھا جسے مارکیٹ کے لئے بنایا گیا تھا۔ جاوید نے دیکھا یار یہ تو دکانیں ہیں۔ یہ پروفیسر مجھے کہاں

لے آئے ہیں۔اس میں کیسے رہونگا۔

دونوں ایک کاٹیج کے دروازے پر پہنچے۔کمرا اس پار سے اس پار تک دکھائی دے رہا تھا۔ایک دروازہ ادھر اور دوسرا سامنے ادھر۔دونوں کھلے تھے۔اس لئے ادھر سے ادھر صاف نظر آ رہا تھا۔دونوں دروازے کے درمیان میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بے مصرف سامان پھینکے ہوئے تھے۔

''اس میں غسل خانہ کہاں ہے۔'' جاوید نے پوچھا۔

ایک عورت نے کہا۔''یہ دروازے کے کونے میں کیا ہے؟'' جاوید نے دیکھا چھوٹی دیواروں سے گھیر کر بغیر چھت کا ایک چھوٹا سا غسل خانہ بنا دیا گیا تھا جس میں بہ مشکل ایک آدمی بیٹھکر غسل کر سکتا تھا۔''

''پانی یہاں آتا ہے ؟''

''ہاں کارپوریشن کا آتا ہے اور کبھی نہیں بھی آتا ہے تو ہم لوگ وہاں سڑک پر جو نل ہے وہاں سے لے آتے ہیں۔''

''اور پائخانہ؟'' جاوید نے پوچھا۔

''وہ پائخانہ ہے۔عورت نے دو فرلانگ پر چھوٹا سا ایک کمرا دکھایا۔کہا ادھر کے تمام (چدرے والے کمروں کے) لوگ اسی میں جاتے ہیں۔اچھا ہے ٹھیک ہے۔عورت نے یہ بھی بتایا کہ جب یہاں پانی نہیں آتا ہے تو ہم لوگ وہیں سڑک کے کنارے جو نل ہے وہیں نہا لیتے ہیں۔اس میں بھی کارپوریشن کا پانی آتا ہے۔سب لوگ اس نل اور پائخانہ کی طرف چلے۔پروفیسر نے بتایا یہ پائخانہ ہے۔اسے سب استعمال کرتے ہیں۔اچھا ہے۔کوئی دقت نہیں۔صبح میں چھوٹی سی لائن ہوتی ہے۔اس میں کیا ہرج ہے۔کوئی برائی نہیں۔سب ہی کھڑے ہوتے ہیں۔انھوں نے سڑک کے کنارے والے نل (واٹر ٹیپ) کو بتایا جہاں فرش ٹوٹ پھوٹ کر اکھڑی ہوئی تھی۔چھوٹے چھوٹے گڈھے بنے تھے۔یہ دیکھئے۔کارپوریشن کا نل (واٹر ٹیپ) ہے۔اس میں صبح شام پانی آتا ہے۔ابھی بھی آتا

ہوگا، یہ کہتے ہوئے انھوں نے ٹیپ کو کھولا مگر پانی نہیں آیا۔ مسکراتے ہوئے کہا اس وقت شاید نہیں آرہا ہے لیکن صبح میں ضرور آتا ہے۔

جاوید کو اسبسٹس والے مکان اور ہال نما کمرے کو دیکھکر ایسا لگا جیسے یہاں کبھی گھوڑے باندھے جاتے رہے ہوں۔ جب گھوڑے چلے گئے تو آدمی آگئے۔ بہر حال جاوید کے دل نے فیصلہ کیا کہ یہاں اسے کسی حال میں نہیں رہنا ہے۔ اور وہ دعا کرنے لگا کہ یا خدا کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آج بات ادھوری رہ جائے۔ سب لوگ مکان مالک سے ملنے چلے جو وہیں پر ایک بڑی بلڈنگ کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے شہر کو گئے ہیں۔ رات گئے دیر سے آئیں گے۔ جاوید نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''اس وقت تو ان سے ملنا مشکل ہے۔ میں ایسا کرتا ہوں ان سے رات میں بات کرلونگا اور کل آپ کو بتاتا ہوں۔'' پروفیسر نے کہا۔

''آپ فوراً ان سے بات فائنل نہ کیجئے۔ ذرا کل تک کا انتظار کیجئے کیونکہ پروفیسر جلیل نے ایک اور مکان کے لئے مجھ سے کہا تھا۔ اگر وہاں کچھ ہو جاتا ہے اسے لے لیں گے۔ ورنہ اسے ......''

خدا خدا کر کے کل پر بات ٹل گئی۔ جاوید پروفیسر جہانگیر سے کئی دنوں بعد بھی نہیں ملا۔ وہ بھی سمجھ گئے ہونگے شاید جاوید کو مکان کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ اتنی آسانی سے اس شہر میں مکان ملتا کہاں ہے۔ پروفیسر کا پسندیدہ مکان نہ لے کر جاوید کو بڑا اطمینان حاصل ہوا۔

جاوید نے کالج کے کئی پروفیسروں کو مکان کے بارے میں کہہ رکھا تھا۔ ایک ایک سے پوچھنا شروع کیا۔ معاشیات کے پروفیسر جلیل نے فرمایا۔

دیکھئے جاوید صاحب آپ نے جو مجھے مکان کے لئے کہا تھا تو میں نے ایک صاحب سے کل بات کی تھی۔ بڑے نیک اور مخلص انسان ہیں۔ حاجی ہیں۔ اللہ نے انھیں سب کچھ سے نوازا ہے۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ تو ڈپازٹ (پیشگی رقم) بھی نہیں لیں گے۔ کل میری گفتگو ان سے مسجد میں ہوئی تھی۔ صرف مکان کا کرایہ انھیں چاہئے

کم سے کم ۵۰۰ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار۔ایسا کیجئے آپ آج شام میں ان سے مغرب کے وقت مل لیجئے۔وہیں نماز پڑھئے اوران سے بتایئے کہ گذشتہ شب آپ نے اپنے مکان کے بارے میں پروفیسر جلیل صاحب سے کوئی بات کی تھی۔وہ جان جائیں گے۔اور آپ کا کام ہو جائے گا اور جتنی جلدی ہو آپ نئے مکان میں شفٹ کر جایئے۔

جاوید شام میں حاجی صاحب کے یہاں پہنچا۔وہ گھر سے نکل رہے تھے اور موٹر سائیکل پر بیٹھ چکے تھے۔جاوید نے ضرورتمندوں کی طرح سلام کیا۔انھوں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے جواب دیا اور گفتگو شروع کی۔

''دیکھئے پروفیسر جاوید صاحب کل میری گفتگو آپ کے دوست پروفیسر جلیل صاحب سے ہوئی تھی میں مصروف آدمی ہوں۔میں نے وہ فلیٹ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد حاصل کیا ہے۔بڑے قاعدے کا فلیٹ ہے۔وہاں کسی چیز کی کمی آپ کو نہیں ہوگی۔بیڈروم میں ایک طرف سے دیوار کی جگہ صرف شیشہ ہے جس سے پوری سڑک نظر آتی ہے۔اور سڑک سے وال اور بیڈروم کو دیکھ سکتے ہیں۔اس میں اچھا ہی ہے۔ہوا بھی لگے گی۔میں اس میں ایک گرِل (GRILL) بھی لگوا رہا ہوں۔وہ فلیٹ بہت ہی اچھا ہے۔دن رات میں صرف ایک گھنٹہ پانی آتا ہے۔آپ کے لئے تو یہ بھی کافی ہوگا۔ویسے بھی آپ کو پانی کی ضرورت کیا ہے۔نہانا اور پاخانا۔اس کے لئے تو ایک گھنٹہ کا پانی بہت ہے۔ہاں پینے کا پانی لانے کیلئے ایک کیلومیٹر جانا پڑتا ہے۔تو اس میں کیا ہے کبھی جاتے ہیں یا کسی سے کہئے گا وہ لادے گا۔پچاس روپیہ مہینہ لے گا۔کبھی دیتے ہیں۔دیکھئے پروفیسر صاحب اس علاقے میں آپ جانتے ہی ہیں آجکل فلیٹ کس ریٹ پر دیے جارہے ہیں۔پندرہ ہزار ڈپازٹ سے کم پر تو کوئی بات ہی نہیں کرتا اور ماہانہ پندرہ سو تو دیتے ہی ہیں۔''

اگر یہ اسی طرح بولتے رہے تو خدا معلوم کیا کیا بول جائیں گے۔جاوید نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا'' حاجی صاحب ہمارے پروفیسر صاحب سے غالباً آپ نے جو بات کی تھی اس میں ڈپازٹ کا کوئی ذکر نہ تھا اور کرایہ بھی آٹھ سو تک بتایا تھا۔''

''دیکھیے پروفیسر صاحب آپ جب اتنی گذارش کرتے ہیں تو میں چلئے ڈپازٹ پانچ ہزار کر دیتا ہوں اور کرایہ ایک ہزار۔ایک ہزار پر ہمارے گھر والے اعتراض کر رہے تھے۔میں نے ان سے لڑ کر ایک ہزار کیا ہے ورنہ وہ بارہ سو بتا رہے تھے۔'' حاجی صاحب نے فرمایا۔

''یہ پانچ ہزار کسی طرح معاف نہیں کریں گے؟''

''نہیں اس سے کم کی گنجائش نہیں۔''

''تو کبتک یہ فلیٹ مجھے مل سکتا ہے؟''

''آپ تیسرے دن شام میں آجائیے۔''

جاوید تیسرے دن شام میں حاضر ہوگیا۔فلیٹ میں ان کے ابا اور خسر موجود تھے۔جاوید کو بستر پر بٹھایا گیا۔ایک منٹ بعد حاجی صاحب ملحقہ کمرے سے جلوہ افروز ہوئے۔ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ بڑا سا سادہ کاغذ اور ایک قلم نکالا اور جاوید سے مخاطب ہوئے۔

''پروفیسر صاحب میں آپ کو تفصیل سے اپنے فلیٹ کی روداد بتا دینا چاہتا ہوں۔یہ فلیٹ میں نے ایک لاکھ اٹھاون ہزار روپے میں خریدا۔جس میں ے بہتر ہزار ابھی مجھے دینے ہیں۔'' اس جملہ کو انھوں نے انگریزی میں اس کاغذ پر لکھا۔اس طرح فلیٹ کی پوری روداد انھوں نے کاغذ پر لکھ دی۔اس کا ایریا کیا ہے۔کتنا اسکوائرفٹ ہے۔گرل (GRILL) کتنے میں لگے گی۔بہتر ہزار کی ادائیگی کس کس طرح ہوگی وغیرہ۔پھر انھوں نے چیک بک نکالا اور دو چیک بنائے۔ہر ایک پچیس پچیس ہزار کے اور جاوید سے کہا۔''یہ چیک فلیٹ کے سیٹھ کے لئے ہیں۔جو میں نے دراصل آپ کی خاطر بنائے ہیں۔کل ہمارے خسر یہ چیک سیٹھ کو دے دیں گے اور فلیٹ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔فلیٹ کا باقی روپیہ میں سعودی سے بھیج دونگا۔میں آج ہی رات سعودی جا رہا ہوں۔آپ میرے خسر کے ساتھ اس بلڈر کے پاس جایئے اور آپ بھی ہمارے سسر کو تعاون دیجئے۔آخر سب کچھ تو میں آپ کے لیے ہی کر رہا ہوں۔''

''حضور میں اس میدان میں کورا ہوں۔ بہتر ہے آپ کے سسر جناب ہی اسے انجام دیں اور میں کالج میں ڈیوٹی بھی کرتا ہوں۔''

''خیر ٹھیک ہے۔ ہمارے سسران سے فلیٹ لے لیں گے اور آپ انھیں پانچ ہزار روپے دے دیں گے اور فلیٹ میں شفٹ کر جایئے گا۔''

ان کے سسر نے جاوید سے کہا۔''آپ تیسرے دن مجھ سے ملئے۔''

جاوید تیسرے دن حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی وہ یہاں سے چلے گئے۔ خدا معلوم دنیا سے تو نہیں چلے گئے۔ جاوید کو اندیشہ ہوا۔

جاوید نے خاتون خانہ سے پوچھا۔''کیا وہ میرا انتظار کر رہے تھے یا کچھ کہا؟''

''انھوں نے کچھ نہیں کہا۔''

''اب میں کیا کروں۔''

''آپ کون ہیں؟ آپ کو کیا چاہیے؟''

''میں تین دن پہلے یہاں آیا تھا اور آپ کے فرزند ارجمند کے سامنے فلیٹ کی بات ہوئی تھی۔'' جاوید نے بتایا۔

خاتون نے معاملے کو سمجھتے ہوئے کہا۔''اچھا آپ کو کرایے کا فلیٹ چاہیے۔ تو آپ یہاں سے ایک کیلومیٹر پر اسکول ہے وہاں جایئے۔ اس کے قریب ایک مکان ہے وہاں رشید رہتا ہے اس سے پوچھیے اور یہ لڑکا (ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ان کے خسر کا بیٹا ہے یہ لڑکا وہیں جا رہا ہے آپ اس کے ساتھ ہو لیجیے۔''

عجیب صورت حال ہے۔ اب اگر اس لڑکے کے ساتھ اسکول والے رشید کے پاس جانا ہے تو تین دن والے حاجی صاحب کا کیا ہوا۔ یہ محترمہ مجھے نئے آدمی کے پاس کیوں بھیج رہی ہیں۔ خدا معلوم اس فلیٹ کے چکر میں مجھے کس کس کے ہتھے چڑھنا ہوگا۔ اگر یہی سلسلہ رہا تو میں خود ہی فلیٹ ہو جاؤنگا۔ یہ سب سوچتے ہوئے جاوید اس لڑکے کے اسکوٹر کے پاس گیا۔

لڑکے نے کہا۔ ''میں نے سمجھا کہ تم ڈیکوریٹر ہے۔''

''نہیں میں پروفیسر ہوں۔'' جاوید نے بتایا۔

''تم کو یہاں کیا کام منگتا؟''

''میرے کو ایک فلیٹ منگتا۔''

وہ بولا۔ اچھا وہ فلیٹ کو نڈ واوالا۔ اس کو تو اپن کو جلد ہی لینے کا ہے۔ سالا سیٹھ بدماسی کرے لا۔ اس کو معلوم نہیں اپن کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اپن ایک خون کرکے دبائے لا بیٹھا ہے۔ فلیٹ کا پاوتی دینگا کیسے نہیں اس کا تو باپ دینگا۔ کل ہی چیک لے کر اُدھر جاتا اس کے منہ پر مارتا اور فلیٹ کو لیتا۔ تم ایسا کرو کل اسی ٹائم اِدھر آؤ۔

کل وہاں معینہ وقت پر جاوید پہنچا تو وہ غائب تھا اور ایک دوسرا لڑکا موجود تھا۔ اس نے بتایا ارے وہ سالا سیٹھ چیک لینے کو تیار نہیں۔ اس کو کیش منگتا۔ اب میں جو سب سے بڑا سیٹھ ہے ڈائرکٹ اسی سے ملتا۔ تم ایسا کرو تین دن بعد ادھر کا ایک چکر مارو۔

آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ حاجی بدل گئے۔ رشید آ گیا۔ رشید کی جگہ نیا لڑکا اور اب نئے لڑکے کی جگہ ایک اور نیا لڑکا۔ اور سب کو فلیٹ کی کہانی معلوم ہے۔ جہاں سے ایک چھوڑتا ہے دوسرا پکڑ لیتا ہے اور وہ بھی تیسرے دن بلاتا ہے۔ جاوید کی ہمت نہیں ہوئی تین دن بعد پھر وہاں جانے کی۔ فلیٹ تو ملتا نہیں اور درمیان والے مقام اور آدمی کو بدلتے جارہے ہیں۔ ان کے خطرناک ارادوں کی نئی داستان بار بار کون سنے۔ اگلے تیسرے دن واقعہ سے ملا ہوا واقعہ لے کر بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ اپنی منصوبہ بند داستان کو انجام تک نہیں پہنچاتے تھے۔ دراصل انھیں پلاٹ سازی اور فلیٹ سازی میں مہارت حاصل تھی۔ ایسے ہوتے ہیں ادب سے دور اور پلاٹ سے نزدیک فلیٹ والے اور فلیٹ کے بیوپاری۔ جاوید فلیٹ کا کرایہ اور ڈپازٹ لے کر دروازے دروازے جبہ سائی کرتا رہا مگر جب دو چار قدم رہ جاتے فلیٹ اس سے منہ موڑ کر نکل جاتا۔

یونیورسٹی سے امتحان کا پروگرام آ گیا۔ ہر سال یہ امتحان مارچ اور اپریل کے مہینے

میں ہوتے تھے۔ پہلا سیشن دس سے ایک اور دوسرا دو سے پانچ بجے شام تک۔ تمام پروفیسروں کو ایک ہفتہ پہلے جونیر اور سینیر انوجیلیٹر چارٹ دے دیا جاتا تھا۔ چارٹ ملنے کے ایک گھنٹہ بعد سے ہی پروفیسر ایکدوسرے سے کہنے لگتے کہ دیکھئے مجھے سارے سیشن شام کے دیے گئے ہیں۔ کوئی کہتا یہ کوئی طریقہ ہے مجھے تمام سیشن صبح کے دیدے ہیں۔ کوئی اپنے غصہ کا اظہار اس طرح کرتا کہ دیکھئے چارٹ ہی بنانا تھا تو سب کو آدھے سیشن صبح اور آدھے شام کے دینے چاہئیں۔ معلوم نہیں کون یہ چارٹ بناتا ہے۔ مخاطب پروفیسر کہتا۔ کوئی پرنسپل کا چمچہ ہوگا۔

''ہاں وہی تو اپنے جاننے والوں کو صبح کا دیا ہے اور جو خاموشی سے کام کرتا ہے اسے شام کا سیشن دے دیا ہے۔ یہ بھلا کون سا انصاف ہے۔''

''ارے انصاف کی کیا کہتے ہو یہاں تو روزانہ ایک بار چیمبر میں جاؤ اور ہر کام تمہیں تمہاری مرضی کے مطابق ملنے لگے گا۔''

''یار اس کالج اور انتظامیہ کا تو خدا ہی حافظ ہے۔''

''ہاں انتظامیہ کے چٹوں بٹوں پر ہی تو کالج چل رہا ہے۔''

غرضیکہ اس طرح کے ردعمل امتحان شروع ہونے کے پہلے سے ختم ہونے تک ہوتے رہتے۔ مولانا نے کہا کہ دیکھئے مجھے سارے کے سارے سیشن شام کے دے دیے گئے ہیں۔ اب میں اس درمیان کوئی دوسرا کام شام کے وقت کر ہی نہیں سکتا۔ ایک دن بھی خالی نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے ایک ضروری کام سے باہر بھی جانا ہے۔ ایک پروفیسر نے کہا تم جاکر پرنسپل سے مل لو متعینہ تاریخ کو کچھ ایڈجسٹ کردیں گے۔

مولانا نے پرنسپل کے سامنے اپنی روداد پیش کی۔ پرنسپل نے کہا۔ ''سال میں دوبار امتحان ہوتے ہیں اس میں بھی آپ لوگوں کو کام نکل آتا ہے۔ آپ کے پاس دوسرا کام ہی کیا ہے۔ ذرا دوسرے کالجوں میں جاکر دیکھئے کس طرح پروفیسروں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں تو ذرا ذرا سی بات پر جسے دیکھو چیمبر میں چلا آتا ہے۔ آپ لوگوں کو جتنی آسانی

سے نوکری مل گئی ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ پوری تنخواہ ملتی ہے تین چار گھنٹے کے لیے کالج آتے ہیں بقیہ سارا دن آزاد۔ اسی لیے آپ کو یہ احساس ہی نہیں کہ نوکری کیا ہے اور ذمہ داری کسے کہتے ہیں۔ آپ سے زیادہ اہلیت والے سڑکوں پر ہیں۔ آپ لوگوں کو جتنی سہولت دی جاتی ہے اتنا ہی کاہل بنتے جا رہے ہیں۔''

''سر مجھے ایک ضروری کام سے دلّی جانا ہے۔ یہ پہلے سے طے تھا۔'' مولانا نے کہا۔

''پہلے طے مجھ سے پوچھ کر کیا تھا کہ بتانے چلے آئے۔'' پرنسپل نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر پہلے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس تاریخ میں امتحان ہوگا؟''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ یونیورسٹی آپ سے پوچھ کر امتحان کا پروگرام بنائے۔''

''نہیں سر۔''

''میں کچھ نہیں کرسکتا؟ آپ سینیر سپروائزر سے ملیئے۔''

سلام کر کے مولانا چیمبر سے باہر نکل آئے۔ چہرے پر تناؤ غصہ، جی میں آرہا تھا کہ دل میں جو کچھ ہے اسے پرنسپل کو سنا دے مگر اس سے کام اور بھی خراب ہو جائے گا۔ بہتر ہے سینیر سپروائزر سے مشورہ کرلیں۔ سینیر سپروائزر ریاسط خاں بولے۔

''مولانا صاحب انوبجیلٹر چارٹ میں ڈیوٹی کی جو تاریخیں دی گئی ہیں آپ کو وہ تمام ڈیوٹی کرنی ہیں۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ایک صورت یہ ہے کہ جس تاریخ کو آپ کو چھٹی چاہئے اس کے لئے کسی پروفیسر کو یہاں لے آیئے تاکہ آپ کی جگہ وہ انوبجیلیشن کرلیں۔''

مولانا کئی دنوں تک پروفیسروں کی خوشامد کرتے رہے۔ آخر کار ایک پروفیسر تیار ہوئے اس طرح وہ دلّی کے پروگرام میں شامل ہوسکے۔

کالج کی سہ منزل عمارت میں کل چالیس کمرے تھے۔ دس کمروں میں تین سائنس کے ڈپارٹمنٹ اور لیبارٹیریز تھیں۔ بقیہ تیس کمروں میں لیکچر اور امتحان ہوتے تھے۔

آج سے امتحان شروع ہورہے تھے۔ پہلا دن تھا۔ طالب علم ہر امتحان ہال میں اپنے سیٹ نمبر ڈھونڈ رہے تھے۔ انوبجیلٹر آنسر پیپر لے کر آ گئے تھے۔ گھنٹی بج گئی۔ سوال تقسیم کرنا تھا کہ وہی دونوں شفیق اور جبران امتحان ہال کے دروازے کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ جاوید کو معلوم تھا کہ یہ دونوں پہلے بدمعاش ہیں بعد میں طالب علم۔ اس نے سوچا کہ انھیں نظرانداز کردیں۔ اس لئے جان بوجھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ پروفیسر ان کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ شی شی کی آواز نکالنے لگے۔ اب جاوید نے دیکھا۔ دونوں نے گردن ہلا کر اسے اپنے پاس بلایا۔ جاوید دل ہی دل میں کڑھتا رہا کہ لعنت ہے ایسی پروفیسری پر یہ ملازمت ہے یا غلامی۔ ایک طالب علم اسطرح سے پروفیسر کو بلاتا ہے۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا۔ دل پر جبر کر کے وہ ان کے پاس پہنچا۔ پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

ایک نے کہا۔"ارے ادھر آخری رو میں کنارے میں پیلی شرٹ اور جینز اور کیپ لگا کر جو بیٹھے لا ہے وہ اپنا آدمی ہے اس کا ذرا خیال رکھنا۔ ابھی سے دیکھ لو۔ اس کو تنگ مت کرنا۔ آیا سمجھ میں۔ اپنا بچہ ہے۔ اچھا اپن چلتا ہے۔ ہاں خیال رکھنے کا۔"

یہ کہا اور جاوید کا جواب سنے بغیر دونوں اگلے ہال کے سامنے پہنچے اور وہاں بھی انوبجیلیٹر پروفیسر کو ہال کے باہر بلایا اور وہی نصیحت دہرادی۔ پروفیسروں نے کہا ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ دونوں اگلے ہال کی طرف چلے گئے۔ تمام ہالوں میں دونوں کے دو دو تین تین کسٹمر تھے۔ جاوید ان کے انداز گفتگو اور لب ولہجہ کو سن کر حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ تو پھر اس امتحان کا مطلب کیا ہے۔ چند طالب علم نقل کریں چٹنگ کریں اور بقیہ اپنی یادداشت کو استعمال کریں اور جب رزلٹ آئے تو نقل کرنے والے فرسٹ کلاس اور محنت کرنے والے سکنڈ۔ یہ ناانصافی کیوں۔ جاوید نے طے کیا کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے یہ ناانصافی نہیں برداشت کرے گا۔ آخر وہ انوبجیلٹر ہے۔ اس کی کچھ ذمے داریاں ہیں۔ اگر اس سے سینیر سپروائزر اور پرنسپل اور یونیورسٹی کی فلائنگ اسکوائڈ

نے یہ پوچھا کہ آپ نے اپنی ڈیوٹی سہی طور پر انجام دی؟ تو وہ انھیں اور اپنے ضمیر کو کیا جواب دے گا۔ آخر اسے تنخواہ کس بات کی ملتی ہے۔ وہ طالب علم جس نے رات رات بھر محنت کی ہے ان سے زیادہ نمبر انھیں مل جائیں جنھوں نے رات بھر گپ بازی کی ہے اور ایجنٹوں سے سانٹھ گانٹھ کی ہے۔ نہیں وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں ہونے دے گا۔

سوالات تقسیم کر دیے گئے۔ پندرہ منٹ گذر گئے تھے۔ جو مطالعہ کر کے آئے تھے وہ لکھ رہے تھے۔ جنھوں نے تیاری نہیں کی تھی وہ چپ چاپ بیٹھے تھے یا ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ادھر ادھر دیکھنے والوں میں تین وہ تھے جن کی سفارش شفیق اور جبران کر کے گئے تھے۔ جاوید جب بھی ان تینوں کو دیکھتا وہ اسے دیکھکر بلا ضرورت مسکرانے لگتے۔ گویا وہ اس بہانے فرینک اور بے باک ہونا چاہتے ہوں۔ ایک بار جاوید نے اخلاقاً مسکرا دیا مگر وہ تو بار بار مسکرا رہے تھے۔ جاوید نے آخر کار ان سے کہا کہ اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھو اور امتحان دو۔ پھر بھی ان سنا کر کے وہ تاک جھانک کرتے رہے۔ اب تینوں نے اپنی اپنی چٹ نکالی اور بڑے دھڑلے سے آنسر پیپر کے صفحوں میں رکھکر نقل کرنے لگے۔ جاوید نے دیکھا اور جا کر سب کے چیٹس چھین لیے۔

ایک نے کہا۔ ''سر تم یہ کیا کرتے اپنے بھائی نے تم کو پہلے ہی بولے لا ہے۔ تم کو یاد نہیں کیا؟''

''تم چیٹ نہیں کر سکتے۔'' جاوید نے تحکمانہ جواب دیا۔

''ایسا کیسے تم کو بڑا بھاری پڑے گا۔ تم بھائی کو نہیں جانتے۔''

''میں نے کہہ دیا نہ چپ چاپ امتحان دو۔ دوسرے کو ڈسٹرب مت کرو۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ دو منٹ بعد تینوں نے پھر چٹ نکالی۔ جاوید نے پھر چھین لیا۔ پانچ منٹ بعد پھر نکالی۔ جاوید نے چھین لیا۔ اس طرح چھ سات بار انھوں نے چٹ نکالی اور جاوید نے پکڑ لیا۔ اب ان کے پاس چٹ نہیں تھی۔ پانچ سوال کے چھ سات چٹ لائے تھے۔ سب چھین لیے گئے۔ انھوں نے امتحان کے لئے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ذہن میں

کچھ تھانہیں۔ لکھتے گیا۔

آخر کار ایک گھنٹہ میں ہی تینوں نے اپنی کاپیاں میز پر پٹخ دیں اور جاوید کو آنکھیں دکھاتے ہوئے ہال سے باہر چلے گئے۔ جس انداز میں وہ ہال سے نکلے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ وہ سیدھے دونوں جوڑی دار شفیق اور جبران کے پاس جائیں گے اور جاوید کی شکایت کریں گے۔ جاوید یہ سوچ کر ڈر گیا۔ اس کی رہائش کالج سے سات کیلومیٹر کی دوری پر تھی۔ اگر انھوں نے کالج کے باہر کچھ بدتمیزی کی تو وہ کیا کر سکے گا۔ انتظامیہ سے کہے گا مگر کب جب اسے ذلیل کر دیا جائے گا اور انتظامیہ بمبئی میں رہتی ہے۔ دو سو کیلومیٹر دور۔ اس کے جان پہچان کا ایسا کوئی نہیں تھا جسے وہ ان حالات سے آگاہ کر دیتا۔ جاوید کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ اس نے سوچا سینیر سپروائزر اور پرنسپل سے بتائے گا۔ اب وہ انویجیلیشن کیا کرتا انھیں خیالوں میں الجھ گیا۔ زندگی میں کبھی ایسے حالات سے وہ نہیں گذرا تھا۔ غنڈوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ یہ پہلا تجربہ تھا۔ اب کیا ہوگا۔ وہ دونوں کالج کے باہر کھڑے ہونگے۔ امتحان ختم ہونے پر کالج کا کیمپس طلباء سے بھر جاتا ہے۔ اتنے لوگوں کے سامنے اگر انھوں نے ذلیل کر دیا تو کیا عزت رہے گی۔ جیسے جیسے امتحان کا وقت ختم ہو رہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ گھنٹی بجی۔ امتحان ختم ہوا۔ کاپیاں لے لیں۔ سینیر سپروائزر کے پاس انھیں جمع کر دیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ سکنڈ فلور کے اسٹاف روم سے باہر نکلا۔ سامنے سیڑھی تھی۔ سوچا چلو اب جو ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں ایک طرف سے آئے اور جاوید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جاوید کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یا خدا اب کیا ہوگا۔ آخر یہ آ ہی گئے۔ وہاں پر اور کوئی نہ تھا۔ جاوید کو ایک کنارے لے گئے جہاں سے اسٹاف روم کے اندر کا کمرا دکھائی دے رہا تھا اور سینیئر سپروائزر امتحان کی کاپیاں جمع کر رہے تھے۔

''سر تم نے اپنے بچے کو پریشان کیا۔ تم کو اپن نے پہلے ہی بولا تھا۔ ایسا تم کو ٹھیک لگتا کیا؟'' شفیق نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔

جاوید گھبرا رہا تھا کہ اس کا جواب کیا دے۔ وہ تینوں لڑکے بھی ان کے پیچھے

کھڑے شوخی سے دیکھ رہے تھے۔

''نہیں میں نے کیا کیا۔ میں نے اپنی ڈیوٹی کی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ہال میں کوئی چیٹنگ نہیں ہونی چاہیئے ورنہ انویجیلیٹر ذمہ دار ہوگا۔ مجھے اپنے سپروائزر کی بات تو ماننی ہی پڑے گی نا۔''

''اور اپن کی بات کا کیا ہوئے گا۔'' ابتک اس نے جاوید کا ہاتھ پکڑ ہی رکھا تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اسے دوسرے کنارے میں لے گئے۔

جاوید کا دل دھڑک رہا تھا۔ پسینہ آنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب زدوکوب ہونے ہی کو ہے۔

''تم کو کس سپروائزر نے بولا کہ چیٹ نہیں کرنے کا؟'' جبران نے پوچھا۔

وہ جو کاپیاں جمع کررہے ہیں۔ جاوید نے اسٹاف روم کے اندر والے کمرے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

اس نے سینیر سپروائزر ندرت اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔'' وہ بھکاری نمبرون۔ نہ مکان اپنا، نہ کھانا اپنا، نہ اسکوٹر اپنا سب مانگے کا ہے اس کا۔ وہ تو اپنی عزت ایمان اور شرافت سب بیچ کے بیٹھے لا ہے۔ اس سے پوچھو کہ اس کے بدن پر جو کپڑا ہے وہ کیا اس کا ہے یا اس کے باپ نے دیے لا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ نیچے سے اوپر تک اس کے باڈی پر جو کپڑا ہے وہ کس کے پیسے کا ہے۔ اس کو بنیان اور انڈرویر بھی دوسرے نے دیئے لا ہے۔ میں بولتا اس کو جا کر بولو۔''

اس نے یہ باتیں بلند آواز میں کیں۔ سینیر سپروائزر نے شروع سے آخر تک ایک ایک لفظ بیٹھے بیٹھے سنا۔ جاوید اور ان سب کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکراتے ہوئے پھر کاپیوں پر دستخط کرنے لگے جیسے اُنہوں نے کچھ نہیں سنا۔ جاوید نے سوچا کہ اتنی سخت گالی دی گئی ہے اس لیے وہ اٹھ کر یہاں آئیں گے دوٹوک جواب دینگے اور ان دونوں کی سرزنش کرینگے لیکن وہ انتظار کرتا ہی رہ گیا ان کا اٹھنا تو دور انہوں نے دوبارہ باہر کی طرف دیکھا

بھی نہیں۔ جاوید کی پریشانی اور بڑھ گئی کہ سینیئر سپروائزر نے جب ان کی گالیوں کا کوئی جواب نہیں دیا تو اب مجھے ذلیل وخوار ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اب میری بے عزتی میں کوئی شک ہی نہیں۔ اب میرا رسوا ہونا طے ہے۔ یا خدا تو ہی شاید بچادے تو بچادے ورنہ یہاں پر تو کوئی اور امید نہیں ہے۔ اب تک شفیق نے جاوید کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین اسی وقت پرنسپل سیڑھیوں سے اوپر آتے نظر آئے۔ اس نے جاوید کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایسا ظاہر کیا جیسے یونہی آپس میں بات کر رہے ہوں۔ پرنسپل کو دیکھتے ہی جاوید کو حوصلہ ملا۔ اس نے سوچا یہی موقع ہے سب کچھ ان کو بتا دیتے ہیں۔ ابھی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ کل واقعہ پرانا ہو جائے گا۔ پرنسپل بھی کہیں گے کل میں ادھر گیا تھا تو کیوں نہیں بتایا۔ وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ شفیق اور پرنسپل مسکرا مسکرا کر بات کرنے لگے۔ جاوید کی ہمت پست ہوگئی۔ سینیئر سپروائزر نے بھی جان بوجھ کر اس کی گالیوں کو نہیں سنا تھا۔ یہاں پر تو ہم شکایت کر دیں گے۔ پرنسپل یہ بھی کہیں گے کہ درخواست دے دو۔ پھر گواہ طلب کیا جائے گا۔ کون میری گواہی دے گا اور جو گواہی دے گا کیا اس کو یہ بدمعاش چھوڑ دے گا۔ درخواست دینے سے یہ میرے پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ جہاں تہاں مجھے پکڑے گا اور انتقام لے گا۔ اس اجنبی شہر میں میری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ یہ تو مقامی ہے۔ اس لیے بہتر ہے خاموش ہو جاؤ۔ نہیں معلوم ایسے واقعات یہاں کتنی بار ہوتے ہیں۔ اگر بار بار ہوتے ہیں تو کتنی درخواست دو گے۔ کتنے گواہ لاؤ گے۔ کیا تم کالج کی اصلاح کرنے آئے ہو اکیلے تنہا جو کہ ناممکن ہے۔ اپنے غصہ کو پیتے ہوئے موقع غنیمت دیکھ کر جب پرنسپل اور شفیق محو گفتگو تھے جاوید چپکے سے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ کیمپس سے باہر نکلا تیزی سے بس اسٹینڈ کی طرف جانے لگا۔ کئی بار پلٹ کر دیکھا کہ کہیں وہ ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ کالج سے بس اسٹینڈ پندرہ منٹ پیدل کے فاصلے پر تھا۔ آج تیزی سے چلتا ہوا دس منٹ میں پہنچ گیا۔ بس آئی۔ اندر جا کر ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس اسٹارٹ ہوگئی۔ اب آہستہ آہستہ اس کی جان میں جان آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ بچ گیا ورنہ آج نہ معلوم کیا ہونے والا تھا۔ وہ سوچنے لگا اس حالت

میں کالج کی نوکری کرنی پڑے گی بہ حیثیت پروفیسر تف ہے۔ خدا معلوم آئندہ اور کیا کیا ہونے والا ہے۔ یہ میں کہاں سے کہاں آ گیا کیا جائے۔ دوسرا کوئی متبادل بھی تو نہیں۔ کدھر جایا جائے۔ مجھے جانتا کون ہے۔ آجکل ملازمت بنا تعلقات اور لین دین کے ملتی کہاں ہے۔ میرے پاس اتنے روپے بھی نہیں۔ تعلقات بھی نہیں۔ پھر اور کیا ہوسکتا ہے۔ نوکری چھوڑ کر بھی نہیں بیٹھ سکتے۔

دوسرے دن جس ہال میں جاوید کی ڈیوٹی دی گئی اس میں کوئی اور انویجیلیٹر نہیں تھا تنہا جاوید ہی تھا۔ سوال تقسیم ہونے کے پہلے پھر کل والے شفیق اور جبران دونوں آ گئے۔ دونوں نے جاوید کو ہال کے باہر کوریڈور میں بلایا اور کہا۔ ''وہ سامنے سکنڈ روم (ROW) میں اپنا بچہ بیٹھے لا ہے اس کو ڈسٹرب مت کرنا جو کرے کرنے دینا ورنہ کل تو چھوڑ دیا آج دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ تم سوموار پیٹھ میں رہتے ہو نا؟''

یہ گذارش نہیں تھی بلکہ کھلی ہوئی دھمکی تھی اور جائے رہائش کا نام لے کر یہ بتانا چاہا کہ ہم جانتے ہیں کہاں رہتے ہو۔ کالج سے رہائش تک تمہارا پیچھا کریں گے۔ بچ نہیں سکتے۔

جاوید نے کہا۔'' ہاں ہاں ٹھیک ہے آپ لوگ جایئے۔''

جس وقت دونوں جاوید کو دھمکی دے رہے تھے اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا۔ جی میں آیا کہ ان دونوں کے منہ پر زور سے دو طمانچے لگائیں تا کہ آئندہ پھر ایسی جرأت نہ کرسکیں لیکن مجبوری تھی۔ اس کا غصہ کم نہیں ہوا۔ اس کا ایک بچہ جو چاہے کرے چاہے جیسے لکھے کتاب دیکھ کر لکھے یا چٹ سے نقل کرے اور بقیہ پچاس کے لئے سخت امتحان۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ گویا پچاس کی محنت اور مطالعے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک نقل کرے اور پچاس اپنی آنکھوں کی نیند برباد کر کے رات رات بھر مطالعہ کر کے امتحان دے اور جب نمبر آئے تو نقل کرنے والے کو زیادہ اور شب بیداری کرنے والوں کو کم۔ اپنی آنکھوں کے سامنے میں ایسا ہونے نہیں دونگا۔ آج جو ہونا ہے ہو جائے۔ دیکھتا ہوں دونوں کا اکلوتا کیسے نقل کرتا ہے۔ جاوید کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

سوالات تقسیم ہو گئے تھے۔ جاوید کی نگاہ ہر طرف چیل کی طرح گردش کر رہی تھی۔ آج کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ چار پانچ کے سوائے سب لکھنے میں مصروف تھے۔ جاوید ہال میں چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی سامنے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بیٹھا۔ کاپیوں پر دستخط کرتے ہوئے بھی اس کی نظر ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ شفیق کا بچہ پریشان تھا جیسے بینچ پر بیٹھے بیٹھے کروٹیں لے رہا ہو۔ وہ بار بار جاوید کو دیکھتا اور مسکراتا تاکہ جاوید بھی مسکرائے اور وہ نقل کرنا شروع کر دے لیکن جاوید نے جب اس کو دیکھا تیکھی نظروں اور سخت چہرے سے اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ چٹ نکالے اور جب تک چٹ نہیں نکلے نقل کیسے ہوتی۔ جاوید ہال کے دروازے کی طرف آہستہ آہستہ جاتا اور پھر پلٹ کر میز تک آجاتا۔ درمیان سے دروازے تک آنے جانے کی جگہ تھی اور دونوں طرف بینچ اور ڈسک پر امتحان ہو رہا تھا۔ ایک بار جاوید دروازے کی طرف جا رہا تھا اب اس کی پشت اس بچہ کی طرف تھی جس کے لئے شفیق نے دھمکی دی تھی۔ جاوید دروازے سے پلٹا تو دیکھا کہ وہ بچہ (بی کام کا طلب علم) شرٹ کے اندر سے کچھ نکالا اور کسی کاغذ کو شرٹ کے اندر رکھ رہا تھا۔ عین اسی وقت تیزی سے جاوید اس کے پاس پہنچا اور اس کی کاپی اور کاغذ دونوں چھین لیئے۔ دیکھا کہ اس کے پاس دو آنسر پیپرس ہیں۔ آج کا آنسر پیپر بالکل خالی تھا۔ کوئی جواب نہیں لکھا تھا۔ دوسرے آنسر پیپر میں تمام سوالوں کے جواب لکھے تھے۔ دراصل گھر سے لکھے ہوئے آنسر پیپر کو وہ جمع کر رہا تھا اور آج کے خالی آنسر پیپر کو شرٹ کے اندر ڈال رہا تھا۔ جاوید کو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے کہا تم پہلے سے دوسرے آنسر پیپر میں سارے جواب لکھ کر لائے ہو۔ تم پر اب جعلسازی کا کیس بنے گا۔ یہ سنتے ہی جاوید کے ہاتھوں سے اس نے خالی آنسر پیپر کو جھٹکا اور دوڑتے ہوئے ہال سے باہر بھاگا۔ جاوید نے اس کا پیچھا کیا مگر وہ تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ بازو کے کمرہ میں ہی اسٹاف روم میں اکزامیشن سینٹر تھا۔ سینئیر سپروائزر آگئے۔ جاوید نے روداد سنائی۔ سپروائزر وہ آنسر پیپر لے کر چلے گئے۔

فائنل گھنٹی بجی۔ اکزام سینٹر میں کاپیاں جمع کر کے وہ سکنڈ فلور سے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ فرسٹ فلور کی سیڑھی پر وہ جیسے ہی پہنچا وہی بچہ طالب علم تین اور طالب علموں کے ساتھ کسی طرف سے آیا اور اس کو دائیں بائیں سے گھیر لیا۔ بچہ بولا۔

''سر تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''وہی تم نے آنسر پیپر بدلنے کیوں نہیں دیا؟''

''یہ امتحان ہے یا گھر ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا۔''

''آنسر پیپر بدلتا تو تمہارا کیا جاتا؟''

''امتحان میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ تو چیٹنگ ہے۔''

گراونڈ فلور پر چاروں آ گئے۔ ہر طرف طالب علم کی بھیڑ تھی۔ تو اپنے کو بڑا ہوشیار سمجھتا ہے۔ مغلظات بکتے ہوئے اس نے جاوید کے پیٹ میں ایک گھونسہ مارا۔ جاوید کو بھی غصہ آیا۔ تم گنوار، جاہل وحشی ہو۔ یہ کہتے ہوئے جاوید نے اس کے سینے پر دو گھونسے لگائے۔ اب اس کے دوستوں نے ہاتھ اٹھائے۔ گویا چوکھی لڑائی ہونے لگی۔ قریب کے طالب علموں نے دیکھا۔ سب بھاگتے ہوئے آئے۔ جاوید کو الگ کیا۔ ان کو بھی ایک طرف لے گئے۔ جاوید سکنڈ فلور پر ایکزام سپروائزر کے کمرے میں گیا اور جھگڑے کی رپورٹ کی۔ وہاں پر ایک سپروائزر اکسٹرنل بھی تھا۔ اس نے کہا آپ درخواست میں پوری تفصیل لکھ کر دیجئے۔ ہم لوگ اسے پرنسپل اور یونیورسٹی کو بھیجیں گے۔ جاوید نے درخواست ان دونوں سپروائزر کے حوالے کی اور کہا کہ میں گھر کیسے جاؤں گا۔ وہ اسٹوڈنٹ اپنے گروہ کے ساتھ کیمپس سے باہر کھڑا ہوگا۔ میری سیکیوریٹی کا انتظام کیجئے۔ سپروائزر نے کالج آفس میں رجسٹرار کو فون کیا۔ سپروائزر نے کہا رجسٹرار صاحب نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جاوید ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سکنڈ فلور سے نیچے اترا۔ گراونڈ میں گیا تو رجسٹرار نے کہا آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ نیچے کالج گراونڈ میں اپنے اسکوٹر پر بیٹھے تھے۔ ان کے

قریب ہی وہ بچہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ جاوید اسکوٹر پر بیٹھ گیا۔ رجسٹرار نے مسکراتے ہوئے بچہ سے کہا ارے لطیف تم یہ سب کرتے ہو۔ ایسے کہا جیسے کوئی اپنے پرانے دوست سے بے تکلف بات کر رہا ہو۔ لطیف مسکراتا رہا اور غصہ سے جاوید کو دیکھتا رہا۔ جاوید نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ رجسٹرار نے جاوید کو بس اسٹینڈ تک پہنچا دیا۔ انھوں نے جاوید سے ہمدردی کا ایک لفظ نہیں کہا اور نہ ہی آج کے واقعہ پر اظہار افسوس کیا۔

آج شام جب جاوید اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو جیسے ہر چیز اسے اجنبی نظر آ رہی تھی۔ اتنے برسوں کی خدمت کا یہ صلہ۔ اس کا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ استعفیٰ پیش کر دیا جائے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ چلو اپنے لئے کہیں کچھ ہو جائے گا افراد خانہ کی ضروریات کیسے پوری ہونگی۔ کوئی رشتہ دار بھی ایک پیسہ کی مدد نہیں کر سکتا۔ غیروں کا کیا بھروسہ۔ لیکن اس کالج میں کب تک بے عزت ہوتے رہیں گے۔ وہ درخواست کا کیا ہوگا۔ جس اپنائیت سے رجسٹرار نے لطیف سے بات کی یہ احساس ہوا کہ وہ رجسٹرار کا اپنا ہے اور میں غیر۔ وہ اسکے وطن کا ہے اور میں دوسری ریاست کا۔ جاوید کی شکایتی درخواست کا انجام اسی وقت معلوم ہو گیا۔ اور ہفتوں بعد بھی درخواست کا کچھ نہیں ہوا۔ ٹائیں ٹائیں فش۔

جاوید نے اپنی یونیورسٹی کے استادوں کو لکھا کہ یہاں میری طبیعت نہیں لگ رہی ہے۔ روز بروز جو ٹوٹی پھوٹی صلاحیت ہے وہ ضائع ہوتی جا رہی ہے۔ وائس چانسلر اور گورنر سے آپ کے نہایت قریبی تعلقات ہیں۔ ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ تحائف کا لین دین ہے۔ آپ لوگ جہاں ہیں وہاں ظاہر ہے سب کے سب باصلاحیت، دانشور اور شاعر و نقاد ہیں۔ انھیں کے درمیان اگر مجھ جیسا ایک بیوقوف بھی ہو تو جب دانشوروں کو تفریح کی سوجھے گی تو ہمیں یاد کریں گے۔ ایک شخص ایسا بھی ہونا چاہئے اور اس کے لیے ہم سے اچھا اور کون ہو سکتا ہے۔ چودہ سال میں تو رام کا بن باس بھی ختم ہو گیا تھا ہمیں تو پندرہ سال ہو گئے نہ جانے میرا بن باس کب ختم ہوگا۔

استاد نے جواب لکھا تم ایسی باتیں لکھتے ہو تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ جس جگہ آدمی

رہتا ہے وہاں دوست بھی بناتا ہے۔تم بھی ایسا کرو۔اور یہاں تم جیسے بیوقوف کی بھی گنجائش نہیں ہے۔جبکہ ریڈیو، اخبار، ٹی وی، مشاعرے کے شاعر یونیورسٹی کے شعبہ میں استاد بنتے رہے ترقی کرتے رہے۔مشہور ہوتے رہے۔ظاہر ہے ریڈیو، اخبار، ٹی وی والوں نے انھیں اپنے اسٹوڈیو میں بار بار بلایا تھا۔انٹرویو پیش کیا تھا۔اخبار میں روداد شائع کی تھی۔اس لیے ریڈیو، ٹی وی اور اخبار و والوں کو شعبے میں لے آئے۔وہ جس نے یہاں سے ایم۔اے، ایم۔فل، پی ایچ۔ڈی کیا، ٹاپ کیا اور کالج میں لکچر رہے اسے شعبے میں لاکر کیا ملے گا۔اسے نصیحت دیتے رہو کہ تمہارے لئے کالج ہی بہترین جگہ ہے۔

آخر کار جاوید نے اپنوں سے ہدایت لینا بھی چھوڑا اور یہ فیصلہ کیا کہ اب جو کرنا ہے اپنی ہدایت اور اپنے مشورے سے۔اگر ایسوں سے مشورہ لیتے رہے تو یہ زندگی بھر تم کو مشورہ دیتے رہیں گے کہ جہاں ہو وہیں سب کچھ کرو۔جاوید نے طے کیا کہ جہاں بھی آسامی آئے درخواست دو اور انٹرویو کا سامنا کرو۔ہندوستان میں جہاں بھی موقع ملے وہاں جاؤ۔خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ہدایت کرنے والے ایک ہی نہیں ہوتے۔انشاءاللہ کوئی نہ کوئی راستہ کہیں تو نکلے گا۔اپنی محنت، ہمت، اعتماد اور بائیوڈیٹا کو اور بھی مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔

اگلے روز امتحان سے پہلے جاوید چند دوست پروفیسروں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا جاوید نے کہا بھئی عادل صاحب یہ جو بدمعاش طالب علموں کا گروہ یہاں گھومتا رہتا ہے ان کا کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہیں ہے؟

عادل نے بتایا آپ کو نہیں معلوم ہے۔یہ گروہ کالج آفس سے سانٹھ گانٹھ رکھتا ہے۔۹۰ فی صد پروفیسران کی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔اس لیے تو انھیں امتحان سے پہلے سوالات مل جاتے ہیں۔امتحان ہال میں جو غیر تدریسی اسٹاف سیٹ نمبر لکھتا ہے یہ اسے پیسے دے کر اپنی پسند کے مطابق ہال میں ایک کنارے کا سیٹ نمبر لکھواتے ہیں تاکہ چٹنگ کرنے میں آسانی ہو۔امتحان کے بعد پروفیسروں سے نمبر بڑھواتے ہیں اور یہی گروہ

پروفیسروں کو ٹیوشن کے لئے اسٹوڈنٹس بھی فراہم کرتا ہے۔ پروفیسروں کے سرکاری دفتروں کے کام کروادیتا ہے۔ اس لیے پروفیسر بھی ان کی گذارش کا خیال رکھتے ہیں۔ زیادہ تر پروفیسروں سے اس کا یارانہ ہے۔ چائے سے لے کر کھانے پینے تک کا بھی ساتھ ہے۔

آج امتحان کا تیسرا دن تھا۔ کیمپس میں طالب علموں کی بھیڑ تھی۔ ابھی امتحان شروع ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ جاوید کالج میں داخل ہوا۔ طلباء کی بھیڑ سے بچ بچ کر وہ گراونڈ میں جارہا تھا کہ اسے کار کے ہارن کی آواز سنائی پڑی۔ وہ چونک گیا اور اتنے مجمع میں موٹر گاڑی کدھر سے اور کیوں آئے گی۔ اس نے پیچھے مڑکر دیکھا تو ماروتی ۸۰۰ اس سے سائڈ مانگ رہی تھی۔ وہ کنارے ہوگیا۔ گراونڈ میں ایک کنارے کار کھڑی ہوگئی۔ جاوید نے سوچا کوئی وی آئی پی یا یونیورسٹی کا افسر ہوگا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کار کا دروازہ کھول کر جو شخص کھڑا ہوا وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی شفیق نام کا بدمعاش طالب علم تھا۔ خدا معلوم آج کار میں بیٹھ کر نہ جانے کس کو بے عزت کرے گا۔ یہ سوچتے ہوئے جاوید امتحان سپروائزر کے کمرے میں گیا اور آنسر پیپر لے کر امتحان ہال میں تھرڈ فلور پر انویجیلیشن کے لئے پہنچ گیا۔

امتحان شروع ہوگیا۔ پانچ منٹ بعد جاوید نے تھرڈ فلور سے نیچے جھانکا کہ آیا وہ کار ہے یا چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ کار کے اندر اگلی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر لڑکے امتحان دے رہے ہیں۔ امتحان ہال کو چھوڑ کر کار میں جوابات لکھے جارہے ہیں۔ کار میں کتابیں موجود تھیں۔ چار لڑکے بڑی ہوشیاری سے آنسر پیپر پر جواب لکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ میں سارے جواب لکھ دیے گئے۔ ایک لڑکے نے چاروں آنسر پیپرس ہال میں طالب علموں کو پہنچادی جنھوں نے اپنے سامنے ڈسک پر رکھے ہوئے خالی آنسر پیپر کو اپنی جیب میں رکھا اور نقل شدہ آنسر پیپر انویجیلیٹر کو دے دیں۔ امتحان شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد ہی سوال اور کاپی دونوں نیچے کار میں بھجوا دیے گئے تھے اور ڈسک پر دوسرا آنسر پیپر یونہی رکھ چھوڑا تھا تا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ ایک گھنٹہ میں شفیق نے اپنا کام پورا کیا اور ان چاروں لڑکوں کو کار

میں بٹھا کر کیمپس سے باہر چلا گیا۔ تین گھنٹے بعد جب امتحان ختم ہوا تو وہ کار پھر اندر آئی اور اس کے پاس طالب علموں کا جمگھٹ ہو گیا۔ قہقہے شروع ہو گئے۔ امتحان شروع ہوا ختم بھی ہو گیا۔ کار والے تماشہ دکھاتے رہے۔ پرنسپل اپنے آفس میں اور تین تین وائس پرنسپل اپنے اپنے دفتروں میں بیٹھے رہے۔ کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اندھیر نگری چوپٹ راجا میری حیثیت تو نقار خانے میں طوطی کی آواز جیسی ہے۔ یہاں رہنا ہے تو یہاں کے پروفیسروں کے طرح پڑھاؤ، انھیں کیطرح انوبجیلیشن کرواور اپنی عزت بھی بچاؤ۔ امتحان کے پہلے کلاس لیتے ہوئے پروفیسر سرمد نصیر اپنی عزت بھی نہ بچا سکے۔ جبران نام کے طالب علم نے پروفیسر سرمد (STATS) کو لیکچر ہال میں گھس کے رسوا کیا۔

جاوید کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ ساڑھے دس بجے کی کلاس تھی۔ گھسے پٹے آثار قدیمہ کے نوٹس کو اپنی جیب سے نکالا اور روزمرہ کی طرح طلباء کو نقل کرادی۔ جاوید نوٹس کو پڑھکر بولتا گیا اور لڑکے لڑکیاں نقل کرتے گئے۔ دراصل شروع شروع میں جاوید نے موضوع کے لحاظ سے لیکچر دیا تھا۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ طلباء کی تعداد کلاس میں کم ہوتی گئی۔ جاوید کو تعجب ہوا کہ وہ ہر رات لیکچر کی تیاری کرتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ طلباء کلاس سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ معلوم ہوا وہ اس لیے اتنے زور وشور سے تعداد میں کم ہوتے جارہے ہیں کہ وہ لیکچر دیتا ہے اور طلباء سے سوال بھی کرتا ہے۔ جاوید نے صدر شعبہ، دوسرے پروفیسر اور طلباء سے بھی اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ آپ غلط فہمی کے شکار ہیں۔ آپ کے لیکچر میں کوئی عیب نہیں۔ دراصل آپ کے طرز تدریس میں نقص ہے۔

''کیا مطلب؟'' جاوید نے پوچھا۔

''جناب یہ آپ کا لیکچر دینا اور رات رات بھر اس کی تیاری ان عادتوں سے باز آجایئے۔ صحیح طریقۂ تدریس یہ ہے کہ موضوع سے متعلق نوٹ بنایئے اور کلاس میں اس کی نقل کروا کر باہر آجایئے۔ آپ کو بھی آسانی اور طلباء بھی خوش۔''

اس کے بعد جاوید نے یہی اسلوب تدریس اپنالیا۔ اب کلاس میں بہت کم

جگہیں خالی رہتی تھیں اور طلباء بہت ہی مسرور اور ملتفت نظر آتے۔ وہ اپنے بنائے نوٹس کی نقل بڑے انہماک سے کرا رہا تھا۔ پوری کلاس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کلاس روم کے دونوں دروازے بند تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا ایک پروفیسر محترمہ نے جاوید کو ایک منٹ کے لئے کلاس روم سے باہر بلایا۔

''کہئے کیا بات ہے؟'' جاوید نے پوچھا۔

''جناب کلاس چھوڑ دیجئے۔ پرنسپل کے کمرے میں ایک میٹنگ ہو رہی ہے۔ تمام پروفیسر پہنچ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک پروفیسر کے ساتھ کسی طالب علم نے دشنام طرازی اور دست درازی کی ہے۔ اسی سلسلے میں میٹنگ ہو رہی ہے۔ آپ تشریف لے چلیں۔'' محترمہ نے کہا۔

جاوید نے طلباء سے بتایا کہ پروفیسروں کی میٹنگ ہو رہی ہے اس لیے بقیہ نقل نوٹس دوسری کلاس میں دوسرے دن کرا دی جائے گی۔

وہ پرنسپل کے وزیٹرس روم میں پہنچا۔ ان دنوں شیخ بابولعل پرنسپل تھے۔ وہاں جم غفیر تھا۔ ادھر ادھر پروفیسروں کا حلقہ حلقہ بگوش تھا۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کچھ پروفیسر پرنسپل کے کمرے میں تھے۔ کچھ کارویڈور میں کچھ کیمپس کے گراونڈ میں۔ سب کے سب آہستہ آہستہ گفتگو میں محو تھے۔ جاوید کو احساس ہوا کہ شاید یہاں بھی کلاس میں نقل نوٹس لکھوانے والوں کا پرسکون ماحول قائم ہے۔ جاوید نے ایک صحتمند، لمبا قد، چھوٹے بال اور چھوٹی آنکھوں والے پروفیسر سے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟''

پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو معلوم نہیں۔ یہ کالج بدمعاشوں کا اڈہ بن گیا ہے۔ یہاں کا ماحول اب ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کسی کا ساتھ دینے والا نہیں۔''

آخر کیا ہوا؟ جاوید نے پھر پوچھا۔

پروفیسر نے کہا۔''چند روز پہلے پروفیسر سرمد نصیر کلاس لے رہے تھے۔کلاس روم کا دروازہ کھلا تھا۔دروازے کے ٹھیک سامنے گراونڈ میں کچھ لڑکے شوروغل کر رہے تھے۔پروفیسر نے انھیں منع کیا کہ یہاں پر شور نہ کریں۔یہ سن کر کچھ لڑکے تو چلے گئے لیکن جو رہ گئے وہ اور زیادہ شور کرنے لگے۔پروفیسر کلاس لیتے رہے۔ایک طالب علم جس کا نام جبران تھا وہ کلاس روم کے دروازہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کلاس کے تمام طالب علموں کے سامنے پروفیسر کو ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔اتنا ہی نہیں وہ کلاس روم کے اندر گھس گیا اور ان کی ٹائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے کلاس روم سے باہر اس طرح لایا جیسے جانور کو رسی سے کھینچتے ہیں۔ان کی شرٹ پھاڑ دی۔وہ اس انتظار میں تھا کہ پروفیسر کچھ بولے تو پٹائی شروع کریں مگر وہ خاموش رہے۔اتنے میں وائس پرنسپل تونڈوال موقعہ واردات پر آ گئے۔ان کے آتے ہی جبران نے جو ابتک سخت وست بولتا جا رہا تھا پروفیسر کی گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا کہ تم میرا کیا کر سکتے ہو۔ذرا باہر چلو تمہیں بتاتا ہوں۔وائس پرنسپل دیکھتے رہے۔ان کے منہ سے ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہوا۔اور جبران خراماں خراماں پاس کھڑے ہوئے دوستوں کے درمیان جا کر قہقہہ لگانے لگا جو پہلے سے ہی اس تماشا سے محظوظ ہو رہے تھے۔
اب آپ ہی بتایئے اس حالت میں کس طرح پروفیسر یہاں رہ پائیں گے؟''

اسی اثناء میں ایک اور پروفیسر قریب آ گئے اور کہا جناب اس نازیبا حرکت کے لئے کوئی سخت کاروائی ہونی چاہئے۔اس لڑکے کو اس کالج کے کیمپس میں قدم نہ رکھنے دیا جائے۔ایک پروفیسر جو وہیں پر کھڑے تھے یہ سن کر انھوں نے کہا بھئی اس لڑکے نے ایک ہفتہ پہلے میرے ساتھ بھی بدتمیزی کی تھی۔میں نے اپنی حد تک اپنی محافظت کی۔لیکن جب وہ اپنے گروہ کو لے کر میری کلاس میں آ گیا اور سبھوں کے سامنے مجھے ذلیل کیا تو مصلحتاً میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔میں نے پرنسپل کو اطلاع دی۔انھوں نے کہا کہ وہ اس کے خلاف سخت کاروائی کریں گے۔

جاوید نے دیکھا کہ مختلف ٹکڑوں میں پروفیسروں کی ٹکڑیاں ایسے ہی تعدیبی اور

اخلاقی بحث میں مصروف تھیں۔اسی وقت ایک پروفیسر نے اونچی آواز میں مخاطب کیا۔''ہم لوگ وائس پرنسپل کے پاس چل رہے ہیں۔ چلئے چلئے۔سب لوگ چلئے۔''

کاریڈور میں ادھرادھر طالب علم بھی جمع ہو گئے تھے۔ان کے درمیان سے ہوتے ہوئے تمام پروفیسر وائس پرنسپل کے چیمبر تک پہنچے۔دیکھا کہ وائس پرنسپل خود ایک پروفیسر کے ساتھ اپنے چیمبر سے باہر نکل رہے ہیں۔پروفیسروں کی تمام ٹکڑیاں وائس پرنسپل کے ہمراہ پرنسپل کے چیمبر کے باہر کھڑی ہو گئیں۔

ایک عیسائی پروفیسر محترمہ دراز قد، گورارنگ، خوبصورت جسم، لمبی زلفیں، ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس پروفیسروں سے مخاطب ہوئیں۔''آپ لوگ اس لڑکے کے خلاف اگر آج کوئی سخت قدم نہیں اٹھا پائے تو یہ ہماری ہمیشہ کی شکست ہوگی۔آج اس کا تدارک ہونا چاہئے ورنہ ہم لوگ آج سے اور ابھی سے کلاسوں کا بائیکاٹ کریں گے۔''

چھوٹا قد، چھوٹے بال، سرخ ساڑی، سرخ بلاؤز اور سرخ چپل پہنے ہوئی ایک پروفیسر محترمہ نے کہا۔''اس کالج کیمپس میں پولیس بلائی جائے۔یہاں اب ہر لمحہ جان وعزت کا خطرہ بڑھتا جارہا ہے۔''

ایک پروفیسر نے کہا۔''بھئی پروفیسر ندرت اللہ کہاں ہیں؟ وہ پروفیسروں کی یونین کے سکریٹری ہیں۔ انھیں بلوایا جائے۔ایک طرف سے پروفیسر ندرت اللہ چھوٹا قد، موٹا بدن، گول چہرہ، چھوٹے بال، چھوٹی مونچھ، چھوٹی داڑھی، گول آنکھ، گول منہ آتے ہوئے نظر آئے۔چند پروفیسران پرنسپل کے کمرے سے باہر نکلے۔انھوں نے بتایا کہ پرنسپل یہ طے کر رہے ہیں کہ کون سی سزا تجویز کی جائے۔

پروفیسر ندرت اللہ بولے۔''بھئی آپ لوگ ہماری باتوں کی طرف دھیان دیجئے۔آیئے اس کانفرنس ہال میں (جو پرنسپل کے کمرے سے ملحق تھا) بیٹھ کر پروفیسر برادری اپنا فیصلہ خود طے کرلے۔پرنسپل تو جو کریں گے وہ ان کے اختیار میں ہے لیکن پروفیسران بھی تو اپنے قدم اٹھائیں گے۔''

پروفیسر ندرت اللہ اپنی بات ختم ہی کر رہے تھے کہ تمام پروفیسروں کی نگاہیں کاریڈور کی طرف دوڑ گئیں۔ متوسط قد، گھنگھریالے بال، گٹھا ہوا بدن، بڑی بڑی خوفناک آنکھیں، گیہواں رنگ، کتھئی رنگ کا ہاف سوئیٹر، نیلی جینز اور سلیپر (ہوائی چپل) میں وہ پرنسپل کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ چپراسی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اندر گیا اور پرنسپل کے سامنے کی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ تمام آنکھیں فرط تعجب سے کھلی ہوئی تھیں۔ وہ طالب علم تیس سالہ جبران تھا جس کے لیے پوری بھیڑ جمع تھی۔ پانچ منٹ بعد جبران پرنسپل چیمبر سے نکلا اور وزیٹرس روم کی چوکھٹ کو دونوں ہاتھ اٹھا کر پکڑا دونوں ٹانگیں اوپر اٹھائیں اور جھولنے لگا جس طرح کوئی درخت کی شاخ پکڑ کر جھولتا ہے۔ وہ بے خوفی سے جھولتا رہا اور مسکراتا رہا اور سامنے کے گراونڈ کی طرف دیکھتا رہا جیسے آس پاس جو پروفیسر بیٹھے اور کھڑے ہیں وہ پروفیسر نہیں بلکہ زمیندار کے بے مایہ اور ناتواں مزدور ملازم ہیں جنھوں نے برسوں بعد زمیندار کے دربار میں جرات شکایت کی ہے۔

تمام پروفیسر خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ سامنے گراونڈ میں اس کے دوست کھڑے تھے۔ وہ ہنستا ہوا اور پروفیسروں پر تحقیرانہ نظر ڈالتا ہوا اپنے دوستوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے لگا۔

پروفیسر ندرت اللہ نے سلسلہ کلام جاری کیا۔ بھئی بہتر ہوگا ہم لوگ کانفرنس ہال میں بیٹھ کر کوئی فیصلہ کر لیں۔ جبران پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تمام پروفیسر آہستہ آہستہ کانفرنس ہال میں پہنچ گئے۔ اگلی قطار میں بزرگ پروفیسران کے پیچھے جونیرس اور ڈائس پر دونوں وائس پرنسپل کرسیوں پر متمکن ہو گئے۔ ایک پروفسر محترمہ نے کہا۔

”بھئی جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کالج انتظامیہ کے سارے معاملات کے ذمہ دار وائس پرنسپل ہوتے ہیں اس کے بعد پرنسپل کا نمبر آتا ہے۔ ابھی ہم تمام پروفیسر وائس پرنسپل صاحبان سے پوچھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد آپ نے کیا کاروائی کی؟ ہمیں جواب چاہئے۔“

آرٹس فیکلٹی کے وائس پرنسپل کرسی سے اٹھے۔ متوسط قد، بھاری بدن، بھاری توند، سیاہ رنگت، معصوم آنکھیں، سر پر بال خال خال، ہاف شرٹ، پتلون اور جوتے میں ایسے دکھائی پڑ رہے تھے جیسے کئی دنوں بعد کسی لاش کو پانی میں سے نکالا گیا ہو۔ ان کی صورت کی مثال لوگ جلا پکوڑا سے دیتے تھے۔ اتنے پروفیسروں کے سامنے ایک بدمعاش طالب علم کے مسئلے کو لے کر ان کا خون سفید ہو گیا تھا۔ ڈھیلے اور ڈرپوک قسم کے انسان تھے۔ پرنسپل کے سامنے بھیگی بلی بن کر رہتے تھے۔ خود پٹے پٹائے لگتے تھے۔ مردہ آواز میں فرمایا۔

''معافی نامہ ٹائپ ہو رہا ہے۔ جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ میں اپنے کئے کی معافی مانگتا ہوں جبران اس پر دستخط کرے گا اور پرنسپل اسے محفوظ کر لیں گے۔''

کئی پروفیسروں نے ایک ساتھ کہا۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس لڑکے کی تو ایک فائل بنی ہوئی ہے جس میں نہ جانے کتنے معافی نامے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ ہر بار بدتمیزی کرتا ہے اور معافی نامہ پر دستخط کرتا ہے۔ ہم ایسے فیصلے سے اتفاق نہیں کرتے۔''

''تو آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' وائس پرنسپل نے پوچھا۔

''ہم کوئی سخت سزا چاہتے ہیں۔'' پروفیسروں نے جواب دیا۔

ایک پروفیسر نے پوچھا۔ ''یہ سخت سزا کے کیا معنی ہوتے ہیں ؟''

ایک لمبا قد، لمبی داڑھی، ٹوپی، شیروانی، پائجامہ والے پروفیسر کھڑے ہوئے اور فرمایا۔

''بھئی ایسا ہی ایک واقعہ عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی پیش آیا تھا۔ وہاں کی انتظامیہ نے آدھے گھنٹے کی میٹنگ میں یہ طے کیا کہ کالج دشمن عناصر کو تین سال کے لئے اخراج کر دیا جائے اور اس پر فوراً اقدام اٹھایا گیا۔'' اتنا کہہ کر وہ گرد آلود بنچ پر بیٹھ گئے جس پر پاس کی بنچ پر بیٹھے ہوئے پروفیسر نہیں بیٹھے تھے۔

اس تجویز کا جواب دینے کے لئے متوسط قد، دبلا پتلا بدن، چھوٹی آنکھیں، چھوٹے بال، اداس چہرہ، کمزور آواز، ہاف شرٹ اور پتلون میں سائنس فیکلٹی کے وائس

پرنسپل اٹھے اور فرمایا۔

''میرا خیال ہے جو سزا ٹائپ کی جارہی ہے بہت ہی مناسب ہے۔اس بارے میں پرنسپل صاحب کو سخت قدم اٹھانا چاہئے۔ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ویسے آپ حضرات جو کہیں گے اس پر یقیناً غور وخوض کیا جائے گا۔''

ہال میں ایک پروفیسر نے کھڑے ہو کر کہا۔''وائس پرنسپل صاحب مناسب یہ ہے کہ اس لڑکے کو رسٹی کیٹ کیا جائے۔کالج میں ہر طرف ہراس کا ماحول پھیلتا جارہا ہے۔لڑکیاں سہمی ہوئی رہتی ہیں۔استاد ذلیل ہو رہے ہیں اور کوئی کچھ کر نہیں پاتا۔مظلوم پروفیسر سرمد کے لئے دو پولیس کا انتظام ہونا چاہئے۔''

ایک پروفیسر نے فوراً جواب دیا۔''بھئی بہتر ہوگا ہر پروفیسر کے لئے دو دو پولیس کا بندوبست کیا جائے۔آخر آپ لوگ بکواس کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟''

اس کا جواب ایک خاتون پروفیسر نے اس طرح دیا۔''وائس پرنسپل صاحب کیا جواب دے پائیں گے۔وہ خود خوفزدہ ہیں اور ڈر رہے ہیں کہ اس کالج کی سرحد کے باہر انھیں کون بچائیگا۔یہ وہی وائس پرنسپل صاحبان ہیں جو خود بھی اس لڑکے سے بے آبرو ہو چکے ہیں۔جب یہ اپنی حفاظت خود نہیں کر سکے تو بھلا پروفیسروں کی نگہبانی کیا خاک کر پائیں گے۔انھوں نے آجتک اپنی بے عزتی کے متعلق کوئی تحریری نوٹ پرنسپل کو نہیں دیا اور یہ دو وائس پرنسپل صاحبان پر ہی کیا منحصر ہے۔اس کالج کی سولہ سال کی زندگی میں دیکھ چکی ہوں کہ پروفیسر کریم، پروفیسر فضیل، پروفیسر ریال، پروفیسر کلیم، پروفیسر درانی، پروفیسر مسیح الزماں اور پروفیسر گاگل سب کے سب اس لڑکے کی بدتمیزی کا شکار ہو چکے ہیں۔آپ کو معلوم ہے امتحان میں چیٹنگ کرتے ہوئے پکڑے جانے پر انویجیلیٹر کی کس طرح بے عزتی کی تھی۔ایک پروفیسر کو اسی لڑکے نے ہوسٹل کے حوض میں ڈبو ڈبو کر مارا تھا آج تک ان بدمعاشیوں اور غنڈہ گردی کا کچھ بھی نہ ہوا۔یہ میٹنگ جو آپ لوگوں نے منعقد کی ہے سراسر بکواس ہے۔کیونکہ آج تک کسی میٹنگ کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔میرے خیال میں

سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جیسا وہ لڑکا کرتا ہے اس میں آپ دخل اندازی نہ کریں۔ اگر وہ آپ کی کلاس کے سامنے ہنگامہ کرتا ہے تو آپ کلاس چھوڑ دیں۔ اگر وہ آپ کی شرٹ کا کالر پکڑ کے آپ کی بے عزتی کرتا ہے تو ایک فرمانبردار استاد کی طرح اپنی گردن جھکا کر اس کی گالیاں غور سے سن لیا کیجئے۔ اگر وہ کالج میں کسی لڑکی کا دوپٹہ کھینچتا ہے تو آپ اپنی آنکھوں کو سمجھایئے کہ دونوں محبت کر رہے ہیں۔ اگر وہ اپنے جسم کے سارے کپڑے اتار کر ننگا ہو کر کالج میں چلتا ہے تو سمجھئے کہ اس کے کپڑے کا رنگ دراصل ایسا ہی ہے۔ آج یہ صورت حال ہے۔ آنے والا دن اور بھی وحشتناک ہوگا۔ کل جب ہماری بیٹیوں کے ساتھ دست درازی کی جائے گی اور پروفیسروں کے کپڑے اتارے جائیں گے تب ہمارے خون میں گرمی آئیگی۔ اپنی جان کی پرواہ نہ ہوگی۔ تب تک اس دن کے انتظار میں ہمیں اپنے آپ کو خاموش رکھنا ہے۔ ایسی ذلت کی زندگی سے بہتر ہے خودکشی کر لی جائے۔ ارے اتنا خوف تو عورتوں کو بھی نہیں ہوتا۔''

اتنا کہہ کر وہ کانفرنس ہال سے باہر چلی گئی۔ پوری محفل میں سناٹا چھا گیا۔ آہستہ آہستہ پورا ہال خالی ہو گیا۔ ایک بار پھر سارے فیصلے، سارے ارادے، سارے پروگرام، ساری سزائیں، سارے اقدام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب تنظیم کے سربراہ کی نظروں میں اپنے خوشامدی کا مرتبہ اپنے کارکنوں سے زیادہ ہو جائے تو یہی انجام ہوتا ہے۔ جبران کی پیٹھ پر پرنسپل کا دست شفقت تھا۔ ان کی نگاہ میں پروفیسر نوکر اور غلام تھے۔ اور جبران سعادت مند خدمت گار۔ ایسی حالت میں کیا درخواست، کیا میٹنگ اور کیا معافی نامہ۔ جانوروں کو چپ کرنے کے لئے یہ روٹی کے ٹکڑے تھے۔

جاوید نے واقعہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور سوچا کہ ان اشخاص کے درمیان اس کی جگہ کہاں ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ جواب ملا صفر صفر اور صفر۔ تم نے برسوں جن دانشوروں کے قدموں میں بیٹھ کر علم، اقدار، کلچر، تہذیب اور تمدن کا عرفان حاصل کیا تھا یہ جگہ اس سے کوسوں دور ہے۔ یہاں تمہاری آواز کوئی نہیں سن سکتا۔ تمہارے جذبات کو کوئی

نہیں سمجھ سکتا۔تمہاری زبان کوئی نہیں بولتا۔تم اندھے بہرے اور گونگوں کی بستی میں آ گئے ہو۔یہاں سے نکل نہیں سکتے یہ تمہاری مجبوری ہے یہاں رہنا ہے یہ تمہاری تقدیر ہے۔مجبوری اور تقدیر کو کیسے بدلو گے؟

کالج کا ماحول، پروفیسر، طلباء، پرنسپل، کلرک اور چپراسی ان سب نے جاوید کی شخصیت، ذہنیت، فکر اور زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔وہ انھیں کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔وہ ان کے جال میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ دو فرشتے جو رات بھر دیوار کو چاٹ کر پتلا کرتے ہیں کہ صبح یہ دیوار ٹوٹ جائیگی اور وہ اس سے باہر نکل کر آزاد ہو جائیں گے ایسا نہ ہوا کیونکہ صبح ہوتے ہی دیوار پھر سے موٹی ہو جاتی ہے۔یہی کہانی جاوید کی بھی تھی۔وہ ہر سال ارادہ کرتا کہ اس بار کہیں نہ کہیں انٹرویو دے گا اور اس ماحول سے اسے نجات مل جائیگی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔اسے نجات نہ مل سکی۔وہ ہر سال اسامی کے لئے یونیورسٹی میں درخواستیں دیتا، انٹرویو بھی دیتا مگر اس کا انتخاب نہ ہو پاتا۔پھر آئندہ سال اور پھر اگلے سال۔اسی سال میں کئی سال گذر گئے۔بلکہ قیمتی سال گذر گئے۔وہی پروفیسر، وہی طلباء، وہی پرنسپل، وہی کلرک اور وہی چپراسی اس کی زندگی کے شب و روز بن گئے۔لاکھ کوشش کے باوجود وہ وہاں سے نہ نکل سکا۔

یہ سب تو اپنی جگہ ان کے ساتھ ایک اور مسئلے نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔جس کا نام رہائش تھا یعنی رہنے کی جگہ، اپنے مکان، کرایے کا فلیٹ۔ہر گیارہ مہینے یا سال دو سال پر پرانے فلیٹ سے نئے فلیٹ کو انتقال، شفٹنگ گویا سالانہ ہجرت۔اسے کبھی کبھی خیال آتا یار یہ سال سال کے رہائشی انتقال سے بہتر تھا کہ میں واقعی مستقلاً انتقال ہی کر جاتا۔کم از کم اس سالانہ ذہنی اور جسمانی کوفت سے تو چھٹکارا مل جاتا۔لیکن سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔خیال اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

رہائش اور کرایے کے فلیٹ اس کے انتظام اور تبدیلی نے جاوید کو مسلسل ذہنی کرب میں مبتلا رکھا۔ایسے ایسے مکان مالکوں اور فلیٹ اونروں کا سامنا کرنا پڑا ان کے

سامنے گڑگڑانا پڑا جس کے بارے میں کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ دس بائی چھ فیٹ کی دکان میں معمولی کپڑے بیچنے والے، کھیتی کرنے والے، کالج میں پڑھانے والے، گھر میں رہنے والی ہاؤس وائف جاہل عورتوں، فیکٹری میں مزدوری کرنے والے، مرغی بیچنے والے، تالے کی چابی بنانے والے، وڑا پاؤ بنانے والے، ہوٹل میں کام کرنے والے ان سب سے کرایہ کا فلیٹ یا کمرا کے لئے خوشامد کرنی پڑی۔ خوش قسمتی دیکھئے کہ ان میں سے بیشتر کے پاس اپنے فلیٹ تھے اور کام معمولی اور تعلیم ندارد اور صاحب فلیٹ۔ یہ خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں اس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ کالج کی ملازمت میں ایسے دن بھی آئیں گے۔ جہاں کالج کا ہر استاد پروفیسر ہوگا۔ جہاں رہائش کے لئے جاہلوں اور بدمعاشوں کے سامنے منتیں کرنی پڑیں گی۔ وہ جب ان واقعات کو یاد کرتا تو اسے اپنے آپ پر شرم آنے لگتی۔ سماج کا معزز ترین پیشہ پروفیسری اور پروفیسر اسی سماج کے ذلیل ترین اور معزز ترین آدمیوں کے سامنے رہائش کے لئے سر جھکائے۔ جاوید کو یہ سب کچھ کرنا پڑا۔

اسے اب احساس ہوا کہ اگر کسی کو ملازمت کرنی ہو تو اس پیشہ کو اختیار کرے جس میں رہائش کا انتظام ہو ورنہ پڑھنے لکھنے والے شخص کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بار بار رہائش کے انصرام میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی کالج کی ملازمت میں کسی استاد کے لئے پڑھنا لکھنا، غور و خوض کرنا اور تخلیق و تحقیق کرنا آسان نہیں ہوتا بلکہ بہت کم ہوتا ہے۔ مشکل سے ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا ہے۔ جس طرح کے کالج میں جاوید ملازم تھا اسے ہائی اسکول سے بس دو قدم اوپر کہہ سکتے ہیں یعنی اس کالج پر اسکولیت پوری طرح حاوی تھی اور جو پرنسپل تھے انہوں نے اس کا پورا SETUP اسکول کا بنا رکھا تھا۔ اسکول کے ٹیچروں جیسی پابندی، اسکول جیسے پروگرام، اسکول کے ہیڈ ماسٹر جیسی داد خواہی، خودستائی اور خوشامد اور بغض و حسد اور ذاتی اور علاقائی تعصب کا بازار لگا رکھا تھا۔ جاوید کو خیال آتا کہ اس کی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے بعد بھی طالب علم وہیں ہوسٹل میں قیام کرتے، یونیورسٹی میں ہی ملازمت کی

کوشش کرتے اور کبھی کالج کا رخ نہ کرتے اس کی وجہ شاید یہ تو نہیں تھی جس سے جاوید دوچار تھا۔

نئے شہر میں جاوید کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ کالج میں گنتی کے لوگ تھے۔ اس لیے انتظام رہائش کے لئے اس نے کالج کے ہی شناساؤں سے رجوع کیا۔ پھر بھی بات نہیں بن رہی تھی۔ شناسا پروفیسر کو معلوم تھا کہ جاوید کو فلیٹ کی تلاش ہے۔ وہ دیکھتے ہی پوچھتے کہ کہیں انتظام ہوا کہ نہیں۔ اس دن بھی وہ کالج کینٹین میں پروفیسروں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ پروفیسر ضمیر الدین (کامرس) نے جاوید سے کہا۔

''ارے میں، نے سنا کہ تمہارے کو کرایے کا کمرا چاہئے۔ اگر تم کو دقت ہے تو میرے فلیٹ میں آجاؤ۔''

جاوید نے سمجھا یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس رہائش نے مجھے تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج ان کو تفریح کی سوجھی ہے۔

پروفیسر ضمیر الدین اس سے ہمیشہ کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ آج اچانک اتنے مہربان کیوں نظر آرہے ہیں۔ جاوید نے شک ویقین کے ساتھ کہا۔

''ہاں مجھے دقت ہو رہی ہے اور میں فلیٹ یا کمرا ڈھونڈ بھی رہا ہوں۔ کیا آپ واقعی میری مدد کر رہے ہیں؟''

''ہاں بھئی تمہارے کو جھوٹ لگتا ہے کیا۔ نہیں یقین ہو تو کل اپنا سامان لے کر میرے فلیٹ میں آجاؤ۔ وہاں میرا ایک کمرا خالی پڑا ہے۔ جبتک تم اس میں ٹھہر جاؤ۔''

''ٹھیک ہے میں کل آجاتا ہوں۔'' جاوید نے کہا۔

پروفیسر ضمیر الدین وہ تھے جنھوں نے کامرس میں ایم۔ کام کیا تھا۔ قرب وجوار میں انڈا کے نام سے مشہور تھے کیونکہ دیکھنے میں انڈا کی طرح گول تھے۔ چہرے سے جہالت ٹپکتی تھی۔ ساڑھے چار فیٹ کے قد میں وہ واقعی انڈا ہی دکھتے تھے بلکہ انڈا فروش لگتے تھے۔ دور دور تک چہرے پر علم کا سایہ نہ تھا۔ ہاف شرٹ، پتلون اور چپل میں کالج آیا

کرتے تھے۔ پروفیسر تو پروفیسر چپراسیوں سے عشق ومحبت اور جنسیات پر کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ شیخ بابو لال جب پرنسپل تھے تو میاں ضمیر الدین کا دماغ عرش بریں پر تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نوشی اور مے خوری ہوتی تھی۔ جس طالب علم کو چاہا زیادہ نمبر، کم نمبر، پاس یا فیل کر دیا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ جم کر ٹیوشن کراتے تھے۔ ان دنوں غیر ملکی طلباء کی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی اور پروفیسر ضمیر الدین اور ان کے حلقہ کے تمام پروفیسر سارے غیر ملکی طلباء کو ٹیوشن دیتے تھے اور ان سے وافر رقم بٹورتے تھے نیز تحفے الگ (بیگ، قلم، جوتا، کالکولیٹر، موبائل وغیرہ) جو وہ اپنے ملک صومالیہ، یوگانڈا، ایران وغیرہ سے لاتے تھے۔ گویا چاندی ہی چاندی تھی۔

پروفیسر ضمیر الدین کی ایک اور خوبی تھی۔ کالج میں ہونے والے ہر پروگرام میں لنچ یا ڈنر کے لئے ہوٹل یا کیٹرر سے رابطہ نہیں کیا جاتا۔ پروفیسر ضمیر الدین بڑے شوق سے کھانا پکاتے تھے۔ یہی انکی اصل شخصیت تھی۔ وہ دیکھنے اور گفتگو سے بھی خانساماں اور باورچی لگتے تھے۔ کلرکوں اور چپراسیوں سے بے تکلف دوستوں کی طرح ہر موضوع پر کالج سے لے کر اندرون خانہ تک کے مسائل پر بات کرتے تھے۔

دوسرے دن جاوید اپنا بستر، ایک سوٹ کیس اور پچاس کتابیں لے کر ان کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ مجبوری بھی آدمی کو کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ پروفیسر ضمیر الدین نے دیکھ کر کہا اندر آ جاؤ۔ فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم، بیڈ روم اور کچن روم تھا۔ ڈرائنگ روم سے گذر کر بیڈ روم میں جانا پڑتا تھا۔ انھوں نے جاوید سے کہا ایسا ہے تم اسی ڈرائنگ روم (بارہ بائی دس) کے فرش پر اپنا بستر لگا لو۔ باتھ روم میں صبح پانچ بجے پانی آتا ہے اس وقت نہا لینا۔ جاوید نے کہا ٹھیک ہے۔ وہاں کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ضمیر الدین کنوارے تھے۔ کسی دوست پروفیسر کے یہاں قریب میں ہی کھانا کھاتے تھے۔ جاوید کو کھانا کھانے ہوٹل میں جانا پڑا جو وہاں سے تین کیلومیٹر کے فاصلے پر تھا جہاں سیدھا آٹو رکشا والا نہیں جاتا تھا بس بھی نہیں جاتی تھی اس لیے اکثر پیدل ہی جانا پڑتا تھا۔

جاوید نے پروفیسر ضمیر الدین کے یہاں تقریباً چھ مہینے گذارے۔ اس اثناء میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ انہوں نے اسے ایک پیالی چائے کے لئے پوچھا ہو۔ کبھی کبھی ڈرائنگ روم کے دروازے پر پھل بیچنے والے سے وہ پھل خریدتے۔ جاوید سامنے فرش پر لیٹا ہوا کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ وہ پھل ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے سیدھے اپنے بیڈروم میں چلے جاتے اور وہاں چاقو سے کاٹ کاٹ کرا کیلے کھاتے رہتے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ شب قدر میں جاوید سے کہا چلو مسجد چل رہے ہونا۔ وہ ساتھ ہو لیتا۔ اور دو گھنٹے عبادت کر کے واپس آجاتا۔ مسجد جاتے ہوئے پروفیسر ضمیر الدین کوئی بات نہیں کرتے اور دوسرے دن یہ بھی نہیں پوچھتے کہ گذشتہ رات مسجد سے تم کب لوٹے۔

عید کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد جاتے ہوئے اور آتے ہوئے بھی یہی ہوا۔ ٹھنڈے ہاتھ اور بے جان دل سے عید ملتے ہوئے سلام علیکم کہتے۔ غالباً علی گڑھ کے ہاسٹلر اور این آر ایس سی میں یہی فرق ہوتا ہے۔

جاوید ڈرائنگ روم میں لیٹا کچھ پڑھ رہا تھا۔ پروفیسر ضمیر الدین اپنے بیڈروم میں معلوم نہیں کیا کر رہے تھے۔ اسی وقت جونیر کالج (2+) کے سائنس کے دو پروفیسر ضمیر الدین سے ملنے آئے۔ اتوار کا دن تھا۔ دونوں بیڈروم میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ان میں سے ایک پروفیسر نے جاوید کو آواز دی کہ یہاں آیئے۔ ادھر اکیلے کیا کر رہے ہیں۔ جاوید بیڈروم میں گیا تو دیکھا ضمیر الدین اپنے بستر پر لیٹے ہیں اور 2+ کے دونوں پروفیسر کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ عام موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ پھر سرسید کا ذکر چھڑا۔ ایک پروفیسر نے کہا جاوید صاحب آپ اور ضمیر الدین دونوں ایک ہی یونیورسٹی سے فارغ ہیں۔ واقعی سرسید نے بڑا کام کیا۔ ایسی یونیورسٹی قائم کر دی جو رہتی دنیا تک علم کے پیاسوں کی پیاس بجھاتی رہے گی۔ جاوید نے کہا ہاں یہ تو سچ ہے۔ یہ سرسید کی کوششوں اور قربانیوں کا ثمرہ ہے کہ ہم آج یہاں ہیں اور وہاں کے ہزاروں فارغ التحصیل دنیا کے مختلف ممالک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صرف ڈگری سے ہی تفویض نہیں کرتی بلکہ تہذیب و تربیت اور

کلچر سے بھی طلباء کو مفتخر کرتی ہے۔ یہی اس کی شناخت ہے اور یہی اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں فرق ہے۔

''ہاں سہی کہا آپ نے کیوں ضمیرالدین صاحب؟'' دونوں پروفیسروں نے کہا۔

''کیا مسلم یونیورسٹی اور سرسید کی رٹ لگا رکھی ہے۔ سرسید کی ایسی کی تیسی۔ وہ اپنی قوم کا غدار تھا، مکار تھا، عیار تھا۔'' پروفیسر ضمیرالدین نے اونچی آواز میں کہا۔

''ارے آپ وہاں کے طالب علم رہے ہیں۔ یہ کیا ہوگیا آپ کو۔'' ایک پروفیسر نے کہا۔

جاوید کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ اس نے پروفیسر ضمیرالدین سے کہا۔'' آپ ایسا خیال کیوں رکھتے ہیں۔ آپ کی تو سرسید سے ملاقات بھی نہیں ہوئی پھر آپ ایسا کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ میں اس ادارے سے فارغ ہوں کم از کم آپ میرے سامنے اس طرح کی بات نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ علی گڑھ میں ایسے بھی ہزاروں طلباء ہیں جو وہیں ملازمت کرنا چاہتے ہیں لیکن ناکام ہوجاتے ہیں۔ پھر انھیں علی گڑھ چھوڑنا پڑتا ہے لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد بھی انھیں دوسری جگہوں پر اچھی ملازمت مل جاتی ہے۔ انھیں طلباء میں چند ایسے ہوتے ہیں جو علی گڑھ بیزار کہلاتے ہیں۔ یہ وہ ہوتے ہیں جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ ضمیرالدین صاحب آج آپ بحرالاسلام کالج میں پروفیسر ہیں اسلئے کہ آپ کی ڈگری پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لکھا ہوا ہے جسے سرسید نے قائم کیا تھا۔ آپ کو سرسید کا احسان مند ہونا چاہئے۔ احسان لے کر اسے بھول جانا احسان فراموشی ہے۔ ایسا آدمی ہی دراصل غدار، کمینہ، عیار اور نمک حرام کہلاتا ہے۔ کیوں کیا خیال ہے آپ کا ضمیرالدین صاحب؟''

''جاوید صاحب رکئے بھی، رہنے دیجئے'' دونوں پروفیسروں نے کہا۔

جاوید نے کہا۔''نہیں میں کنٹرول میں ہوں۔ دراصل کسی نے جذبۂ علیگیرین کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی تو چند جملے نکل گئے۔ یہ پروفیسر ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں

جھول ۔اچھا آپ لوگ بیٹھئے میں چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جاوید اپنے کمرے میں آ گیا۔علی گڑھ کے ایم ۔کام جناب پروفیسر ضمیر الدین صاحب حواس باختہ تھے۔ان کی گھگی بند ہوگئی تھی۔

ایک مہینہ بعد کالج ٹیچنگ اسٹاف کا الیکشن تھا۔ضمیر الدین نے سکریٹری شب کے لئے الیکشن لڑا۔ جاوید نے اس کو ووٹ نہیں دیا۔ پھر بھی ضمیر الدین الیکشن جیت گئے ۔اس کے چند روز بعد انھوں نے جاوید سے کہا کہ" دیکھو تم اپنے رہنے کا کہیں اور انتظام کرلو۔ یہاں اس فلیٹ میں میری فیملی کے لوگ آنے والے ہیں۔وہ جاوید کو تم سے مخاطب کرتے تھے۔لیکن جاوید نے ہمیشہ آپ کہا۔جاوید پی ایچ ڈی تھا۔ضمیر صاحب ایم ۔کام تھے۔شاید یہی فرق تھا۔چند روز بعد شہر کے لاج (LODGE) میں ایک کمرا ماہانہ کرایہ پر لے لیا اور وہاں شفٹ ہوگیا۔

تین منزلہ مستطیل نما عمارت میں لاج تھا۔جاوید نے ہزار روپے ماہانہ پر دوسری منزل پر ایک کمرا لیا جو چھ بائی چھ کا تھا۔ پورے کمرے میں ایک چوکی ،ایک کرسی اور ایک کھڑکی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔کھڑکی سے پیشاب اور فضلے کی بدبو آتی تھی۔ کمرے سے پانچ میٹر کی دوری پر ٹائلٹ تھا جو نہایت غلیظ تھا۔اس لاج میں مختلف پیشہ کے لوگ کرایہ سے رہتے تھے۔کوئی ایک دن ٹھہرتا ،کوئی ایک ہفتہ ،کوئی ایک مہینہ اور کوئی کئی مہینے۔یا پھر ماہانہ کرایہ دے کر مہینوں رہنے والے طالب علم ۔اب اس برادری میں ایک پروفیسر بھی شامل ہوگئے تھے ۔یہ لاج شہر کے مرکز میں تھا اس لیے ٹرانسپورٹ ذرائع آمدورفت اور کھانے پینے کی کوئی دقت نہ تھی۔ آس پاس میں کئی ہوٹل تھے۔ جاوید لاج سے کالج جانے لگا۔

ایک دن لاج میں اپنے کمرے کے سامنے والے کمرے میں ایک پینسٹھ سالہ شخص سے ملاقات ہوئی۔اس نے بتایا وہ پروفیسر ہے۔جاوید نے دل میں کہا لو یہاں اس لاج میں بھی پروفیسر۔اس قوم سے پیچھا چھوٹنے والا نہیں ۔اس نے سمجھا پروفیسر کہیں سے کسی کام کے لئے آیا ہوگا۔ ہفتہ دس دن میں چلا جائے گا لیکن گفتگو سے پتہ چلا کہ یہ کالج

یونیورسٹی کا پروفیسر نہیں ہے۔ تعلیم دسویں پاس۔ فارن میں رہ چکا ہے۔ انگریزی فراٹے سے بولتا ہے۔ آپ پروفیسری کہاں کرتے ہیں؟ جاوید نے پوچھا۔

''اجی میں، پونے یونیورسٹی میں پڑھانے جاتا ہوں۔''

''کس ڈپارٹمنٹ میں؟''

''سائیکلوجی اور پریشن ڈپارٹمنٹ میں۔''

''لیکن وہاں تو پرشین ڈپارٹمنٹ ہے ہی نہیں۔''

''نہیں وہ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ سائیکلوجی پڑھانے جاتا ہوں۔''

''اچھا تو سائیکلوجی ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر کے عہدے پر قائم ہیں۔''

''نہیں نہیں دراصل وہاں ایرانی بچے پڑھتے ہیں وہ انگریزی پوری طرح نہیں جانتے تو ایسے بچوں کو ضرورت پڑنے پر میں فارسی اور انگریزی میں سائیکلوجی پڑھا دیتا ہوں۔ میں نے اس طرح کے نوٹس بنا رکھے ہیں۔ ایک معینہ رقم پر بیچتا بھی ہوں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے آپ اس قسم کے پروفیسر ہیں۔ اسٹوڈنٹ ڈھونڈ کر انہیں فارسی انگریزی میں نوٹس دینا اور پڑھانا۔''

''ہاں اب آپ سہی سمجھے۔''

''اور پریشن ڈپارٹمنٹ تو ہے نہیں پھر کیسے پڑھاتے ہیں؟''

پروفیسر نے شرماتے ہوئے بتایا: ''وہ معاملہ یہ ہے کہ اگر کسی فاریز طالب علم کو فارسی کے ذریعے کوئی اور زبان سیکھنا ہو جیسے جرمن، انگریزی، اردو، ہندی تو میں انہیں ٹیوشن دے کر سکھاتا ہوں۔ میں جرمن اور فرنچ بھی جانتا ہوں۔''

جاوید کی سمجھ میں آیا کہ یونیورسٹی ڈپارٹمنٹ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہاں سے ان کا دور کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ یہ گھومتے پھرتے اپنے کسٹمر اسٹوڈنٹ کو ڈھونڈتے رہتے ہیں جو کہ یونیورسٹی کیمپس میں زیادہ ملتے ہیں اور ملتے ہی ٹیوشن کی بات کر لیتے ہیں۔ ایک بار جاوید سے بھی کہا کہ آپ کے کالج میں کیا ایسے طالبعلم ہیں۔ اس نے بتایا میں نہیں

جانتا ہوں پھر بھی وہ کالج پہنچ گئے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔ جاوید نے شہر کے بوڑھے بزرگوں سے پروفیسر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے لیکن اپنے آپ کو آزاد خیال کہتا پھرتا ہے۔ اسی بنا بیوی بچوں نے بیس سال پہلے اسے گھر سے بھگا دیا تھا۔ ایک بار چند سالوں کے لئے ملازمت ڈھونڈنے کے لئے فارن چلا گیا۔ اسی دوران غیر ملکی زبان سیکھ لی۔ لوٹنے کے بعد غیر ملکی طالب علموں کو فارسی انگریزی میں نوٹس بنا کر بیچتا رہتا ہے۔ کوئی بھولا بھٹکا طالب علم مل بھی جاتا ہے۔ اس لیے نئے ملاقاتی کو پروفیسر سے تعارف کراتا ہے۔ شہر میں فٹ پاتھ پر کہیں نہ کہیں دن بھر بیٹھا رہتا ہے پبلک نل میں نہالیتا ہے کپڑے دھولیتا ہے۔ درگاہ درگاہ بھٹکتا رہتا ہے۔ جہاں خالی جگہ ملی رات گذار لی۔ جو سیدھا سادا طالب علم مل گیا اس سے نوٹس کے نام پر روپے اینٹھ لیے۔ اس طرح دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔ سماج نے اسے بائیکاٹ کر رکھا ہے۔

ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں چند تعلیمی کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ جیسے بورڈ آف اسٹڈیز، اکزام کمیٹی، ریسرچ کمیٹی، اکزامنرس کمیٹی، پیپر سیٹر کمیٹی، سبجکٹ اکسپرٹ کمیٹی، فیکلٹی ممبر کمیٹی وغیرہ۔ ان کمیٹیوں میں سینئیر استاد جو تحقیقی امور میں مصروف ہوں ممبر بنائے جاتے ہیں۔ جاوید کو چودہ سال تک کسی کمیٹی کا ممبر نہیں بنایا گیا۔ اس کے ریسرچ پیپرس صدر شعبہ اور شعبہ کے دوسرے استادوں سے زیادہ تھے۔ چار تنقیدی و تحقیقی کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ اُردو فارسی اور عربی تینوں کا ایک ہی شعبہ تھا۔ اردو کے چار، عربی اور فارسی کے ایک ایک پروفیسر تھے۔ ان میں جاوید کے علاوہ کسی نے ایک بھی تحقیقی مضمون یا کتاب نہیں لکھی تھی۔ لیکن جاوید کے علاوہ تینوں اردو کے استاد یونیورسٹی کی تمام کمیٹیوں میں ممبر تھے۔ مجوزہ تعداد کم ہونے پر دوسرے کالج سے نام لے لیتے لیکن جاوید کا نام نہیں ڈالتے۔ ان تینوں سے کالج کے پروفیسروں نے کہا کہ جاوید کا نام کو آپٹ ممبر کے طور پر شامل کر لیجئے۔ اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔ ہر سال ایک ڈرامہ ضرور ہوتا تھا۔ وہ یہ کہ جاوید سے کہا جاتا کہ آپ اپنا بائیوڈیٹا دے دیجئے۔ بورڈ آف اسٹڈیز میں آپ کو کو آپٹ ممبر بنانے کیلئے اس کی

ضرورت پڑے گی۔ وہ بڑے ذوق وشوق سے بائیوڈیٹا پروفیسر محترمہ کو پیش کرتا کہ اس بار تو ممبری مل ہی جائے گی مگر ہفتوں بعد پوچھتا کہ بائیوڈیٹا کا کیا ہوا تو جواب ملتا کہ اس بار تو نہیں ہوسکا اگلی بار ضرور سعی کریں گے۔ یہ چپقلش چودہ سال تک چلتی رہی۔ بورڈ آف اسٹڈیز ہی نہیں بلکہ اس کو کسی بھی کمیٹی کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ چودھویں سال میں کچھ ایسا ہوا کہ پروفیسر محترمہ نے صدر شعبہ کے عہدے سے استعفی دے دیا۔ اور شومئی قسمت جاوید صدر شعبہ ہوگیا اور اسی کی بدولت وہ پہلی بار بورڈ آف اسٹڈیز کا ممبر نامزد ہوا۔ محترمہ کو کوآپٹ ممبر بھی نہیں بنایا گیا۔ یونیورسٹی کی تمام تعلیمی کمیٹیاں پانچ سال مکمل ہونے پر تحلیل ہوگئیں اور محترمہ کہیں کی نہ رہیں۔ قسمت کا کھیل دیکھئے وہ اب تمام کمیٹیوں میں آ گیا۔ سبجیکٹ اکسپرٹ، اگزامنر، پیپر سیٹر سب ہوگیا۔ وہ ہوتو گیا سب کچھ لیکن محترمہ خفیہ طور پر دوسرے ممبروں کو فون پر ہدایتیں دیتی رہیں کہ جاوید سے ہوشیار رہنا۔ یہاں کا نہیں ہے۔ باہر گاؤں کا ہے۔ ہم لوگ مقامی ہیں۔ اپنے ہیں۔ جب تک میں صدر شعبہ تھی کبھی اس کو پھٹکنے نہیں دیا۔ اتفاقاً یہ صدر شعبہ بن کر کمیٹیوں میں گھس گیا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ اکیلے کیا کرلے گا۔ اس لیے اس کی تجویزوں پر نظر رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

بورڈ آف اسٹڈیز بننے کے بعد اس کے چیرمین کا انتخاب ہونا تھا۔ جاوید کے لئے ماحول سازگار تھا۔ بورڈ کے چھ ممبروں میں سے چار کی حمایت جاوید کو حاصل تھی۔ کسی اور کے چیرمین بننے کا سوال ہی نہ تھا۔ ڈین آف فیکلٹی کا انتخاب بھی ہونا باقی تھا۔ اس لئے کوئی ڈین نہ تھا۔ سابق ڈین کالج کی پرنسپل شپ چھوڑ چکے تھے۔ اپنی رہائش کے پاس ایک عمارت کرائے پر لے کر ایک انسٹی ٹیوٹ کھول رکھا تھا جہاں وہ انگریزی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا کورس کراتے تھے جبکہ چار کیلومیٹر پر یونیورسٹی تھی جس میں اچھا خاصا شعبہ انگریزی کا قائم تھا۔

برسات کا زمانہ تھا۔ ڈین کی رہائش سے جاوید کا فلیٹ پندرہ کیلومیٹر کی دوری پر تھا۔ ڈین نے جاوید کو فون کیا کہ آپ کل شام میرے انسٹی ٹیوٹ کے دفتر میں آیئے۔ آپ

سے بورڈ آف اسٹڈیز کے چیرمین شپ کے بارے میں باتیں کرنی ہیں۔اس سے پہلے بھی جاویداس دفتر میں ایک ماہ قبل کئی بار گیا تھا جب بورڈ کے ممبر کا نام طے کرنا تھا۔ جاویداور ڈین دونوں نے مل کر سارے نام طے کئے تھے۔ جاوید کے مشورے کو ڈین نے تسلیم بھی کیا تھا۔ جاوید کو ڈین پر اعتماد ہوگیا تھا کہ وہ چیرمین شپ کے انتخاب میں ہمارے ساتھ ہیں۔ یونیورسٹی کے بڑے ہال میں جس دن بورڈ کی ممبری کا انتخاب تھا اسی دن ڈین اوران کے دوست پروفیسروں نے جاوید کو چیرمین شپ کی مبارکباد بھی دے دی تھی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ ابھی الیکشن ہونا باقی تھا۔اس نے ایک پروفیسر سے کہا بھی کہ ابھی تو الیکشن باقی ہے۔انہوں نے جواب دیا الیکشن میں بھی آپ ہی کا نام منتخب ہونا ہےاس لیے پیشگی مبارکباد۔

چیرمین شپ کے الیکشن کے ایک دن پہلے ڈین نے بورڈ کے ممبروں کی ایک میٹنگ اپنے دفتر میں شام کے وقت منعقد کی۔ جاوید کے علاوہ این۔ ایس۔ ڈی کالج مالیگاؤں کے دو پروفیسر موجود تھے۔ جاوید نے گھر سے چلتے وقت ڈین سے پوچھا کہ میں اپنے ساتھ عربی کے پروفیسر کو لا رہا ہوں۔ میٹنگ کے لئے بہتر ہوگا۔ڈین نے منع کیا کہ انہیں لانا ضروری نہیں ہے۔ ہم لوگ خود ہی بات کرلیں گے۔ جاوید نے اصرار کیا۔ڈین نے کہا ایسا ہے اگر آپ انہیں لائیں گے تو میٹنگ کے وقت انہیں پاس کے کمرے میں بٹھا دیں گے۔ جاوید نے سوچا ایسا لے جانے سے بہتر ہے کہ نہ لے جایا جائے اور وہ تنہا ہی میٹنگ میں پہنچ گیا۔اسے اب بھی اعتماد تھا کہ سب کچھ اس کے FAVOUR میں چل رہا ہے۔ جاوید دفتر میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ دو پروفیسر(ایک مرد ایک عورت) وہاں ایک گھنٹہ پہلے ہی آچکے ہیں۔اوراس درمیان ڈین سے کیا باتیں ہوئیں خدا معلوم۔ڈین اپنی میز کے پیچھے کاغذات دیکھ رہے تھے۔این ایس ڈی کالج کی محترمہ پروفیسر نے کہا۔

''جاوید صاحب چیرمین شپ کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''اس کے بارے میں کیا سوچنا ہے۔آپ لوگوں کو ڈین صاحب نے کچھ بتایا نہیں؟'' جاوید نے کہا۔

''ہاں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا مگر ہم لوگوں کو تو خود بھی کچھ طے کرنا ہوگا۔'' محترمہ نے کہا۔

''جاوید زندگی میں ایسے حالات سے کبھی روبرو نہ ہوا تھا۔ اس نے کبھی الیکشن نہیں لڑا تھا۔ اسے الیکشن کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا طے ہوگا اور اب کیا کرنا ہے۔ اس نے محترمہ سے کہا:'' کیا طے کرنا ہے؟ میں نے سمجھا نہیں''۔

محترمہ بولیں۔'' دیکھئے ماجد انصاری صاحب ہم لوگوں میں سب سے سینئیر ہیں۔ ان کو رٹائر ہونے میں چند سال رہ گئے ہیں۔ ان کے بعد تو آپ ہی بنیں گے۔ فی الوقت ان کو بننے دیجئے۔ ان کے بعد میں اپنا ووٹ آپ ہی کو دونگی۔ یہ میں آج ہی بتائے دے رہی ہوں۔ بس یہی طے کرنا ہے۔''

جاوید ذہنی طور پر بالکل الجھ گیا۔ اسے پانچ منٹ پہلے تک یقین تھا کہ چیرمین شپ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ڈین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو شام میں پہلے بلا لیں گے اور انہیں بھی اس فیصلے پر راضی کرلیں گے۔ آپ تھوڑی دیر بعد پہونچئے گا۔ لیکن یہاں تو صورت حال کچھ اور ہے۔ جاوید نے کہا یہ آپ کی رائے ہے ڈین صاحب کیا کہتے ہیں۔ اسی وقت ڈین نے پوچھا آپ لوگوں نے کیا طے کیا؟ جاوید نے کہا سر کیا ابھی طے ہونا باقی ہے؟

''ہاں بہتر ہوگا۔ ابھی آپ لوگ طے کرلیں تا کہ کل اطمینان سے اس شخص کو متفقہ طور پر ووٹ دے دیں''۔ ڈین نے کہا۔

جاوید کا دماغ جھنجلا گیا۔ یار یہ کیا تماشا ہے؟ میرا نام تو کہیں دور دور تک نہیں ہے اور یہ محترمہ کٹر پٹر بولے جا رہی ہیں۔ ماجد انصاری اور ڈین چپ ہے۔

''سر آپ تو کچھ کہیئے'' جاوید نے ڈین سے کہا۔

ڈین نے کہا۔'' دیکھے ایسا ہے جب آپ لوگ کسی ایک امیدوار پر متفق نہیں ہورہے ہیں تو ایک صورت یہ ہے کہ دونوں آدمی ڈھائی ڈھائی سال کے لئے چیرمین ہوجایئے اور کل ووٹ سب لوگ ماجد انصاری کو دیجئے۔ چیرمین تو یہ ہوجائیں گے لیکن

نصف ڈھائی سال کے چیر مین جاوید ہوں گے اور اسی وقت ایک کاغذ پر ماجد انصاری یہ لکھ کر دے دیں کہ پہلے ڈھائی سال وہ چیر مین رہیں گے اور دوسرے ڈھائی سال جاوید تا کہ جاوید صاحب کے پاس ایک ثبوت ہو جائے۔''

جاوید کے دماغ میں طوفان بر پا تھا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے جسم میں آگ لگی تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ اس میٹنگ کی میز کرسیوں کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ اور چیخ چیخ کر یہ کہے کہ اس مصنوعی میٹنگ کے تماشا کو بند کیا جائے۔ جب پہلے سے طے کر لیا گیا ہے کہ ماجد چیر مین ہوگا تو یہ ڈھائی ڈھائی سال کا ڈرامہ کیا ہے۔ انتخاب کا نتیجہ ماجد کے نام آئے۔ باضابطہ چیر مین یونیورسٹی کے کاغذ پر ماجد اور پانچ میں ڈھائی سال کی بھیک میرے لئے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس الیکشن کے ہنگامے سے آدمی بالکل الگ ہی ہو جائے۔ ماجد نے ایک کاغذ پر ڈھائی ڈھائی سال کا معاہدہ لکھکر ڈین کو دیا۔ ڈین نے جاوید کو دیا اور کہا کہ تو یہ طے ہو گیا کہ ماجد کو کل سب ووٹ دینگے اور ڈھائی سال کے بعد جاوید چیر مین ہونگے۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ لوگوں نے یہیں پر طے کر لیا ورنہ الیکشن کے مقام پر بڑا ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ آپ لوگوں نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ چلئے ماجد صاحب مبارک ہو۔ ماجد نے کہا شکریہ ابھی تو مٹھائی میرے پاس نہیں ہے کل کھلاؤنگا۔

جاوید کا جی ہو رہا تھا کہ کب یہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے سوچ سمجھ کر کہا تھا کہ عربی کے پروفیسر کو مت لائیے گا۔ اب حقیقت سمجھ میں آ رہی ہے۔ جاوید نے ڈین سے کہا کہ بارش تھم گئی ہے میں چلتا ہوں۔ پندرہ کیلو میٹر اسکوٹر سے جانا ہے۔ بارش شروع ہو گئی تو رات زیادہ ہو جائے گی یہ کہتے ہوئے اور اپنے غصہ کو پیتے ہوئے دفتر سے باہر گیا اور اسکوٹر کو تیز چلاتے ہوئے ایک گھنٹہ میں اپنے فلیٹ پہنچ گیا۔ مولانا کو فون پر ساری روداد سنائی۔ انہوں نے سننے کے بعد کہا ڈین آپ کو غچہ دے گیا۔ جس وقت اس نے مجھے میٹنگ سے دور رکھنے کی بات کی تھی تبھی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی چال چل رہا ہے۔ دیکھئے پورے ایک مہینے سے وہ آپ کو دوڑا رہا تھا۔ اس نے آپ کو اس طرح کلچ میں لے رکھا تھا کہ جتنا وہ

آپ کو بولنے کو کہتا تھا اتنا ہی آپ ہم لوگوں سے بات کرتے تھے۔ کبھی آپ نے تفصیل سے ہم لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔ ورنہ میں آپ کو پہلے ہی تاکید کر دیتا کہ ایسے شخص سے ہوشیار رہئے۔ یہ عین وقت پر آپ کو دھوکا دے گا۔ اس کی ہوشیاری دیکھئے اس نے آپ لوگوں سے معاہدہ بھی کروادیا۔ اس معاہدے کی کیا حقیقت ہے۔ وہ اگر پانچ سال چیرمین رہے تو اس کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تو آپ کو بھیک کے طور پر خیرات دیا ہے۔ وہ تو یہ سوچتا ہوگا کہ جاوید بھلا ایسی چیرمین شپ کیوں قبول کرے گا۔ اس کی غیرت کیسے قبول کرے گی، خود ہی چھوڑ دے گا۔ بڑی خوبصورتی سے ان لوگوں نے آپس میں ملکر آپ کو مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا۔ اسی کو سیاست کہتے ہیں اور آپ سیاست سے سات جنم دور۔ خیر چھوڑیے جو ہونا تھا ہو گیا۔ کل ووٹ دے دیجئے۔ اور اس سارے خرتماشے کو بھول جائیے۔ سب سے پہلے تو اس ڈین کو فراموش کر جائیے۔ وہ اب تک تین بار ڈین بن چکا ہے۔ اور چوتھی کی کوشش ہے۔ ہندی کے بورڈ کے چیرمین شپ میں اسی طرح خطاب الدین کو بھروسے میں لے لیا تھا۔ وہ شریف بندہ بھی اس گمان میں تھا کہ اس بار وہی چیرمین بن رہا ہے۔ لیکن عین الیکشن کے ایک گھنٹہ پہلے اپنے دووٹروں کے ساتھ الیکشن ہال میں آیا اور خطاب الدین سے کہا کہ بھالے راؤ کو ووٹ دینا ہے۔ سب اس نام پر متفق ہیں آپ بھی یہی کیجئے۔ اس وقت خطاب الدین کی صورت دیکھنے کے لائق تھی وہ رویا نہیں تو کچھ نہیں کیا۔ اس کے سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔ وہ تو بے پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ کرے تو کیا کرے۔ جو چیرمین اس کی دلہن بنتی اس کی نظروں کے سامنے دوسرے کی بن گئی۔ تو جناب یہ ہے ڈین بلکہ ڈان بڑی گہری اور گندی سیاست وہ کھیلتا ہے۔ شریف تو اس سے دور رہے یہی بہتر ہے۔ چلئے اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ خود کو بورڈ کا ممبر ہونے پر اکتفا کر لیجئے۔ نہیں سے کچھ تو بہتر ہے۔ چودہ سال کے بعد آپ کو بہت کچھ ملا ہے۔ ورنہ چودہ سال تک تو یہ نہر ہی بند تھی۔ گولی ماریے چیرمین شپ کو۔ اس میں بھی کیا دھرا ہے سوائے میٹنگ بلانے اور نصاب تعلیم ترمیم و درست کرنے کے اور کیا ہے؟ خواہ مخواہ کی مغز ماری۔ فضول کی دماغ

سوزی۔ ایک طرح سے دیکھئے تو آپ کے لئے بہتر ہی ہوا۔ اس بہانے آپ کچھ اور لکھ پڑھ سکیں گے۔ اور اس سے آپ کے کیریئر میں اضافہ بھی ہوگا۔ اس چیر مین شپ میں کون سی تحقیق اور تنقید کا نیا زاویہ ملے گا۔ خدا جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔ یہاں ناکامی ملی ہو سکتا ہے کہیں اور کامیابی مل جائے۔ چلئے کل کالج میں ملتے ہیں۔ خدا حافظ۔

ایک دن کمپیوٹر سائنس کے پروفیسر ساجد نے جاوید سے بتایا کہ ہم لوگ جہاں رہتے ہیں وہاں دو آدمی اور بھی رہ سکتے ہیں لیکن اس سے بھیڑ ہو جائیگی۔ ایک فرد مناسب ہے اور پروفیسر کے ساتھ پروفیسر ٹھیک رہینگے اس لئے آپ آجایئے۔ لاج سے بہتر ہوگا۔ جاوید وہاں شفٹ ہو گیا۔ علاقے کا نام مومن پورہ تھا۔ فرسٹ فلور پر دس بائی بیس کا ایک بڑا ہال تھا۔ بیجاپور اور سولاپور کے دو پروفیسر اب اس کے روم پارٹنر تھے۔ تینوں کے تین سبجکٹس تھے یعنی آرٹس، سائنس اور کامرس۔ کمرے میں ایک ٹائلٹ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ سب فرش پر بستر لگا کے سوتے تھے۔ اپنے اپنے تکیے کے پاس سب کے بیگ اور کتابیں تھیں۔ دیوار کی کیل میں کپڑے ٹنگے تھے۔ ہال میں تینوں کا صرف سونا اور نہانا ہوتا تھا۔ کھانا پینا باہر۔ دن مہینے گذرتے رہے۔ وہاں سے کالج تین کیلومیٹر کی دوری پر تھا۔ بس کی سہولت نہیں تھی۔ اس لیے آٹو رکشہ کرنا پڑتا تھا اور جب رکشا نہیں ملتا تو پیدل۔ تینوں پروفیسر تین اوقات میں کالج جاتے اور اسی طرح واپس بھی آتے۔ جاوید کو پیدل چلنے کی عادت تھی۔ اس لیے زیادہ تر پیدل ہی آتا جاتا۔ صبح ساڑھے سات کے لکچر میں اسے رکشا کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وقت کم ہوتا تھا اور وقت پر کلاس لینا ہوتا تھا۔ اسے رات گئے جاگنے اور مطالعے کی عادت تھی۔ بقیہ دونوں پروفیسر سویرے کھانا اور سویرے سونا پر عمل کرتے تھے۔ ان دونوں کی تہذیب و تربیت بھی مختلف تھی۔ ریاست کے مختلف اور دور دراز کے ضلعوں سے ان کا تعلق تھا۔ جاوید کو تفریح، لطیفہ اور ہنسی مذاق سے شغف تھا۔ وہ دونوں لفظوں اور جملوں کی نزاکت اور جمالیات سے بہرے اور گونگے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ رہ کر بھی جاوید تنہا ہی تھا۔ وہ اکیلے ہی شام کے اوقات بازار کی طرف نکل جاتا۔ کسی ریسٹورنٹ میں ایک پیالی چائے پیتا اور آدھے

گھنٹے چہل قدمی کر کے لوٹ آتا۔ اس کی زندگی بے کیف اور بے لذت تھی۔ والدین، بھائی بہن، دوست، رشتہ دار تمام سے کئی ہزار کیلو میٹر دور اجنبیوں کے درمیان روزی روٹی کے لئے وہ زندگی گذار رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ کاش کوئی دوست مل جاتا جس سے یونیورسٹی ہوسٹل کے دوستوں کی طرح گفتگو کی جا سکتی تو اس شہر کی تنہائی سے چھٹکارا مل جاتا۔ زندگی سے خلا کا انعکاس ہو جاتا مگر اس کو ایسا کوئی ساتھی نہ مل سکا۔ اس کی تنہائیوں کا سلسلہ قائم رہا۔ وہ اپنی زندگی سے شب و روز جوجھتا رہا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ کہیں ایک کمرے کا علیحدہ فلیٹ مل جائے لیکن نہ مل سکا۔

ایک دن ایک ساٹھ سالہ بزرگ کاظمی صاحب ان سے ملنے آئے۔ لمبا قد، مناسب جسم، چھوٹی چھوٹی داڑھی، مونچھیں، اور چھوٹے چھوٹے سر کے بال۔ بالوں میں سیاہی اور سفیدی نظر آ رہی تھی۔ ان کی باتوں میں اپنا پن تھا۔ اس شخص سے جان پہچان پروفیسر عمان نے اس وقت کرائی تھی جب جاوید نے نیا نیا کالج جوائن کیا تھا۔ کاظمی صاحب نیہا جی نگر رہائشی سوسائٹی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ پروفیسر عمان بھی اسی سوسائٹی میں رہتے تھے۔ لیکن ان کا فلیٹ بڑا تھا۔ کاظمی صاحب نے جاوید سے کئی بار کہا کہ آپ میرے فلیٹ میں آ جائیے لیکن یہ سوچ کر انکار کر دیا تھا کہ ان کے فیملی کے ساتھ کیسے رہ پاؤں گا۔ کاظمی صاحب کی فیملی ایک بیوی ایک بیٹی (بارہویں کی طالبہ) پر مشتمل تھی۔ ایک بار کالج میں بھی انہوں نے جاوید سے کہا تھا کہ آپ ہماری ہاؤسنگ سوسائٹی کو چھوڑ کر یہاں چلے آئے جبکہ میرے فلیٹ میں جگہ خالی تھی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے آپ میرے ہاں چلئے۔ جاوید نے پھر ٹال دیا تھا۔ ادھر کسی سے ملنے آئے تھے۔ اس نے بتایا پروفیسر جاوید صاحب یہیں پڑوس میں رہتے ہیں۔ ملنے چلے آئے۔ باتیں شروع ہو گئیں۔

"جاوید صاحب اب آپ نہیں بچ سکتے۔ آخر میں نے آپ کو ڈھونڈ ہی لیا۔"

"کیوں... خیریت؟"

"ایسی جگہ میں کیسے رہتے ہیں؟ آپ آج ہی سامان لے کر میرے فلیٹ

میں آجایئے۔''

''دیکھئے آپ فیملی کے ساتھ رہتے ہیں میرے آنے سے خواہ مخواہ آپ کو دقت ہوجائیگی۔''

''اجی کیسی دقت۔آجکل میں اکیلے رہ رہا ہوں۔ بیوی بچے سب اپنے وطن گئے ہیں پورا فلیٹ خالی ہے۔آجایئے۔وہاں سے آپ کا کالج بھی بہت نزدیک ہوجائے گا۔ وہاں ملنے جلنے والے لوگ بھی ہیں۔کہاں مزدوروں اور کارخانوں کے علاقے میں آگئے۔ چلئے ہم لوگ ملکر کھانا بنائیں گے۔لطف رہے گا۔''

ہال میں بڑی دقت تھی۔دن رات شور ہوتا رہتا تھا۔پارٹنرس ہم خیال نہ تھے۔ دونوں نو بجے رات میں لائٹ آف کر کے سو جاتے تھے۔ان کا کہنا صحیح ہے۔فلیٹ خالی ہے۔کھانے کی سہولت ہوجائیگی۔ اچھا رہے گا۔جاوید دوسرے دن کاظمی صاحب کے یہاں شفٹ کرگیا۔کھانا بننے لگا۔گپ شپ ہونے لگی۔شام میں دونوں تفریح کو جانے لگے۔کاظمی صاحب لکھنؤ کے آس پاس کے تھے۔اس لیے باتیں دلچسپ کرتے تھے۔جاوید کو اپنی یونیورسٹی کا زمانہ یاد آگیا۔چلو ایک ہم زبان تو ملا بھلے عمر کا فرق تھا۔لیکن وقت ہلکا پھلکا گذرنے لگا۔

چند مہینے بڑے خوشگوار گذرے۔پھر ایک دن ان کی بیگم اور بیٹی آگئیں۔اور اس کے ساتھ ہی لحاظ خیال، پردگی اور رہنے کی تنگی بھی آگئی۔ایک چھوٹا بیڈروم اور ایک چھوٹا ڈرائنگ روم اس میں کون کہاں رہے۔ بیڈروم میں ماں بیٹی اور ڈرائنگ روم میں جاوید اور کاظمی صاحب تقسیم ہوگئے۔چھوٹی سی چوکی پر جاوید اور چھوٹے سے صوفہ پر کاظمی صاحب سونے لگے۔کبھی کبھی ان کے بڑے داماد اور بیٹی آجاتے تو الاماں جان پر بن آتی تھی۔تب تو آدمی پر آدمی کا منظر ہوتا تھا اور یہ منظر ہر مہینے دکھائی دینے لگا۔جاوید کو ایک بار پھر رہائش نے پریشان کردیا۔اس سے بہتر تو لاج تھا۔یار اس کاظمی کے چکر میں تو الجھ گیا۔اب ان سے چھٹکارا کیسے ملے۔سیدھے کہنے سے خفا ہوجائیں گے۔کوئی بہانا کر کے نکلنا ہوگا اور

تو کہیں نہیں وہیں لاج میں۔ اتنی جلدی کوئی فلیٹ کیسے ملے گا۔ آخر یہ بھاگم بھاگی اور شفٹنگ کا کوئی خاتمہ ہے یا نہیں۔ تنگ آ گئے اس شفٹنگ سے اور اس ملازمت سے لیکن جناب کاظمی صاحب کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اور کاظمی صاحب کے اس چھوٹے سے کمرے کو بھی۔ آخر کار وہ پھر سے لاج میں چلا گیا۔

چند دنوں بعد کالج میں گرمی کی چھٹیاں ہو گئیں۔ وہ اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ پہلے سے طے تھی۔ اس تعطیل میں وہ بھی ہو گئی۔ اس کی بیوی اسکول میں ٹیچر تھی۔ جمشید پور کے اسکول سے ناسک کے اسکول میں اس کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ جاوید جب لوٹ کر پونا آیا تو اب اس کے لئے فلیٹ کا انتظام کرنا لازمی ہو گیا تھا تب ہی اس کی بیوی چھٹی لے کر یہاں آ سکتی تھی۔ ادھر جاوید کو جب موقع ملتا وہ ناسک چلا جاتا لیکن رہائش کا مسئلہ اب بھی برقرار تھا۔ فلیٹ اونر اب بھی اسے تنہا مرد ہی سمجھتے تھے۔ وہ ان سے بتاتا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی بیوی ناسک میں ٹیچر ہے اس کے باوجود اسے فیملی والا نہیں مانا جاتا۔ اور اسے رہائشی کالونی میں فلیٹ نہیں ملتا۔ اس کی دربدری جاری رہی۔ آخر کار بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک کپڑا فروش تاجر نے کونڈوا کے علاقے میں اپنا ایک کمرے کا فلیٹ تین مہینے کے لئے کرایہ پر اس شرط پر دینے کو تیار ہوا کہ پورا کرایہ پیشگی لے گا۔ جاوید نے ادا کر دیا۔

گنیش فیسٹیول جنوبی ہندوستان اور خصوصاً مہاراشٹر میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ دس دنوں کا تہوار ہوتا ہے لیکن اس کی تیاریاں ہفتوں پہلے سے شروع ہو جاتی ہیں اور اسے ختم ہوتے ہوئے مزید دس دن لگ جاتے ہیں۔ گویا کل ایک مہینہ۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ، چوک چوک، سڑک کے کنارے پنڈال اور بڑے بڑے میوزک اسپیکر نصب کر دیے جاتے ہیں۔ دن رات میوزک اور گانے بجتے ہیں۔ ایک دو بجے رات تک یہ شور قائم رہتا ہے۔ اصل تہوار کے دس دن پہلے سے ہی عوام وخواص، دکاندار، ہوٹل والوں سے چندہ لیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے اعتراض کیا تو اس کا گھر، دکان اور سامان توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ ہندوؤں کے علاقے میں وہ مسلمان جو برسوں سے وہاں آباد

ہیں خاموشی سے ہر سال چندہ دے دیتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو اُن کا جینا مشکل ہو جائے گا۔ انہیں جان، مال اور عزت کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ انہیں معلوم ہے کوئی ان کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔ نہ انتظامیہ، نہ پولیس نہ محلے والے۔ اس لیے بغیر چوں چرا کہ چندہ دے دیتے ہیں۔ آخر انہیں اسی محلّہ میں رہنا ہے۔ یہی نہیں وہ اس حد تک دبائے جا چکے اور مظلوم ہو چکے ہیں کہ غیر مسلموں کی طرح وہ بھی اس تہوار کو مناتے ہیں۔ شام گذرتے ہی ایسے مسلمانوں کے لڑکے اور لڑکیاں جوق در جوق شہر کے مختلف علاقوں میں گنیش کا مجسمہ دیکھنے جاتے ہیں۔ ان کی آرتی پوجا میں شامل ہوتے ہیں اور ناریل توڑتے ہیں۔ یہ تو شہر کی حالت ہے۔ وہ مسلمان جو دیہاتوں میں رہتے ہیں وہاں تو یہ عالم ہے کہ وہ اپنی دکانوں کے نام شنکر اور کرشن کے نام پر رکھتے ہیں۔ وہ اپنا نام بھی ادھورا بتاتے ہیں یعنی پاٹل، دیشمکھ وغیرہ۔ لباس بالکل غیر مسلموں کا پہنتے ہیں۔ زبان علاقائی ہوتی ہے۔ کبھی مہینہ میں ایک بار مسجد چلے گئے ورنہ یہ بھی ضروری نہیں۔ ایک بار تبلیغی جماعت کے افراد گاؤں کی مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر نماز پڑھانے لاتے تھے۔ ایسے ہی ایک مسلمان کو دوسری بار نماز کے لئے کہا تو وہ ناراض ہو گیا اور بولا تمہارے اتنا بولنے پر میں نے ایک بار نماز پڑھ لیا اب تم پھر وہی کام کرنے کو بولتا ہے۔ چلو اس گاؤں سے تم لوگ ابھی باہر نکلو۔ آخر کار تمام جماعتی اشخاص کو گاؤں سے باہر نکال دیا۔ ایسے گاؤں میں بھی یہ مسلمان گنیش کی پوجا اور تہوار میں پابندی سے شامل ہوتے ہیں۔

ہر سال جیسے ہی ستمبر کا مہینہ آتا جاوید کو فوراً یاد آجاتا کہ گنیش تہوار میں دس دن کی ڈیوٹی کا مہینہ آگیا۔ جی پر جبر کر کے وہ دس دن تک یہ کام انجام دیتا۔ اس کے دل میں آتا کہ اس مہینہ میں کہیں چلا جائے تا کہ نہ وہ ہو گا اور نہ ہی فیسٹیول کے پروگرام کا انتظام کرنا ہوگا۔ لیکن اس دن کی چھٹی کون دے گا۔ پرنسپل لیکن پرنسپل کے اوپر کالج مینجمنٹ کے ٹرسٹی کا حکم کہ سب کو اس فیسٹیول کے موقع پر حاضر رہنا ہے تو بھلا کون انکار کر سکتا تھا۔ بلکہ پروفیسروں کی موجودگی کا تحریری ثبوت لے لیا جاتا تھا۔ وہ اس طرح کہ تمام پروفیسروں

کی فہرست کمپیوٹر سے کاغذ پر بنائی جاتی۔ اس کے ساتھ پرنسپل کی ایک نوٹس ہوتی جس میں لکھا ہوتا۔

''تمام پروفیسروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس سال کا گنیش فیسٹیول جو فلاں تاریخ شروع ہونے والا ہے کے موقع پر منعقد ہونے والے مشاعرے میں سب حاضر رہیں گے''۔

ہر پروفیسر اس نوٹس کو پڑھتا اور اپنے نام کے سامنے دستخط کر دیتا۔ یہ دستخط نامہ کالج ٹرسٹی کو پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن اسٹاف روم میں گنیش فیسٹیول کی نوٹس لگی ہوئی ہوتی جس میں لکھا ہوتا کہ شعبۂ اُردو فارسی اور عربی کے تمام پروفیسر آج شام اسمبلی ہال میں ہونے والی میٹنگ میں حاضر رہیں۔ اس شعبہ کے علاوہ سائنس کے تین چار شعبے ایسے تھے جن کے چار پانچ پروفیسر ہر اس میٹنگ میں حاضر رہتے تھے جس میں ٹرسٹی جمعدار صاحب موجود ہوں۔ یہ پروفیسر اپنے کالج کی تمام اچھی بری سرگرمیوں کی اطلاع جمعدار کو دیا کرتے تھے۔ گویا یہ ملازم تو بحرالاسلام کالج کے تھے لیکن جاسوسی جمعدار کی کیا کرتے تھے۔ جمعدار ایسا ٹرسٹی تھا جسے بحرالاسلام کالج اور اس کے پرنسپل ندرت اللہ سے نفرت تھی۔ بیس سال پہلے وہ جب صرف لکچرر تھے تو جمعدار کے ایماندار کالج کمیٹی کے رکن تھے۔ نہ جانے کیوں پھر نکال دیے گئے۔ ادھر بحرالاسلام کالج میں ندرت اللہ اپنی سنیاریٹی بڑھاتے رہے اور ادھر جمعدار نے آدم ٹرسٹ میں ممبر کے عہدے سے صدر کا مقام حاصل کرلیا۔ یہی نہیں ایک دوسرا ٹرسٹ بھی قائم کرلیا جس کے صدر خود بن گئے اور اپنے افراد خاندان کو اس کا ممبر بنا دیا۔ پندرہ سال پہلے آدم ٹرسٹ کیمپس میں پانچ اسکول تھے اب سولہ ادارے قائم ہو چکے ہیں۔ پروفیشنل کورسیز میں ڈونیشن کی بے شمار آمدنی ہے۔ کیمپس کے تین طرف کی عمارتوں میں سڑک کے رخ سے تجارتی دکانیں کھول دی گئی ہیں جن سے سالانہ کروڑوں روپے آتے ہیں۔ گویا چاندی ہی چاندی ہے۔ جمعدار خود کو حکمراں سمجھتے ہیں۔ اب وامجد قریب کی ریاست کے قدیم شہر میں ٹانگہ چلاتے تھے۔ جیسے تیسے بی۔اے کر کے اس شہر میں آ گئے۔

سرکاری آفس میں کلرک ہوگئے۔ سائیکل سے آتے جاتے تھے۔ آفس میں پورے شہر کی زمینوں کا گہرا مطالعہ کیا اور یہ سمجھ لیا کہ کس زمین کی کیا حقیقت ہے۔ پھر چھوٹی عمارت بنانے لگے۔ بلڈر بن گئے۔ پچیس ایکٹر کے کیمپس میں پانچ اسکول (پرائمری ٹرینگ بارہویں وغیرہ) جیسے تیسے چل رہے تھے۔ کیمپس آدم ٹرسٹ کا تھا جسکی انتظامیہ کمیٹی میں مقامی لوگ جھگڑا کیا کرتے تھے۔ کیمپس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس میں گھاس اگتی تھی۔ جمعدار نے جب اس اراضی کو دیکھا تو اس نے اسے حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بحیثیت عام ممبر کے وہ ٹرسٹ کی انتظامیہ کمیٹی میں داخل ہوگئے۔ آہستہ آہستہ ممبروں کو اپنا ہم نوا بنایا۔ پھر نائب صدر اور آخر میں صدر۔ بلڈر کا تجربہ تھا۔ کیمپس میں ایک کے بعد ایک نئی عمارتیں بنائیں۔ نئے کورسز کھولے۔ ڈونیشن ملے۔ ارب پتی ہوگئے اور جنوبی ہندوستان کے سر سید ہوگئے۔ اس کی شخصیت اور کارناموں پر شمالی ہند کے تعلیمی سربراہوں نے مضامین لکھے۔ کیمپس پر حکمرانی کرنے لگے۔ جیسا بھی فنکشن ہو سولہ اداروں میں جیسے ہی خبر جاتی کہ جمعدار صاحب فنکشن میں موجود رہیں گے تمام اساتذہ ہال کی طرف دوڑنے لگتے۔ کسی میں مجال نہ تھی کہ انکار کردے۔ نئے تقررات میں پروفیسر کی آدھی تنخواہ کالج کے ترقی فنڈ کے نام پر لے لی جاتی۔ برسوں یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ انہیں پرمانٹ نہیں کیا جاتا۔ ایسے استحصال کی مختلف شکلیں تھیں۔ کوئی چوں تک نہ کرسکتا تھا۔

بحرالاسلام کالج میں گنیش فیسٹیول کے سلسلے میں جو نوٹس لگی اس کی میٹنگ کیمپس ہال میں شام کو ہونے والی تھی جس میں جمعدار صاحب صدارت کرنے والے تھے۔ پورا ہال استادوں سے بھرا تھا۔ جمعدار آگئے۔ پندرہ منٹ میٹنگ کی روایتیں ادا کی گئیں جسے ہر میٹنگ میں دہرایا جاتا ہے۔ پروفیسر اناؤنسر نے مائیک پر اعلان کیا اب آپ کے سامنے ماہر تعلیم، ہمدرد قوم سماجی خدمتگار، جنوبی ہندوستان کے سر سید اور اس کیمپس کو نئی زندگی دینے والے جناب جمعدار صاحب اپنے خیالات رکھنے جارہے ہیں۔ جمعدار مائیک پر گئے اور اپنے لب ولہجہ میں فرمایا:

''آدم ٹرسٹ کے وائس چیرمین مقدر میر بھائی، یونانی میڈیکل کالج کے ڈاکٹر شیخ رحیم صاحب اور آپ سب لوگ جو یہاں ہال میں بیٹھے ہے آپ سب کو مالم ہے کہ ہر سال ستمبر کے مہینہ میں ادھر اس شہر میں دس دن کا گنیش فیسٹیول مناتے ہے۔ (وہ ہیں کو ہے بولتے تھے) یہ دس دن میں روز ایک ایک پروگرام ادھر جہاں اس کا اسٹیج بنایا ہے کیا جاتا ہے۔ وہ دس دن کے پروگرام میں ایک دن مشارا بھی ہوتا ہے۔ اس بار اس مشارے کا کنوینز ہم کو بنایا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہے کہ اس بار کا مشارہ ہر سال سے اچھا ہو۔ اس کے لیے ہم ادھر جما ہوئے ہے۔ آپ لوگ اپنا اپنا سجیشن دو کہ مشارہ کو اچھا کرنے کے لیے کیا کیا کرنا ہے''۔ اتنا کہہ کر جمعدار اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

ایک پروفیسر نے کہا۔ ''ایسا ہے سر کہ شروع سے آخر تک مشاعرے کا کام بانٹ دینے کا''۔ انہوں نے سامعین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ٹھیک بولا کہ نہیں''۔ کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔ ہاں ہاں ٹھیک بولے کام ابھی بانٹ دو۔

جمعدار دوبارہ مائیک پر گئے اور فرمایا۔

''ایسا ہے کہ مشارا کی تیاری کی دیکھ ریکھ کرنے کو چھ آدمی کی مشارا کمیٹی رہے گی۔ یہ چھ آدمی ہمارے بینک مائناریٹی جمعدار کوآپریٹیو بنک کا اسٹاف ہے۔ بینک کا مینجر اس کمیٹی کا انچارج ہوگا۔ باقی پانچ آدمی اس کی نگرانی میں سب کام کرنے والے۔ اپنے سنیئر کالج اور جونیئر کالج کے اردو کے سب پروفیسر مشارا کمیٹی سے کونٹیکٹ رکھنے کا اور جو بھی کام کمیٹی دے اسے کرنے کا ہے''۔

اتنا کہہ کر جمعدار نے سامعین پر نظر دوڑائی اور کہا ''ادھر بحرالاسلام کالج کے پروفیسر آئے ہے کیا؟''

بحرالاسلام کالج کے شعبہ اردو کے تینوں پروفیسر یہ سن کر ایسے کھڑے ہوئے جیسے ماسٹر نے اسکول میں کہا ہو کہ بنچ پر کھڑے ہو جاؤ۔ تینوں نے مرنجاں مرنج لہجہ میں کہا۔

''جی سر ہم لوگ ادھر حاضر ہیں''۔

''تم لوگ بھی مشارا کمیٹی کے ساتھ ابھی سے کام کرنے کا۔ وہ لوگ جو کام دے کرنے کا ہے''۔

''جی سر'' تینوں نے کہا۔ اتنا کہہ کر تینوں بیٹھ گئے۔

جمعدار نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے بولنا شروع کیا۔

''مشارا میں پورے ہندوستان سے بڑے بڑے شاعر لوگ آنے والے ہے۔ یہ لوگ سال میں ایک بار آتے ہے اور چلے جاتے ہے۔ ہم لوگ ان کو مشارا میں سن لیتے اور بس۔ اس بار اتنا ہی نہیں کرنے کا۔ بلکہ مشارا میں سے دو چار شاعر کو ادھر اپنے کالج میں لانے کا ہے اور یہاں اپنے کالج میں اسٹوڈنٹس کے بیچ ان سے شعر سننے کا۔ اس سے اسٹوڈنٹس لوگ کو INSPIRATION اور ENCOURAGEMENT ملتا۔ اسٹوڈنٹس کی ٹریننگ بھی ہوتی۔ تو یہ کام بھی اس بار کرنے کا ہے۔ ہم لوگ اپنے آپ کو بہت اڈوانسڈ بولتے ہیں لیکن پچاس پچپن سال میں اپن لوگ نے ایک صرف ایک شاعر ایسا نہیں پیدا کیا جیسا ادھر نارتھ کا ہوتا۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے۔ تو شاعر کو ادھر کالج میں لانے کا اور دو تین دن ہی نہیں بلکہ ایک ہفتہ تک اپنے کالج میں ان کو ٹھہرانے کا اور شاعری سننے اور سیکھنے کا۔ اور تم بحرالاسلام کالج کے پروفیسر تم بھی سن لو اُدھر تمہارے کالج میں بھی یہ شاعر لوگوں کا دو تین دن تک اچھا پروگرام کرنے کا۔ وہ جو تم لوگ مردہ روتا سوتا پروگرام کرتے ایسا نہیں کرنے کا بلکہ پروگرام میں جان مانگتا جان۔ کچھ سمجھا کہ نہیں''۔

''جی سر'' تینوں نے کہا۔

جمعدار کھڑے ہو گئے اور اسٹیج سے اتر کر ٹرسٹ کے وائس پریسیڈنٹ سے بات کرنے لگے۔ اناؤنسر نے کہا ''میٹنگ ختم ہو گئی ہے۔'' بحرالاسلام کالج کے تینوں پروفیسر مشاعرہ کمیٹی کے انچارج احمد کے پاس پہنچے اور پوچھا ہم لوگوں کو کیا کام کرنا ہے۔

احمد نے کہا۔ ''ایسا ہے تم لوگ ہمارا موبائیل نمبر لکھ لو۔ اگر میرا نمبر انگیج جاتا ہو تو کمیٹی کے دوسرے ممبر سے بات کرو۔ ان کا نمبر بھی لکھ لو۔ تم لوگ کل دس بجے ہم سے کو

نٹیکٹ کرو۔ پھر ہم بتاتے کیا کرنے کا''۔

یہ مینیجر احمد دو سال پہلے مسلم کوآپریٹیو جمعدار بینک میں کلرک تھا۔ اب جمعدار کی خوشامد برداری کر کے مینیجر بن گیا تھا۔ اس سے رخصت ہو کر جاوید' مولانا اور شمیم ماما میاں اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے۔

کل جب یہ تینوں کالج میں پہنچے تو پرنسپل نے اپنے چیمبر میں بلایا۔ وہاں تینوں کو سو سو کارڈ مشاعرے کے دیے گئے۔ کہا گیا کہ یہ سو سو کارڈ آپ تینوں کو کالج، دوستوں اور شہر میں تقسیم کرنا ہے۔ یہ کام کل تک ہو جانا چاہئے۔

تینوں سو سو کارڈ ہاتھوں میں اٹھائے سر جھکائے چیمبر سے باہر آئے۔ جاوید نے مولانا سے کہا۔ ''لعنت ہے اس کام پر اور اس مشاعرے پر۔ خدا معلوم کیا کیا کرنا پڑے گا۔ یار ہم لوگ چپراسی سے بھی گئے گذرے ہو گئے۔''

''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔'' مولانا نے کہا۔

''دیکھئے کرنا تو پڑے گا۔ پرنسپل صاحب اور جمعدار صاحب دونوں کا حکم ہے۔'' پروفیسر شمیم ماما میاں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اپنی سہیلی سے بات کرنے لگیں۔ جاوید مولانا کے ساتھ کینٹین میں جا بیٹھا۔

''جناب یہ سو کارڈ کس کس کو دیے جائیں گے؟'' جاوید نے مولانا سے پوچھا۔

''اپنے جاننے والوں کو دے دیجئے۔'' مولانا نے جواب دیا۔

''بھئی مجھے جانتے ہی کتنے لوگ ہیں۔ دس آدمی مشکل سے ہونگے۔ بقیہ کارڈ کا کیا کریں گے؟''

''ایک ہی شخص کو دو دو تین کارڈ دے دیں گے اور کیا۔ جسے اُردو نہ بھی آتی ہو اسے بھی دیں گے۔ کس کس کو دیا نام تو بتانا نہیں ہے۔ کہہ دیں گے سارے تقسیم کر دیے۔''

یہ سن کر جاوید کو ذرا اطمینان ہوا۔ چلو جان چھوٹی۔ اگلے دن ایماندار کالج کا چپراسی اسٹاف روم میں دس بجے دن میں آیا اور جاوید سے کہا کہ آپ تمام اُردو والے

۱۲ ؍ بجے آدم کیمپس کے یونانی میڈیکل کالج کے کانفرنس ہال میں پہنچ جایئے۔ جمعدار صاحب میٹنگ لینے والے ہیں۔ بحرالاسلام کالج کے تینوں پروفیسر وقت مقررہ پر معینہ مقام پر پہنچ گئے۔ میٹنگ شروع ہوئی۔

جمعدار صاحب نے سامعین سے پوچھا۔ ''کیا رپورٹ ہے احمد کہاں تک کام پہنچا؟''

''سر ہم لوگوں نے سارے کارڈ بانٹ دیے ہیں۔'' احمد نے بتایا۔

''اور بحرالاسلام کالج کی کیا خبر ہے؟''

''سر ہم لوگوں نے بھی پورے کارڈ تقسیم کر دیے ہیں۔'' مولانا نے کھڑے ہو کر کہا۔

''ایسا ہے مشاعرہ تو شہر فیسٹیول گراؤنڈ میں ہوگا۔ اس موقع پر کالج میں جو پروگرام کرنا ہے اس کے لیے کیا کیا ہے۔'' جمعدار نے سامعین سے پوچھا۔

ایماندار کالج کی پروفیسر قدر آپا نے کہا۔ ''یہ پروگرام تو مشاعرے کے بعد کا ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے پر شاعروں کو یہاں بلا لیں گے۔ اتنا کہتے کہتے وہ ہانپنے لگیں۔ وہ اردو منہ اور ناک دونوں سے بولتی تھیں۔ بولتے ہوئے لگتا کہ کسی نشیب و فراز سے گذر رہی ہیں۔ چبا چبا کر الفاظ ان کے منہ سے نکلتے۔ اسکول میں پڑھانے کے بعد سنیئر کالج میں آئی تھیں اس لیے اسکولی لب ولہجہ اور فکر سوچ اب تک نہیں بدلے تھے۔

جمعدار نے ہدایت کی۔ ''تم لوگ پہلے سے ہی شاعروں سے ٹائم لے لو۔ وہ لوگ مشاعرے کے بعد کئی جگہ بلائے جاتے ہیں۔ کل سے وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔ جتنے کل آ گئے آ گئے باقی پرسوں شام تک آ جائیں گے۔ تم لوگ احمد سے شاعروں کا فون نمبر لے لو۔ ان سے بات کرو اور وقت اور تاریخ فکس کرلو۔ مشاعرہ کمیٹی کے ممبر شام میں فیسٹیول گراؤنڈ پہنچ جائیں گے۔ ادھر کا سارا انتظام دیکھنے کا ہے صبح تک۔ فیسٹیول کمیٹی ریاستی حکومت اور ضلع انتظامیہ بھی سب کچھ کر رہے ہیں لیکن مشارہ کی ذمہ داری مجھے دیا ہے اس لیے اس میں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہونے کا۔''

میٹنگ ختم ہوگئی۔

جاوید نے مولانا سے کہا۔ ''ہم لوگ اپنے کالج میں کتنے شاعروں کو بلا رہے ہیں۔''

''بھئی کم از کم دو یا تین تو ہونا چاہئے۔''

''ان دو یا تین سے فون پر بات کر لی جائے کہ فی الوقت وہ کہاں ہیں اور ہماری تاریخ میں وہ خالی ہیں کہ نہیں۔''

تین شاعروں کو پرنسپل کے فون سے فون لگایا گیا۔ معلوم ہوا وہ اور تین چار دوسرے شاعر جو فیسٹیول مشاعرہ میں مدعو ہیں سب اندور کے مشاعرہ میں کل موجود تھے اور آج سب راستے میں ہیں اور آپ کے شہر شام تک پہنچ رہے ہیں۔ تینوں شاعر سے جب بحر الاسلام کالج کے پروگرام کی بات کی گئی تو سبھوں نے حامی بھر لی۔ آنے کو تیار ہو گئے شام ہوتے ہوتے سبھی شاعر پہنچ گئے۔ سب مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے۔ جاوید نے مولانا سے کہا بھئی ان سے فون پر بات تو ہو گئی لیکن روبرو بھی تو گفتگو ہونی چاہئے۔ اس کے لئے ان ہوٹلوں میں جانا ہوگا جہاں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دونوں نے طے کیا کہ شام میں ہم لوگ ان سے ملنے چلیں گے۔ مشاعرے میں گہما گہمی رہتی ہے۔ وہاں پر اطمینان سے بات نہیں ہو پائیگی اس لیے ہوٹل جانا ہی پڑے گا۔ دونوں نے ملاقات کا آغاز شہر کے پوربی علاقے سے کیا جہاں ایک بڑے شاعر اور ایک نقاد ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ راستے میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ مولانا نے کہا مجھے ادھر ہی ایک مسجد ہے وہاں چھوڑ دیجئے۔ میں نماز پڑھونگا جبتک آپ ان شاعروں کو دیکھ آیئے آ گئے ہیں یا نہیں۔ جاوید نے کہا میں دیکھتا ہوں آپ نماز پڑھیے۔ اسکوٹر اسٹارٹ کیا وہاں جا کر دیکھا تو دونوں حضرات تشریف رکھتے تھے۔ جاوید نے کالج کا پروگرام بتایا۔ انہوں نے کہا ہمیں اعتراض نہیں ہے لیکن آپ مشاعرہ کے کنوینر سے اجازت لے لیجئے۔ اگر انہیں اعتراض نہیں ہے تو ہم لوگ تیار ہیں۔ جاوید نے بتایا ہم نے ان سے پوچھ لیا ہے ان کی اجازت ہے۔ شاعر بولے تو ٹھیک ہے۔ صبح دس بجے آ جایئے۔ پہلے کالج کا پروگرام کر لیں گے مشاعرہ رات میں۔ دونوں صاحب شغل کے لئے بیٹھ چکے تھے۔ جاوید نے کہا اچھا ہمیں اجازت دیجئے۔

''ارے ابھی آئے اور جانے لگے۔ تھوڑی دیر بیٹھئے۔'' شاعر نے کہا۔

جاوید نے بتایا معافی چاہتا ہوں۔ مجبوری ہے۔ ابھی ہمیں یہاں سے دس کیلومیٹر شہر کے مغربی علاقے میں جانا ہے۔ وہاں کے تمام ہوٹلوں میں شاعروں سے ملنا ہے۔ آج رات میں ہی ان سے کل دن میں کالج میں ہونے والے پروگرام کے لیے وقت لینا ہے۔ اب دیکھئے کتنے ملتے ہیں اور کہاں پر ملتے ہیں؟ شاعر نے نقاد سے کہا ہاں اس کا کہنا ٹھیک ہے۔ اسے جانے دیجئے۔ اسے دو چار شاعروں کو پکڑنا ہے۔ جاوید کی طرف دیکھ کر بولے ہاں ہاں تم جاؤ۔

وہ وہاں سے نکلا اور پھر تین کیلومیٹر پیچھے گیا جہاں ایک مسجد کے باہر ایک درخت کے نیچے گول چبوترے پر مولانا بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا شاعر ملے۔ ملاقات ہوئی؟ جاوید نے کہا ہاں ملاقات ہوگئی۔ اور وہ دونوں کل کالج کے پروگرام میں آئیں گے۔

مولانا نے پوچھا۔ ''اب بقیہ شاعروں کو کہاں کہاں ڈھونڈیں گے؟''

جاوید نے بتایا۔ ''مشاعرہ کمیٹی کنوینر احمد سے پوچھتے ہیں۔ اس کو معلوم ہوگا انہیں کن ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا ہے۔''

جاوید نے موبائیل لگایا۔ احمد نے بتایا کہ سارس باغ کے چاروں بڑے ہوٹل میں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ کون شاعر کس ہوٹل میں ہیں۔ تم لوگ ادھر جاؤ۔ چاروں ہوٹل میں چیک کرو۔ پتہ چل جائے گا۔

پچھلی سیٹ پر مولانا کو بٹھا کر جاوید نے سارس باغ کی طرف اسکوٹر کو دوڑایا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ گنپتی پوجا کا زمانہ تھا۔ سارا شہر اسپیکر کے گانوں سے گونج رہا تھا۔ بجلی کے قمقمے آسمان کے ستاروں کی طرح شہر پر چمک رہے تھے۔ سارس باغ شہر کا مشہور اور گنجان علاقہ تھا۔ گنپتی کے لئے لوگوں کا ہجوم سڑکوں پر اتر آیا تھا۔ شانے سے شانہ چھل رہا تھا۔ ٹریفک بند کردی گئی تھی۔ بس، رکشہ، ٹرک سب بند۔ چار پانچ کیلومیٹر پیدل جانا اور اتنی بڑی بھیڑ سے گذر کر جانا ناممکن تھا۔ کنارے کنارے بچ بچا کر جاوید اسکوٹر کو چلاتا رہا۔ بڑی

مشکلوں کے بعد وہ ہوٹل سارس تک پہنچا۔ تیسری منزل پر دو شاعر ملے بقیہ چار گنپتی میلا دیکھنے چلے گئے تھے۔ دو موجود شاعروں سے کل کے کالج پروگرام کا وقت لیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل ہی دس بجے ایماندار کالج میں بھی ادبی پروگرام ہے۔ ایماندار کالج کے پروفیسر ابھی آدھا گھنٹہ پہلے پروگرام بتا کر گئے ہیں۔ وہاں کا پروگرام ختم ہونے کے بعد آپ کے کالج میں آجائیں گے۔

جاوید اور مولانا اسکوٹر پر بیٹھے اور ہوٹل رنجیت میں پہنچے۔ سیکنڈ فلور پر چار شاعروں سے ملاقات ہوئی۔ بقیہ چار کھانا کھانے گئے تھے۔ چاروں سے کل کا وقت لیا۔ پھر ہوٹل راجپوت میں گئے۔ وہاں دو شاعر سے ملاقات ہوئی۔ وہ آنے کو تیار ہو گئے۔ ہوٹل شیکھر میں گئے وہاں ایک شاعر تھے انہوں نے بھی دعوت قبول کر لی۔

دونوں چوتھے ہوٹل سے باہر نکلے۔ لوگوں کی بھیڑ سے سڑک کی یہ حالت تھی کہ اسکوٹر کا چلانا مشکل تھا مجبوراً اسکوٹر کو ہاتھوں سے کئی کیلومیٹر تک کھینچنا پڑا۔ یہاں سے بھیڑ ہلکی تھی۔ کسی طرح بچ بچا کر چلاتے ہوئے کالونی پہنچے۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ سویرے اٹھنا تھا۔ جاوید نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات بھر خواب میں گنیش فیسٹیول کے مناظر آتے رہے۔ صبح نو بجے جاوید کالج میں موجود تھا۔ مولانا بھی اسی کالونی میں رہتے تھے اس لیے دونوں ایک ساتھ اسکوٹر سے کالج پہنچے۔ ایسے موقع پر مولانا بڑے مزے میں رہتے تھے۔ وہ پچھلی سیٹ پر بڑے آرام سے بیٹھتے کوئی اور ڈرائیو کرتا۔ مولانا کہتے ہاں بھئی چلئے ابھی اس کام کو کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اسکوٹر نہیں خریدی۔ حتیٰ کہ کالج سے کالونی پانچ کیلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وہ روزانہ تیار ہو کر سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے اور جو پروفیسر بھی کالج جاتا نظر آتا اس سے لفٹ لے لیتے۔ پروفیسروں سے اور جان پہچان والوں سے یہ لفٹ ایک دو سال نہیں بلکہ سترہ سال تک بغیر کسی ہچکچاہٹ کے لیتے رہے۔ لفٹ دینے والے کو ہچکچاہٹ ہو جاتی تھی مگر مولانا بے اثر۔ کئی پروفیسران کے اس رویے سے تنگ آگئے تھے۔ اس لیے جیسے ہی انہیں مولانا سڑک کے کنارے کھڑے نظر

آتے دور سے روڈ بدل دیتے۔ اور اگر اسی سڑک سے جانا ہوتا تو ان سے کہتے کہ وہ آگے وہاں پر میری فیملی ہے۔ پروفیسروں نے اسکوٹر یا بائیک خریدنے کی سہولتیں بھی بتائیں مگر مرد بے پرواہ پہ کلام نرم و نازک بے اثر۔

پروفیسر معظّر جو جمعدار کا پرانا نمک خور تھا ساڑھے آٹھ بجے آگیا تھا اور پرنسپل کو بتا آیا تھا کہ دیکھئے سال کا اتنا اہم پروگرام آج ہونے والا ہے۔ ہندوستان کے ممتاز شعراء تشریف لانے والے ہیں۔ اور یہ دونوں ابتک سو رہے ہیں۔ پرنسپل نے جاوید اور مولانا دونوں کے گھر پر فون لگایا اور فون پر ڈانٹا کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ آپ لوگوں کو کسی کام اور ذمہ داری کا ذرہ بھر خیال نہیں ہے۔ اتنا اہم پروگرام ہے اور ابتک آپ لوگ گھر میں بیٹھے ہیں۔ میں آپ لوگوں کے خلاف سخت کاروائی کرونگا۔ (کاش یہ کاروائی انہوں نے جبران کے ساتھ کی ہوتی) ابھی پانچ منٹ میں آپ دونوں کالج پہنچئے ورنہ میں مینجمنٹ سے شکایت کرونگا۔ جس وقت فون آیا جاوید کپڑے چینج کر رہا تھا۔ پرنسپل سے کہا جی سر پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ بیوی نے کہا ناشتہ تو کر لیجئے۔ کہا ارے ناشتہ کو مارو گولی۔ ابھی جان پہ بن آئی ہے۔ یہ پرنسپل کا فون تھا۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ فلیٹ سے باہر آیا اسکوٹر اسٹارٹ کی۔ باہر سڑک پر مولانا منتظر تھے۔ اسے لفٹ دی۔ کالج میں آئے۔ سیدھے پرنسپل چیمبر میں پہنچے۔ انہوں نے دوبارہ وہی باتیں دہرادیں جو فون پر سنائی تھیں۔ دونوں سر جھکائے سنتے رہے۔ مولانا نے کہا سر ہم لوگ آ ہی رہے تھے کہ آپ کا فون آیا۔ دراصل رات میں ایک بجے ہم لوگ سارس باغ میں مختلف ہوٹلوں میں شاعروں سے پروگرام کے سلسلے میں ہی بات کر رہے تھے۔ پرنسپل نے کہا۔ ’’لگتا ہے ایک آپ ہی رات میں کام کرتے ہیں۔ سال میں ایک بار کام کیا کر لیا جیسے کارنامہ انجام دے دیا۔ پھر تو سال بھر آپ لوگ بیٹھے ہی رہتے ہیں۔ پورے سال آخر کرتے کیا ہیں۔ جو کام دیا جاتا ہے اسے ذمہ داری سے پورا کیجئے ورنہ آپ لوگوں کی انکریمنٹ روک دونگا۔ جایئے دیکھئے جا کر مشاعرہ ہال کی کیا تیاری ہے۔‘‘

دونوں روتی صورت لے کر باہر نکلے۔ مولانا نے کہا۔ ’’دیکھئے ہم لوگ پوری

رات اسی پروگرام کے لیے دوڑ بھاگ کرتے رہے اور یہ صاحب صبح صبح فرمارہے ہیں کہ کچھ کرتے نہیں۔ انکریمنٹ روک دونگا۔ بھلا اس کا کوئی جواب ہے۔ خود تو رات بھر سوتے رہے اور ہم لوگوں کو نصیحت کررہے ہیں۔ کل جب یہ ڈپارٹمنٹ میں ریڈر تھے تو کتنا کام کرتے تھے ہمیں خوب معلوم ہے۔''

جاوید نے کہا۔'' ارے چھوڑیئے مولانا صاحب۔ وہ پرنسپل کی کرسی ہے۔ اس پر بیٹھنے کے بعد نیچے سے گرمی آنے لگتی ہے۔ دوسروں کو پریشان کرنے کے سارے اختیارات یاد آجاتے ہیں۔ ان کی لاف زنی کو بھول جایئے۔ ردعمل میں اسے موقع مل جائے گا وہ جس کے انتظار میں ہے۔ چلئے مشاعرہ ہال کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس حال میں ہے۔ کام ہی کرنا ہے تو اسے ہنستے ہوئے کیا جائے۔ خون جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ خون جلائیں ہمارے دشمن۔''

مولانا نے کہا۔'' لیکن پروفیسر شیخ معطر کو صبح صبح پرنسپل کو جا کر ہم لوگوں کی شکایت کرنے کی کیا پڑی تھی۔ ارے بھئی آدھا گھنٹہ پہلے آگئے تو کیا ہوا۔ پروگرام تو بارہ بجے ہے۔''

جاوید نے کہا۔'' سرخروئی۔ نظر میں آنے کے لئے۔ ٹرسٹی جمعدار کا پرانا بھگت ہے۔ اس ٹرسٹی سے پرنسپل کی بنتی نہیں ہے۔ جمعدار اسے اپنا آدمی سمجھتا ہے۔ ادھر پرنسپل کا بھی بننا چاہتا ہے۔ یعنی اُدھر بھی حلوا اور ادھر بھی میٹھا۔ جناب اسی خوشیابرداری میں وہ پرائمری اسکول سے یہاں تک پہنچا ہے۔ یہ آسان سفر نہیں ہے۔ کتنا لمبا راستہ طے کیا ہے اس نے۔ ملاحظہ تو کیجئے۔ پرائمری اسکول میں اسکول مینجمنٹ کی خوشامد کرکے ہائی اسکول میں آئے۔ ہائی اسکول مینجمنٹ کی خوشامد کرکے جونیئر کالج میں پہنچے اور جونیر کالج مینجمنٹ کی چاپلوسی کرکے سینئر کالج میں آئے۔ اب اسے وائس پرنسپل کی کرسی نظر آرہی ہے۔ اور اس کے لئے پرنسپل اور ٹرسٹی کی نعلین بوسی ضروری ہے۔'' یہی باتیں کرتے ہوئے دونوں ہال کی طرف جارہے تھے۔ سامنے سے پروفیسر شیخ معطر آتے نظر آئے۔ مولانا نے کہا۔'' ہم لوگ یہاں نو بجے پہنچے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے آئے ہونگے اور آپ نے پرنسپل سے جا کر ہم لوگوں کی شکایت کردی۔؟''

شاطر مسخرے کی طرح پروفیسر شیخ معطر نے اپنے چہرے کا رنگ بدلا ہونٹ پھیلایا دانت دکھایا اور کہا۔ ''نہیں نہیں وہ تو پرنسپل صاحب نے مجھے بلا کر پوچھا کہ کیا تیاری ہے تو ہم نے صرف اتنا کہا کہ وہ دونوں ابتک نہیں آئے ہیں۔''

مولانا نے کہا۔ ''جناب پہلے تو انہوں نے فون پر صبح صبح سخت وست سنایا اور پھر کالج میں اپنے چیمبر میں جو ادھورا تھا اسے پورا کر دیا۔ وہ دونوں ابتک نہیں آئے ہیں۔ یہ کہنے پر وہ اتنا برہم کیسے ہو سکتے تھے۔ یقیناً آپ نے کچھ اور کہا ہوگا۔'

پروفیسر شیخ معطر ے کہا۔ ''نہیں نہیں میں نے صرف دیر سے آنے کا ذکر کیا تھا۔''

جاوید نے کہا۔ ''اچھا اب آپ لوگ اس بحث کو ختم کیجئے اور ذرا ہال کو دیکھئے۔ ابھی اس کی صفائی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے بعد کرسیوں اور اسٹیج کی ترتیب کرنی ہے۔ مائیک، بورڈ وغیرہ سارے کام باقی ہیں۔ آیئے ایک ایک کر کے شروع کرتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی پروفیسر شیخ معطر نے کہا ''آپ لوگ ہال کو ارینج کیجئے۔ ذرا مجھے ایک ضروری کام ہے میں اسے کر کے فوراً واپس آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ نو دو گیارہ ہو گئے۔

مولانا نے جاوید سے کہا۔ ''دیکھا اس چغلخور منحوس کو کام کا نام سنتے ہی کیسے اسے اپنا ضروری کام یاد آ گیا اور چغلخوری سے پرنسپل کے آگے سرخرو بھی ہو گیا۔''

''اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کالج آنے کا یہی فائدہ ہے۔ صحت اور تعلقات دونوں تندرست۔'' جاوید نے کہا۔

''دیکھیں گے کاغذ کی ناؤ کب تک چغل خوری کے پانی میں چلتی ہے۔'' مولانا نے کہا۔

''جناب پروفیسر شیخ معطر صاحب کب کا گئے۔ آیئے ہال میں۔'' جاوید نے کہا۔ ہال میں فرش پر دھول اٹی تھی۔ کرسیاں ادھر ادھر منتشر۔ ڈائس پورا خالی۔ ایک کے بعد ایک چپراسی سے کہا گیا کہ بھئی تھوڑی مدد کر دیجئے۔ آج ایک ضروری پروگرام ہونے کا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے ممتاز شعراء تشریف لا رہے ہیں۔ اپنے لوکل ٹرسٹی بھی رہیں

گے۔ چپراسی نے کہا۔ ''میرے کو کسی نے یہ کام کرنے کو نہیں بولا ہے۔ اپنے پاس دوسرے کام پڑے لے ہیں۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔''

''دیکھیے پرنسپل نے کہا ہے کہ دو پیون کو لے لیجیے۔'' مولانا نے گذارش کی۔

''پن میرا نام تو نہیں لیا نا۔ کسی اور سے بولو۔'' یہ کہتے ہوئے چپراسی دوسری طرف چلا گیا۔

جاوید نے مولانا سے کہا'' پہلے پرنسپل سے طے کر لیتے ہیں کہ کونسا چپراسی ہال میں کام کرے گا۔ ورنہ اپنے کالج کے چپراسی کو تو جانتے ہی ہیں۔ پرنسپل سے تو تکار سے بات کرتے ہیں حتی کہ پرنسپل اور ٹرسٹ پر مقدمہ بھی کر دیتے ہیں ہم لوگ کس کھیت کی مولی ہیں۔''

جاوید اور مولانا دونوں پرنسپل کے پاس پہنچے۔ چپراسی کی کہانی سنائی۔ پرنسپل نے کہا اس چپراسی کو رہنے دو۔ علیم اور فیضان کو لے لو۔ میرا نام بتاؤ۔ دونوں چپراسی کو ڈھونڈ کر لائے۔ ہال کا کام شروع ہوا۔ کرسیاں ترتیب دے دی گئیں۔ ڈائس پر بھی کرسی میز لگا دی گئی۔ تین رنگ کی چاک شعبہ کیمسٹری لیب سے لا کر مولانا نے بلیک بورڈ پر پروگرام کی تفصیل لکھ دی۔ ہال تیار ہو گیا۔ جاوید اور مولانا پرنسپل کے پاس پہنچے۔ ہال کی رپورٹ دی۔ پرنسپل نے پوچھا'' اتنے شاعر لوگ آ رہے ہے۔ ٹرسٹی بھی رہیں گے۔ آڈینس کا کیا کیا ہے؟''

''سر صرف اُردو کے طلباء سے ہال نہیں بھر پائے گا۔ ہر کلاس میں اردو طالب علم کی تعداد کم ہے۔ اگر وہ سب بھی آ گئے پھر بھی ہال خالی رہے گا اور بارہ بجے آخری کلاس ہوتی ہے۔ طلباء اس وقت تک چلے جاتے ہیں۔ پروگرام بارہ بجے ہے۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔ ہال بھرنے کے لئے کامرس کے طالب علموں کو لانا پڑے گا۔'' مولانا نے بتایا۔

''ٹھیک ہے بارہ بجے ہال نمبر 32 اور 33 میں پروفیسر کریم' شارق کا لکچر ہوتا ہے۔ ان دونوں کو بتا دو کہ گیارہ بجے طالب علموں کو چھوڑ دیں اور کہہ دیں کہ وہ سب کانفرنس ہال میں جا کر بیٹھ جائیں۔ ایک اہم پروگرام ہونے والا ہے۔'' پرنسپل نے کہا۔

جاوید اور مولانا نے دونوں پروفیسروں کو پرنسپل کا پیغام دے دیا۔ جیسے ہی

ساڑھے دس بجا کامرس کے دونوں کلاس کے لڑکے اور لڑکیاں ہال میں آ کر بیٹھ گئے۔ اور وہ سب بے صبری سے شاعروں کا انتظار کرنے لگے۔ گیارہ بجا۔ کسی کا پتہ نہیں۔ پرنسپل نے کہا بھئی معلوم کرو شاعر کہاں ہیں ان کو آنے میں دیر کیوں ہورہی ہے۔ فون لگایا گیا۔ سب مدعوئین شعراء نے کہا جناب ہم آپ کے بازو کے کیمپس میں نو بجے سے موجود ہیں۔ ادھر کا پورا کیمپس دیکھ لیا ہے۔ اور ساڑھے دس بجے سے ایماندار کالج میں ادبی پروگرام چل رہا ہے۔ بس ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد آپ کی طرف آرہے ہیں۔ پرنسپل کو بتایا گیا۔ انہوں نے جاوید سے کہا تم ایماندار کالج جاؤ۔ بتانا ہم آپ کو لینے آئے ہیں اور ساتھ میں لیتے ہی آؤ۔ دوڑتے بھاگتے ایماندار کالج میں پہنچا۔ وہاں پروگرام شروع تھا۔ شعراء حضرات تھے اور ٹرسٹی ایماندار بھی۔ اس کے سامنے کہنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ شاعروں نے پہلے وہاں کا وعدہ کیا تھا اس کے بعد بحرالاسلام کالج کا۔ بارہ بج گئے۔ جاوید کو پرنسپل کا فون آیا۔ جلدی کرو، لڑکے بھاگنے بھاگنے کو ہیں۔ جاوید نے کہا کوشش کررہا ہوں۔ ایک بجے پروگرام ختم ہوا۔ کالج کے تھرڈ فلور سے نیچے اترنے اور گاڑی میں بیٹھنے تک میں بیس منٹ لگ گئے۔ چند شعراء پیدل ہی چل پڑے۔ جاوید پیدل شاعروں کے ساتھ بھاگتا ہوا مشاعرہ ہال میں پہنچا۔ پرنسپل ہال میں موجود تھے۔ مقامی ٹرسٹی جمعدار کے پرانے بھگت اور ڈرپوک اس لیے کامرس کے تمام لڑکوں کو لے کر ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ڈیڑھ بجے پروگرام شروع ہوا۔ گلپوشی' چادرپوشی' اپنے اپنے خیالات کا اظہار۔ جاوید پروگرام کنڈکٹ کررہا تھا۔ دو دو بار ایماندار کالج تک بھاگ کر جانے اور دوڑ کر آنے سے وہ اپنی سانس بھی درست نہیں کر پایا تھا۔ پھر بھی وہ کوشش کررہا تھا کہ کہیں کوئی بھول چوک نہ ہو جائے۔ ٹرسٹی نے جو کچھ اپنے کالج میں کہا تھا اسی کو یہاں بھی دہرادیا۔ دراصل پروگرام کے پردے میں وہ خودنمائی چاہتے تھے۔ دور دراز سے آئے ہوئے شاعروں کو بتانا مقصود تھا کہ ہم تنہا اپنے کیمپس میں کون کون سے ادارے چلا رہے ہیں۔ اور بحرالاسلام کالج بھی ہمارے ٹرسٹ کا ہی ایک حصہ ہے اور اس پر بھی ہماری نگرانی رہتی ہے۔

مجموعی طور پر اس پورے کیمپس کے ہم روح رواں ہیں۔ ہمارے کارناموں کو تسلیم کیجئے اور اپنے اپنے علاقوں میں جا کر ہمارا ذکر کیجئے۔ایک شاعر صاحب نے جمعدار کا قصیدہ اس طرح پڑھا کہ ایماندار صاحب اس زمانے میں جنوبی ہند کے سر سید ہیں۔ان کا کارنامہ بے مثال ہے۔ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ہم ایماندار صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔جاوید کے بازو میں بیٹھے ہوئے پروفیسر نے جاوید کے کان میں کہا اس شاعر کی چمچہ گیری دیکھو اب اگلے سال یہ دوبارہ ضرور بلایا جائے گا۔یہی تو ایماندار کو چاہیے اور یہی اس ادبی پروگرام کا مقصد ہے۔سامعین، کامرس کے لڑکے اور مختلف سبجکٹس کے پروفیسر تو مجبوراً اور مروتاً یہاں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ان خوشامدی شاعروں کو دیکھو۔ وہ پروفیسر جو ایک مہینہ پہلے سے پروگرام کی تیاری کرتے آرہے ہیں۔رات رات بھر جاگ کر شاعروں کو ڈھونڈا۔وقت لیا، دوڑ کر پیدل چل کر انہیں یہاں تک لائے۔ان کی محنت کا کوئی شکریہ بھی نہیں کہہ رہا ہے۔اور سب ملکر جمعدار صاحب کی کارکردگی کی فہرست بنا رہے ہیں۔

تمام شاعروں نے اپنے اپنے کلام سنائے۔ڈیڑھ گھنٹہ تک پروگرام چلا۔ڈھائی بجے ختم ہوا۔ پروگرام کے بعد کسی نے ایک لفظ جاوید اور مولانا سے نہیں کہا کہ شکریہ، مبارک، آپ نے اچھی طرح پروگرام کا نظم ونسق کیا۔ نہ پرنسپل نے نہ ایماندار نے۔گویا مزدور سے کام لیا۔حساب برابر، گویا یہ تو کالج کی ڈیوٹی میں تھا۔مولانا نے جاوید سے کہا۔

”جناب ہم لوگوں کی دن رات کی محنت پر کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔“

جاوید نے کہا۔”بھئی ایسے کالج میں سب سے اوپر ٹرسٹی اور اس کے نیچے پرنسپل۔ ٹرسٹی دنیا جہان کی تعریفیں خود لینا چاہتا ہے۔اس کے بعد جو کچھ بچ جاتا ہے اس پر جھپٹتا ہے پرنسپل۔اب اس کے بعد بچتا کیا ہے جو آپ کو ملے۔اگر ملے گا بھی تو پرنسپل کے حواریوں جواریوں کو۔ہم آپ کس شمار میں ہیں۔ہماری حیثیت خادم کی ہے۔“

مولانا نے کہا۔”بھئی انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ اخلاق' اقدار' تہذیب اور مذہب میں کیا یہ ہے کہ کسی کی محنت کا اجر نہ دیا جائے۔اجر نہیں تو شکریہ بھی ادا نہ کیا جائے۔

ایسا کس تہذیب کی روشنی میں کیا جارہا ہے۔ یہ شاعروں کا جمگھٹ' یہ پروگرام' یہ مشاعرہ آخران کا مقصد کیا ہے؟ یہی کہ سب کچھ ان کے برعکس کرو۔ یہ مشاعرہ اور پروگرام اردو زبان اور اردو تہذیب کا ہی ایک حصہ ہے۔ اردو تہذیب میں کہیں پر یہ مرقوم نہیں ہے کہ اپنے مربی کا شکریہ نہ ادا کرو۔ احسان کو بھول جاؤ۔ اس تہذیب کی پہچان تو یہ ہے کہ معمولی سے احسان کا ہمیشہ ذکر کرو اور زندگی بھر اس کے ممنون و مشکور رہو۔ اس تہذیب میں احسان فراموشی ظلم ہے ناانصافی ہے۔''

جاوید نے کہا۔'' بھئی آپ نے ان لوگوں کی بے رخی کو دل پر لے لیا۔ اور یہ مشاعرہ اور پروگرام میں آپ نے زمین آسمان کے قلابے کیوں ملا دیے۔ اردو' تہذیب' اقدار اور احسان فراموشی ان تمام کو ایک جگہ کیوں جمع کر دیا۔ ان کا اس مشاعرے اور پروگرام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے کارکنان کو زبان و ادب اور مشاعرے سے کوئی دلچسپی ہے۔ یہ سب نمائش ہے۔ دکھاوا ہے بلکہ فریب ہے سراب ہے۔ جناب یہ فیسٹیول ہر سال منعقد ہوتے ہیں۔ حکومت کے لاکھوں روپے اس پر خرچ ہوتے ہیں۔ ضلع' ریاست اور مرکز سے مالی امداد ملتی ہے۔ علاقے کا ایم۔ پی اس فنڈ پر نظر رکھتا ہے۔ اس کی نگرانی میں فیسٹیول کے سارے پروگرام دس دنوں تک ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے سیاستداں نے مشاعرہ کی ذمہ داری کسی شخص کو سونپی تو ظاہر ہے اس کا بھی اپنا مقصد ہوگا۔ وہ مقصد سیاسی ہو یا سماجی سہی وقت پر وہ اس کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں اور یہ جو فلاں صاحب نے اُردو' زبان اور تہذیب کی بلندیاں بتائیں سب دکھاوا ہے۔ نہ اسے مشاعرہ سے دلچسپی ہے نہ ادبی پروگرام سے اور نہ اُردو تہذیب وتمدن سے۔ کنوینز شپ کے بہانے وہ سیاستدانوں کے قریب آتے ہیں اور صحیح موقع پر اپنے غیر امدادی اداروں کے لیے مدد اور نئے ادارے کھولنے کی اجازت عمارت سازی اور زمین کے تنازعوں میں قانونی مدد حاصل کر لیتے ہیں۔ مشاعرے کا لب لباب یہی ہے۔ اور آپ کے ذہن میں ایسے افراد کے بارے میں جو نیک خیالات قائم ہیں انہیں نوچ کر پھینک دیجئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو

زبان وتہذیب کو ذریعہ بناتے ہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے۔ اگر ان کے بس میں ہو تو یہ ایک گھنٹہ میں اردو لائبریری کی تمام اُردو فارسی اور عربی کی کتابوں کو سڑک پر پھینکوا کر انہیں نذر آتش کر دیں۔ کیونکہ وہ انہیں بے سود، بے فائدہ اور بے مقصد سمجھتے ہیں۔ ان کا تو یہ بھی خیال ہے کہ اردو زبان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زمانہ انگریزی اور کمپیوٹر کی طرف جا رہا ہے۔ اس عالم میں اردو کو زندگی کا ذریعہ بنانا سراسر بے وقوفی ہے۔ ان کی مجبوری ہے ورنہ کب کا اس زبان کو وہ اپنے کیمپس سے راندۂ دربار کر چکے ہوتے۔ قرب وجوار میں مسلمان رہتے ہیں۔ یہاں سے انہیں اپنے ادارے کے لیے طلباء ملتے ہیں۔ ان میں پچاس فیصد طلباء کا خاندانی پس منظر اردو کا ہوتا ہے۔ اس لیے اردو کا نام لینا، مشاعرہ کروانا، شاعروں کو استقبالیہ دینا دراصل پچاس فیصد اردو والے مسلمانوں کو خوش رکھنے کا تماشا ہے۔ اعلی الاعلان اردو کے خلاف بولنے سے لوگ خفا ہو جائیں گے۔ انہیں رہنا ہے انہیں مسلمانوں کے درمیان اس لیے ان کی زبان کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف پچاس فیصد ایسے طلباء ہوتے ہیں جو پروفیشنل کورسیز میں داخلہ لیتے ہیں۔ بھاری ڈونیشن دیتے ہیں اور ان کا تعلق غیر اردو خاندانوں سے ہوتا ہے۔ آئی بات مزاج شریف میں۔ دن رات اپنے بینک کے ملازموں اور دونوں کالج کے پروفیسروں کو دوڑا دوڑا کر ایک کامیاب مشاعرہ کروا دیا اور اس کا اجر خاموشی سے انہیں مل جائے گا کسی نئے ادارے کھولنے کی شکل میں یا ڈونیشن سیٹ بڑھانے کی صورت میں۔ اور آپ ہیں کہ ایسے افراد سے شکریہ چاہتے ہیں ہمت افزائی کے طالب ہیں۔ گولی ماریے ایسے مشاعرہ کو اور ایسے ادبی پروگرام کو۔ سارا معاملہ لین دین کا ہے۔ اردو کے نام پر تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک تماشا ہے۔ دیکھئے لطف اُٹھایئے اور بھول جایئے۔ سال میں ایک بار اس کے نظم ونسق میں ہاتھ بٹایئے۔ کیوں خواہ مخواہ تناؤ میں آتے ہیں۔ اسے ملازمت کا ایک حصہ سمجھ لیجئے۔ یہ کالج ہے اور وہ بھی مینجمنٹ کا یہ سب تو چلتا ہی رہے گا۔ اور پھر دوسرے پروفیسر بھی تو ہیں۔ چغلخوری' جاسوسی' ٹیوشن' اور توڑ جوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ان پر تو کچھ نہیں ہوتا۔ ایک آپ ہیں کہ SERIOUS ہو جاتے

ہیں۔ زیادہ مت سوچئے آرام سے رہئے۔ محمد علی جوہر اور مولانا آزاد کی طرح مت سوچئے۔ بھئی اپنے آپ کو پروفیسر ملازم کیوں نہیں سمجھتے ہیں۔ ذہن سے پروفیسری کا خبط نکال دیجئے۔ یہ لفظ بس سننے میں اچھا لگتا ہے لیکن پروفیسر یہاں چپراسی سے بھی بدتر ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لیجئے۔ اور اپنی اصل حیثیت میں آجایئے۔ دیکھئے پھر آپ کو سب کچھ کیسے نہیں اچھا لگتا ہے۔ یہی ٹرسٹی اور پرنسپل آپ کو خوبصورت اور دلکش نظر آنے لگیں گے۔ ہر پروفیسر آپ کو چاند ستارہ نظر آنے لگے گا۔ یہ کالج آپ کے لئے جنت بن جائیگا۔ آپ ہر طرح کے ذہنی دباؤ سے نجات پالیں گے۔ کیوں اتنا لیکچر کافی ہے یا کچھ اور اظہار خیال کیا جائے۔ مولانا نے کہا نہیں نہیں بہت ہو گیا۔ آپ کا کہنا سو فیصد صحیح ہے۔ پھر دونوں اپنی اپنی کلاس میں چلے گئے۔

دوسرے دن کے اخبار میں جو خبر آئی اس میں بھی ساری کہانی ٹرسٹی اور پرنسپل کی۔ انہیں کی تصویریں، انہیں کے اقوال زریں، جاوید اور مولانا اخبار ہاتھ میں لئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اپنی حیثیت اور مقدر کو سوچتے رہے، کوستے رہے اور خاموش ہو گئے۔

ایک بجے کلاس ختم ہوئی۔ حاضری رجسٹر لوکر (LOCKER) میں رکھ کر اسٹاف روم سے باہر نکل رہا تھا کہ صدر شعبہ پروفیسر نعیم سامنے سے آتے نظر آئے۔ جاوید نے کہا ''چل رہا ہوں خدا حافظ۔''

''رکیے، کل آپ صبح آٹھ بجے کالج آجایئے۔'' انہوں نے کہا۔

''کوئی خاص کام؟''

''ہاں ذرا بزم ادب کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔ ہم سارے کلیگ ایک میٹنگ کر لیں گے تاکہ پروگرام کا تعین اور اس کا خاکہ تیار ہو جائے۔ ایسا کرنے سے پروگرام منعقد کرنے میں آسانی ہوگی۔'' پروفیسر نعیم نے کہا۔

یہ تو بڑا اچھا سوچا ہے۔ کل میں مقررہ وقت پر آجاؤنگا انشاء اللہ۔ خدا حافظ کہتا ہوا جاوید بس اسٹینڈ روانہ ہو گیا۔ راستے میں کئی طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے

رہے۔کئی مہینوں بعد یہ پروگرام ہونے جا رہا ہے۔ چلو دیر ہی سہی مگر ہو تو رہا ہے۔اسے اپنی یونیورسٹی کی یاد آئی جہاں اکثر ادبی پروگرام ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی کو خیر باد کرکے اسے چودہ سال گزر چکے تھے۔اس دوران وہ ادبی سرگرمیوں سے اور ادب سے بہت دور ہو گیا ہے۔ادب سے بس یونہی سا تعلق رہ گیا ہے۔ یہی سلسلہ رہا تو ادب اس کے لئے ایک بھولی ہوئی یاد بن کے رہ جائے گا۔اس نے ایک بار اپنے کسی استاد کو لکھا تھا سر یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری۔سر یہاں اردو جانکار کو ڈھونڈنا پڑتا ہے اور مل جانے پر اس سے گفتگو کرنے کے لیے چائے پلانا پڑتی ہے۔یہاں مجھے چودہ سال ہو چکے ہیں۔رام جی کے بن باس کی مدت چودہ سال تھی۔تو میری چودہ سے زیادہ کیوں۔ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بیوقوف استاد بھی تو ہوتے ہیں۔ میں ایسا استاد بننے کو تیار ہوں۔ وہاں اردو میں گفتگو کرنے کے لئے کسی کو ڈھونڈنا تو نہیں پڑیگا۔استاذی گرامی نے یہ بتایا کہ یہ بن باس وغیرہ کا ذکر کر کے مجھے دکھ مت پہنچاؤ۔آدمی جہاں رہتا ہے وہاں دوست بھی بناتا ہے۔تم بھی ایسا کرو مگر یونیورسٹی کا خواب خرگوش دیکھنا بند کردو۔انہوں نے اپنی نصیحت سے یہ واضح کردیا کہ تم کالج کے لائق ہو اور یونیورسٹی کے لیے نالائق اور خواب اپنی حد میں دیکھنا چاہیے اور یہ جو ہم لوگ سال میں دو تین بار شہر شہر سیمینار میں شرکت کرتے ہیں تو وہاں بھی تو کوئی ہمارا شاگرد رہنا چاہیے جو میرے استقبال کو حاضر رہے۔اگر سب کے سب یونیورسٹی کے شعبہ میں چلے آئے تو میرا استقبال کون کرے گا۔اور اتنی آسانی سے کہاں کوئی یونیورسٹی کے شعبہ میں لگتا ہے۔اس کے لئے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ پروفیسروں کی جوتیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔حقہ بھرنا پڑتا ہے۔ بیگ اٹھانا پڑتا ہے۔سبزی لانی ہوتی ہے۔ بچے کو اسکول لے جانا پڑتا ہے۔ پروفیسر کی بیگم کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ یہ سب تو تم نے کیا نہیں اور لگے خواب دیکھنے۔اپنی حیثیت میں رہو اور جہاں ہو وہیں رہو۔ چلے ہیں یونیورسٹی شعبہ **میں استاد بننے ایں منہ اور مسور کی دال۔ سامنے سے اچانک ایک موٹر سائیکل نے کراس کیا اور اسے یاد آیا کہ ارے بزم ادب سے نکل کر میں بھی کون سی بزم میں چلا گیا تھا۔چلو خدا کا**

شکر ہے کسی کو تو بزم ادب کا خیال آیا۔ کل کو چند اچھے پروگرام کا خاکہ تیار کرلیں گے اور اس کی تاریخ بھی طے کرلیں گے۔ اس طرح کے پروگرام ہونے ضروری ہیں ورنہ طلباء میں ادبی دلچسپی کیسے پیدا ہوگی۔ آخر انہیں بھی تو پتہ چلنا چاہئے کہ ادب کیا ہے اور اردو زبان کو بطور سبجکٹ کیوں پڑھنا چاہئے۔ اس لیے ایسے پروگراموں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ویسے بھی حکومت اس زبان سے بے رخی برت رہی ہے۔ اگر اردو والے خود ہی آگے نہیں بڑھیں گے تو کون اس کا پرسان حال ہوگا۔ بس اسٹینڈ آ گیا تھا۔ بسوں اور مسافروں کی گہما گہمی میں اس کے شعور کی رو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کے علاقے کو جانے والی بس بھی آ گئی۔ اندر داخل ہوا۔ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے حد نگاہ تک کے مکانوں' دکانوں اور انسانوں کو دیکھنے لگا۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر وہ کالج پہنچ گیا۔ اسٹاف روم میں صدر شعبہ پروفیسر نعیم صاحب موجود تھے۔ جاوید نے پوچھا میٹنگ کس کمرے میں ہوگی۔ انہوں نے کہا آیئے میرے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ صدر شعبہ نے بتایا میں نے اپنے شعبہ کے دوسرے ساتھیوں سے بھی میٹنگ کی جگہ بتا دی ہے۔ دونوں چلتے چلتے ایک چھوٹے سے کمرے کے پاس پہنچے جو شعبہ حیوانیات کے صدر شعبہ پروفیسر عبدالقوی کا کیبن تھا۔ لمبا قد، لمبی داڑھی، اونچی ٹوپی، چست پاجامہ، اور شیروانی میں جکڑے کرسی پر اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ دونوں نے سلام کیا اور اندر آنے کی اجازت مانگی۔ گردن ہلا کر اجازت دی۔ صدر شعبہ اور جاوید کرسی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں پروفیسر شمیم ماما میاں بھی آ گئیں۔ جاوید سمجھ نہیں رہا تھا کہ بزم ادب کی میٹنگ شعبہ حیوانیات کے کمرے میں اور صدر شعبہ حیوانیات کی صدارت میں کیوں ہو رہی ہے۔

پروفیسر نعیم نے پوچھا۔ ''تو ڈاکٹر صاحب بزم ادب کے پروگرام کے لئے کون سا موضوع انتخاب کرنا چاہیے؟'' پروفیسر عبدالقوی نے فرمایا۔ ''نعیم صاحب تھوڑی دیر ٹھہریئے۔ پہلے ہم لوگ چائے پی لیں۔'' چائے آ گئی' چائے پیتے ہوئے عبدالقوی صاحب

نے ارشاد کیا۔

''کیوں نعیم صاحب چائے کیسی لگ رہی ہے۔ یہ کالج کی نئی کینٹین کی چائے ہے''۔

نعیم صاحب نے کہا۔''چائے پہلے کی بہ نسبت بہتر ہوگئی ہے۔''(حالانکہ چائے کا ذائقہ پہلے جیسا تھا)۔

پروفیسر عبدالقوی نے فرمایا۔''ہاں میں نے بہت سوچ سمجھ کر کالج مینجمنٹ سے تبادلۂ خیال کے بعد اس نئے آدمی کو کالج کینٹین ایک سال کے لئے ٹھیکے پر دلوائی ہے(کالج کے چھوٹے سے چھوٹا کام کا ذکر ہر کسی کے سامنے وہ اسی طرح کرتے تھے کہ پودا لگوانے کے لئے،نئی میز لانے کے لئے' کھڑکی بدلنے کے لئے میں نے مینجمنٹ سے بات کی ہے۔ خدا معلوم مینجمنٹ سے واقعی ان کی بات ہوتی تھی یا تاثر قائم کرنے کے لئے وہ اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ پروفیسروں کا کہنا تھا کہ اس کی مینجمنٹ سے کوئی گفتگو نہیں ہوتی ہے جھوٹ بولتا ہے) میں نے کینٹین مینیجر کو ہدایت کردی ہے کہ تمہاری اشیائے خوردنی میں کوانٹیٹی نہیں بلکہ کوالیٹی ہونی چاہیے۔ تیس ہزار روپے سالانہ پر یہ کانٹریکٹ ہوا ہے۔''

پروفیسر نعیم نے کہا۔''قوی صاحب وہ زمانہ بھی کیا تھا جب ایک عورت اس کینٹین کو چلاتی تھی۔ وہ مختلف طرح کی اشیائے خوردنی بناتی تھی۔ لذیذ خوش ذائقہ اور سستی۔''

''میں نے بھی موجودہ ٹھیکدار سے کہہ دیا ہے کہ اچھی چیزیں بنائے اور قیمت کم ہو۔''پروفیسر قوی نے فرمایا۔

کینٹین کی شاندار تاریخی گفتگو کو قطع کرتے ہوئے پروفیسر شمیم مامامیاں نے کہا۔

''دیکھئے سر اس بار گیارہویں درجے میں صرف چار طالب علموں نے اردو سبجکٹ رکھا ہے۔ آخر یہی لڑکے بارہویں میں آتے ہیں پھر اس کے بعد ہم لوگ انہیں بی۔اے سال اوّل میں پڑھاتے ہیں۔ اگر نچلی جماعت میں ہی ان کی تعداد کم ہوگئی تو اوپر آتے آتے بالکل نہ کے برابر ہوجائے گی۔ پھر اردو کا کیا ہوگا۔ اور اگر طالب علم کم ہونگے تو شعبہ میں جو سب سے آخری لکچرر ہے وہ پارٹ ٹائم ہوجائے گا۔''

اچانک ایسی گفتگو کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ میٹنگ بزم ادب کی تھی۔ گیارہویں میں داخلہ، بی۔اے میں پڑھانا، اردو کا مستقبل اور جونیئر لکچرر کی ملازمت کو خطرہ۔ اتنے سارے مسائل کے جواب کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ مگر یہ بات پروفیسر شمیم ماما میاں نے کہی تھی اور پروفیسر نعیم اور پروفیسر قوی محترمہ سے متاثر تھے۔ ان کے لیے نیک خیال رکھتے تھے اس لیے ان کے بیان کو رد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ سب خاموش ہو گئے۔ جاوید کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے کہا۔

''میڈم مجھے بچائیے۔ اب میں کہاں جاؤنگا۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

میڈم حالانکہ وہ اب بھی کنواری تھیں اور کسی شریف شریک حیات کی تلاش میں تھیں۔ بولیں ''آپ گھبرائیے نہیں۔ میں آپ کو جانے نہیں دونگی۔ کم از کم آپ کو تو بچا ہی لونگی''۔ (خدا معلوم کہاں بچا لیتیں دامن میں یا ساون میں)۔

جاوید نے گھبراتے ہوئے کہا (جیسے وہ آج ہی پارٹ ٹائمر ہو جائے گا) ''ہاں میڈم میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ جو کہیں گی میں کرونگا''۔

''آپ نے ہم لوگوں کو دعوت کیوں نہیں دی۔ آپ کی شادی ہو گئی اور ہم لوگ اب تک دعوت سے محروم ہیں۔'' میڈم نے سوال کیا۔

''میری بیگم ابھی اپنے میکے میں ہے۔ اور میں یہاں دوسری ریاست میں۔ مکان ڈھونڈ رہا ہوں ملتے ہی اسے بلا لونگا۔ پھر آپ لوگوں کی دعوت کرونگا۔'' جاوید نے وعدہ کیا۔ یہ کم بخت ماری ہمیشہ قانونی پیچیدگیوں کو ڈھونڈ کر لاتی ہے۔ اور بالواسطہ طور پر ملازمت پر چوٹ کرتی ہے۔ وہ کبھی علمی بحث نہیں کرتی تھی۔ پارٹ ٹائم، فل ٹائم، چار اسٹوڈنٹس، بیس اسٹوڈنٹس اس کا ذکر وقفے وقفے سے کرتی رہتی تھی۔ پتہ نہیں اس کا کیا مقصد ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس بہانے وہ جاوید کو ذہنی طور پر خوفزدہ کرنا چاہتی تھی۔ ورنہ یہ کون سا موقع تھا جس میں بزم ادب کے پروگرام کی **جگہ اردو کا مستقبل**، فل ٹائم، پارٹ ٹائم پر مباحثہ ہو۔

''تو بزم ادب کے پروگرام کے لیے کیا کرنا چاہیے؟'' صدر شعبہ نے کہا۔

''میرے خیال میں نعت خوانی بہت اچھی رہے گی۔ اس کے لئے طلباء اور طالبات کو بڑی آسانی سے میں تیار کرسکتی ہوں۔'' پروفیسر شمیم ماما میاں نے کہا۔

''یہ ماہ میلاد بھی ہے، اچھا ہوگا' بہتر ہوگا' کیوں جاوید صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟'' پروفیسر قوی نے فرمایا۔

ابھی پروفیسر شمیم ماما میاں نے کہا ہے گیارہوں میں صرف چار لڑکوں کا داخلہ اردو میں ہوا ہے۔ نقصان آخری آدمی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ آخری آدمی میں ہوں۔ میں نے شادی کا کھانا ابھی تک نہیں کھلایا ہے۔ ان حالات میں کس طرح نعت خوانی سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ جاوید نے کہا'' ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا رہے گا۔ ماہ میلادالنبی بھی ہے۔ لڑکے بھی دلچسپی لیں گے۔''

صدر شعبہ نے کہا۔''میں دو نعت خواں کو جانتا ہوں۔ دونوں مسجد کے امام ہیں۔ بہت اچھی نعت پڑھتے ہیں۔''

پروفیسر قوی نے کہا۔'' ہاں نعیم صاحب آپ ان دونوں امام صاحبان سے طے کرلیجئے۔ وہ کب آئیں گے کتنا نذرانہ لیں گے۔ پروفیسر نعیم' پروفیسر شمیم ماما میاں اور جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولے'' تو کیا خیال ہے نعت خوانی کا پروگرام سب سے پہلے کرلیا جائے؟''

''جی بہتر ہوگا۔'' جاوید نے کہا۔

پروفیسر قوی گویا ہوئے۔''نعیم صاحب بزم ادب کے دوسرے پروگرام کا کیا ہوگا؟''

صدر شعبہ نے فرمایا۔''یو جی سی نے اپنے کالج کو تین لاکھ روپے دیا تھا۔ اس میں وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈر خریدا گیا ہے۔ ویڈیو کیسیٹ خریدنے باقی ہیں۔ میرے خیال میں بزم ادب کا اگلا پروگرام قوالی کا رکھا جائے۔ میرے پاس نصرت علی فتح علی کے کیسیٹ ہیں۔ بڑی اچھی قوالی ہے۔ ایک ایک قوالی ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کی ہے۔ اس پروگرام میں ٹکٹ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ میرے پاس دوسرے کیسیٹ مولانا اقبال الدین کے ہیں جس میں

انہوں نے اقبال کے دینی خیالات پر تقریر کی ہے۔ آئندہ بزم ادب کے پروگرام میں اسے رکھ لیں گے۔ اور اس کے بعد آؤ قرآن سمجھیں اس موضوع پر ہمارے پاس کئی کیسیٹ ہیں ایک پروگرام اسی پر رکھ لیا جائے۔

پروفیسر قوی نے کہا۔ ''واہ واہ نعیم صاحب آپ کے پاس بزم ادب کے پروگرام کا تو ذخیرہ ہے۔ کیوں نہ ہو آخر آپ نے بیس سال سے یونہی نہیں اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ واہ آپ نے تو طبیعت خوش کر دی۔ تو پہلے نعت خوانی ہو جائے اور اسکے فوراً بعد قوالی کے ویڈیو کیسیٹ کے پروگرام ٹی وی اپنے کالج میں ہے ہی۔ پروفیسر قوی نے جوش میں کہا۔

پروفیسر شمیم ماما میاں نے فرمایا۔ ''مجھے تو چار لڑکیوں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ نعت خوانی میں حصہ لیں گی۔'' پروفیسر قوی نے جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جاوید صاحب آپ بزم ادب کے پروگرام میں کچھ دلچسپی نہیں دکھا رہے ہیں۔ آپ جوان ہیں۔ کچھ کیجئے۔ آپ کی طرح ہم تھے تو نہ جانے کتنے ادبی پروگرام کئے۔ نعیم صاحب سے پوچھ لیجئے۔ کیوں نعیم صاحب؟''

صدر شعبہ نے ارشاد کیا۔ (جنہوں نے بیس سال میں ایک مضمون نہیں لکھا تھا) ''ہاں ہاں ہم لوگوں نے تو اس دور میں جب سابق پرنسپل اردو کے خلاف تھے اس کے باوجود بے شمار اور بہترین پروگرام کئے۔''

پروفیسر عبدالقوی نے کہا۔ ''جاوید صاحب ابھی تو ماشاء اللہ ہمارے موجودہ پرنسپل ادب نواز ہیں۔ (جو اردو قطعی نہیں جانتے تھے) آپ کو کسی بھی طرح کی دشواری نہیں آئے گی۔ وہ ہر طرح ہمارے پروگرام میں تعاون دیں گے۔ میں مینجمنٹ سے (پھر مینجمنٹ) بات کرسکتا ہوں اگر کسی چیز کی درکار ہو تو بتایئے۔

''نہیں نہیں اتنا اوپر مینجمنٹ تک ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو ہمیشہ آپ لوگوں کے پیچھے پیچھے ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے ہر لمحہ کرنے کو تیار ہوں۔'' جاوید نے کہا۔

''آپ کو پیچھے نہیں آپ کو آگے رہنا ہے اور ہر کام میں ہاتھ بٹانا ہے۔'' صدر

شعبہ اور پروفیسر شمیم ماما میاں نے ایک ساتھ کہا۔

''جی۔ضرور۔میں تیار ہوں۔'' جاوید نے کہا۔

اس طرح بڑے ہی خوشگوار عالمانہ ادبی اور علمی ماحول میں یہ میٹنگ اختتام کو پہنچی اور دوسرے دن ہی سے نعت خوانی کی تیاری ہونے لگی اور پھر یوم نعت آ گیا۔

روز نعت جاوید کو جو نہ دیکھنا چاہئے وہ سب دیکھنے کو ملا۔ایک معزول پروفیسر جو دوران ملازمت کسی بھی پروگرام میں قریب آنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے تھے۔دور سے دیکھتے' دور سے مشورہ دیتے' دور دور رہتے اور ادب پر بالکل نہیں بولتے ان پر یوم نعت کو اچانک تبدیلیٔ قلب کا حادثہ ہو گیا۔وہ اچانک بولنے لگے اور جاوید نے پچھلے پانچ سال کے اثناء میں پہلی بار اس دن ان کے ہاتھوں میں چاک دیکھا جسے انگلیوں میں دبائے کانفرنس ہال کے بلیک بورڈ پر پروگرام نعت خوانی لکھنے جا رہے تھے۔خود صدر شعبہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ آج یہ اونٹ پہاڑ کے نیچے کیسے آ گیا۔

جاوید نے دیکھا کہ نعت خوانی کے پروگرام میں وہ سبکدوش پروفیسر شروع تا آخر دھیان لگائے بیٹھے رہے۔ٹس سے مس نہ ہوئے۔جاوید نے دوسرے پروگراموں میں بارہا دیکھا تھا کہ جیسے ہی دس منٹ گذرتا وہ اپنی گھڑی دیکھتے اور جاوید سے پوچھتے کتنا وقت لگے گا۔پروگرام ختم ہونے میں۔ذرا جلدی کرو۔کیا ضرورت ہے وقت نقصان کرنے کی۔فہرست مختصر کر دو۔اور آج نعت خوانی میں جیسے کھوئے ہوئے خاندان کا شجرہ مل گیا ہو۔آج سے پہلے کے پروگراموں کی چائے نوشی میں کبھی شرکت نہیں کرتے تھے مگر آج جھوم جھوم کر سموسے کھا رہے تھے۔اور صدر شعبہ سے تبادلۂ خیال بھی ہو رہا تھا۔یہ کہنا غلط ہے کہ آجکل معجزہ نہیں ہوتا۔

بزم ادب شعبہ اردو کی ادبی تنظیم تھی۔اس انجمن کا مقصد تھا سال میں ادبی علمی و تہذیبی پروگرام کا انعقاد کرنا تا کہ نصاب تعلیم کے علاوہ طلباء کی ذہنی، علمی اور انتظامی صلاحیتوں کو ابھارا جا سکے۔ایسے پروگراموں میں حصہ لینے سے طلباء میں

خود اعتمادی' ادبی دلچسپی تحریر وتقریر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارا جاسکتا تھا۔ شعرائے کرام اور ادبائے عظام کو ایسی محفلوں میں جب طالب علم قریب سے دیکھتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں تو وہ خود کو ان جیسا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے پروگراموں میں تقریری مقابلہ' مضمون نویسی مقابلہ اور ادیبوں کو استقبالیہ خاص خاص تھے۔

بزم ادب کے اغراض ومقاصد اعلیٰ وافضل تھے مگر حقیقی صورت حال کچھ اور تھی۔ بزم کے پروگراموں کا معیار اسکول کی سطح پر آ گیا تھا۔ اس کا احساس صدر شعبہ اور شعبہ کے دوسرے پروفیسروں کو قطعی نہ تھا۔ ان کے ذہن میں غالباً بزم کا مفہوم مدرسہ کی تعلیم تھا۔ اس لیے وہ اسے نعت' حمد اور قرأت کی بزم بنا چکے تھے۔ کالج کے دوسرے شعبوں میں بھی انجمنیں تھیں اور ان کے ناظم' چیرمین مذہبی جماعتوں کے فعال رکن تھے اس کے باوجود وہ اپنی انجمنوں میں ایسا کوئی پروگرام منعقد نہیں کرتے تھے لیکن شعبۂ اردو کے صدر کو یہ مشورہ ضرور دیتے تھے کہ نعت پڑھوایئے' قرأت کرایئے' اسلامی مضمون نویسی کرایئے' وغیرہ وغیرہ۔ جیسے ان کے علاوہ بزم ادب کا اور کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ حیرت کا مقام تو یہ تھا کہ صدر شعبہ کی اپنی کوئی رائے نہ تھی مگر دوسروں کی ہر رائے کو قبول کر لیتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے وہ سائنس کے پروفیسروں کے پاس دوڑتے رہتے تھے۔ صدر شعبہ وہ اور پروگرام کا فیصلہ کسی اور شعبہ کے پروفیسر کے ہاتھ میں۔ پروگرام اردو کا اور پروگرام کے عنوانات طے کرنے کی ذمہ داری غیر اردو داں پروفیسر کے اختیار میں۔ صدر شعبہ اپنے کلیگ سے پروگرام کا کوئی عنوان کبھی نہیں پوچھتے تھے۔ اگر کلیگ نے بھولے سے کبھی کوئی عنوان تجویز بھی کیا تو اسے منظور نہیں کرتے تھے۔ سائنس کے پروفیسر نے جو عنوان بتا دیا اسے تسلیم کر لیتے تھے۔

نعت خوانی کے پروگرام کو دیکھ کر جاوید کی روح کھل گئی۔ ایمان تازہ ہو گیا۔ سامعین نے ثواب دارین حاصل کیا۔ پروگرام دیکھنے والوں نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ اردو کے دوست واقعی یہ حضرات ہیں جنھوں نے میلاد خوانی' نعت خوانی' یا حبیب سلام علیک جیسے پروگرام منعقد کروا کے دشمنوں اور سیاست کی آفتوں سے اردو کو بچا رکھا ہے۔ ان

حضرات کے سامنے ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اور نقاد کی خدمات دوئم درجے کی ہیں۔ بھلا اس خدمت سے کہیں زبان زندہ رہتی ہے؟

اللہ اللہ کیا جلوہ تھا۔ کیا روشنی تھی۔ کیا تجلی تھی۔ ہر طرف اردو ہی اردو نظر آرہی تھی۔ وہ جو اردو ادب خالص ادب اور ادب عالیہ کی دہائی دیتے ہیں انہیں آج آکر دیکھنا چاہئے تھا کہ بزم ادب کسے کہتے ہیں۔ اگر اسی طرح اردو کے پروفیسر بزم ادب کی محفلوں میں میلاد خوانی ،نعت خوانی، قرأت اور سلام علیک کا ورد کراتے رہے تو خالص ادب سے شاعری ،تنقید، افسانہ اور ناول کو کون پڑھے گا اور انہیں کون لکھے گا؟ جاوید کو اپنے آپ ایک مزاح نگار کا جملہ یاد آیا کہ اردو کے تمام پروفیسر اساتذہ پہلے مجاور ہیں پھر استاد۔

مومن پورہ کی ایک بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور میں دو کمرے کے فلیٹ میں دو پروفیسر رہا کرتے تھے ایک ہندی کے دوسرے یونانی کالج کے۔ پروفیسر شیخ بختیار دیشمکھ بحرالاسلام کالج میں ہندی پڑھاتے تھے۔ اس لیے جاوید سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ دیشمکھ نے جاوید کو ایک دن بتایا کہ وہ اپنے رہنے کے لئے کہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ جاوید نے کہا آپ جب بھی یہاں سے جائیں اپنی جگہ پر مجھے رکھکر جائیں۔ انہوں نے کہا ہاں میں آپ کے علاوہ کسی اور کو یہ کمرا نہیں دونگا۔

جاوید منصوبہ بنانے لگا کہ جب یہ کمرا اسے مل جائے گا تو وہ پوری آزادی کے ساتھ پڑھنا لکھنا، سونا جاگنا اپنی مرضی کے مطابق کرے گا۔ کسی کا دخل نہ ہوگا۔ خدا کرے یہ کمرا مل جائے۔ پھر اس کے دوسرے کمرے کو بھی یہ کہہ کر حاصل کرنے کی کوشش کریگا کہ اس کی بیوی آرہی ہے۔

ایک ہفتہ بعد اسی کمرے میں جاوید دیشمکھ سے ملنے گیا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ایک ہفتہ بعد وہ کمرا خالی کردے گا۔ جاوید نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ یونانی کالج کے پروفیسر نے دروازہ کھولا۔ کہا آیئے آیئے اندر آیئے۔ وہ اندر گیا۔ دیکھا پہلا کمرا جس میں پروفیسر دیشمکھ رہتے تھے پوری طرح بدل گیا ہے۔ اور باضابطہ ڈرائنگ روم بنا ہوا ہے۔ صوفہ سیٹ لگا

ہے۔ گویا کمرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی فیملی آ گئی ہے۔ یہ سب دیکھ کر جاوید کو جھٹکا لگا۔ اس کے سپنوں کا محل اڑا اڑا دھم سے گر گیا۔

جاوید نے پوچھا۔ ''وہ ہندی کے پروفیسر کہاں گئے؟''

یونانی پروفیسر نے کہا۔ ''وہ دو دن پہلے چلے گئے تو میں نے یہ کمرا لے لیا۔ اور کل ہی آپ کی بھابی اپنے وطن سے آ گئی ہیں۔ کل ہی شام میں صوفہ سیٹ بھی آ گیا۔ اب اس پورے فلیٹ میں ہماری فیملی رہے گی۔''

''لیکن وہ ہندی کے پروفیسر کدھر گئے؟'' جاوید کو اندر ہی اندر دیشمکھ پر غصہ آ رہا تھا۔

''کسی کارپوریٹر کے فلیٹ میں ان کو جگہ مل گئی ہے۔ یہاں سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے جاوید کو وہاں تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا۔

جاوید وہاں سے سوچتے ہوئے نکلا کہ یار یہ ہندی والے نے خوب چرکا لگایا۔ نالائق خواہ مخواہ خواب دکھا رہا تھا۔ کیسے بولا تھا کہ آپ کے علاوہ کسی اور کو نہ دونگا اور پوری فیملی کو لا کر رکھوا دیا۔ فراڈ کہیں کا۔

اس دن جاوید غصے میں اس کی طرف نہیں گیا۔ چند دنوں بعد وہ پروفیسر دیشمکھ کو ڈھونڈنے نکلا کہ دیکھیں یہ کس کارپوریٹر کے گھر میں ہے اور کیا عیش کر رہا ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے گرودوار پیٹھ کی ایک گلی کے اندر وہ بلڈنگ نظر آئی جس کے فرسٹ فلور کے فلیٹ کے ایک کمرے میں کنارے پڑی مسہری پر وہ بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کہا۔ ''اہا جاوید صاحب آخر ڈھونڈ لیا۔ یہاں تک کیسے آئے۔ کس نے پتہ دیا؟''

نہ جانے کیوں جاوید کو پروفیسر کے چہرے میں کوئی بولتا ہوا نظر آتا تھا جو یہ کہہ رہا ہوتا کہ یہ غیر ریاست کا باشندہ اور میرے ریاست کی زبان سے نابلد میرے پاس کیوں آتا ہے کسی ہم ریاست کے پاس کیوں نہیں جاتا؟

جاوید نے کہا۔ ''بھئی خوب ہیں آپ چپکے سے نکل لیے وہاں کا وہ کمرا بھی کسی اور کو دے دیا۔''

پروفیسر بختیار نے کہا۔''میں وہ کمرا آپ ہی کو دینا چاہتا تھا لیکن یونانی پروفیسر نے کہا کہ وہ اپنا علاج اور آپریشن فوجی اسپتال میں کرانے والے ہیں۔ وہ اپنے وطن سے اپنی بیگم کو بلانا چاہتے ہیں اس لیے ہم نے کہا کہ ایسا ہے تو یہ کمرا بھی آپ ہی لے لیجئے۔ دوسرے کمرے میں وہ پہلے سے رہتے آرہے تھے۔''

جاوید نے کہا۔''اماں حاتم وقت اس کی مجبوری کا آپ کو خیال آیا اور میری۔ کیا مجھے ضرورت نہیں تھی۔ کیا فلیٹ کا یہاں کال پڑ گیا تھا۔ مقامی اور شناسیوں کو فلیٹ کہیں بھی مل جاتا ہے لیکن جھیلنا پڑتا ہے ہم جیسے مہاجروں کو۔ پورا فلیٹ لینے کی حیثیت نہیں مجبوراً بڑی دقت سے کہیں ایک کمرا ملتا ہے اور آپ نے مجھے اس سے بھی محروم کر دیا۔''

''ہاں آپ کا کہنا سہی ہے۔ دراصل انہوں نے بیماری کا اس طرح ذکر کیا کہ مجھے ہمدردی ہوگئی۔''

''ٹھیک ہے آپ نے ثواب کا کام کیا لیکن مجھے بتا تو دیتے۔ اتنے دن آپ کے بھروسے کہیں اور تلاش بھی نہیں کیا۔''

''بھئی آپ سے ملاقات ہی نہ ہوئی ورنہ.......''

بحث فضول تھی۔ وہ سوال کا جواب دیتے جا رہے تھے۔ نتیجہ لا حاصل۔ ظاہر ہے جاوید پروفیسر دیشمکھ کے بارے میں جیسا نیک خیال رکھتا تھا دیشمکھ شاید ایسا نہیں سوچتے تھے۔ خیر۔ جاوید نے اس کمرے کو دیکھا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ کمرا بڑا تھا دس بائی پندرہ کا سائز ہوگا۔ سامان سے اٹا تھا۔ فرنیچر، بچے کے کھلونے، برتن، گھر کی ضروریات کے سارے سامان اسی کمرے میں دکھائی پڑ رہے تھے۔ شاید کارپوریٹر صاحب نے اس کمرے کو اسٹور روم بنا رکھا تھا۔ سکنڈ فلور کی پوری عمارت ان کی تھی۔ بھئی یہ تو اسٹور روم لگ رہا ہے۔ جاوید نے پوچھا۔

پروفیسر بختیار نے کہا۔''ہاں ہے تو ایسا ہی لیکن کرایہ بہت ہی کم ہے۔ بجلی کا بھی معاف ہے۔ کسی کسی رات خود کارپوریٹر صاحب بھی اس میں سونے آجاتے ہیں۔ وہ

ہمارے گاؤں کے ہیں۔ وہاں ان کی کھیتی ہے۔ان کے بڑے تعلقات ہیں۔ اگر کسی کو کارپوریشن کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر میں کچرا صاف کرنے کا کام چاہیئے تو اسے اس کام پر لگا سکتے ہیں۔

"Sweeper کا کام۔"

"ہاں۔"

"اچھا یہ چھوٹا سا پاکٹ ریڈیو کس کا ہے؟"

"یہ کارپوریٹر صاحب کا ہے۔ وہ جب یہاں سونے آتے ہیں تو گانا سنتے سنتے سوتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ گانا سنتے سنتے انہیں نیند آجاتی ہے اور ٹرانسسٹر صبح تک آن رہ جاتا ہے۔ اس لیے انہیں بار بار بیٹری بدلنی پڑتی ہے۔ اور وہ جب نہیں آتے تو میں ہی سنتا ہوں۔ دراصل ان کے رشتہ دار ہمارے گاؤں میں بھی رہتے ہیں اس لیے جب میں نے ان کو اپنے گاؤں کا نام بتایا تو کہا فوراً اپنا سامان یہاں لے آؤ۔ اور میں آگیا۔

جاوید نے کہا۔ "بھئی میرا تو کچھ نہیں ہوا۔ کپڑا فروش کے تین مہینے پورے ہونے والے ہیں۔"

بختیار نے بتایا۔ "تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ آپ بھی اسی کمرے میں آجایئے۔ یہ جو لکڑی کا سامان ادھر کونے میں پڑا ہے اسے دوسری طرف کونے میں رکھ دیں گے۔ اور وہاں پر آپ اپنا بستر لگا لیجئے۔ آپ رہیں گے تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہم دونوں ایک ساتھ کالج جایا کریں گے اور شام کو تفریح بھی ہوا کرے گی۔ دوسرے دن وہ پروفیسر دیشمکھ کا روم پارٹنر بن گیا۔ بحرالاسلام کالج کے سائنس کے دو پروفیسر اسی محلے میں رہتے تھے۔ شام کے وقت وہ بھی ساتھ ہو جاتے۔ وقت بڑے مزے میں گذرنے لگا۔ سب کے سب ہم عمر اور جوان تھے اس لئے سب کی سیر بازی اور سینما بازی ایک ساتھ ہونے لگی۔ چند مہینے گذر گئے۔ جاوید کو اس کمرے کو دیکھتے دیکھتے یہ محسوس ہونے لگا کہ ٹھونسا ہوا سامان کسی دن اس کے بستر پر گر جائے گا اور وہ بری طرح زخمی ہو جائے گا۔ یا اس کا دم گھٹ جائے گا۔

کارپوریٹر نے کہا کہ تم لوگوں کو جیسے رہنا ہو رہو لیکن یہاں کے کسی سامان کو ہاتھ مت لگانا۔ بستر کے چاروں طرف، کھڑکی سے لگ کر، فرش پر، چاروں کونوں میں سامان بکھرے پڑے تھے لیکن جھاڑو لگانے کی اجازت نہیں تھی۔ جاوید نے دیشمکھ سے کہا بھئی یہ کیسی پابندی ہے۔ جھاڑو نہیں لگنے سے دھول بھرتی جارہی ہے۔ پورے کمرے میں صرف ایک کھڑکی نصف کھلتی ہے۔ حبس کا عالم ہے۔

دیشمکھ نے کہا۔'' ارے پروفیسر جی ہوا لے کر آپ کیا کریں گے۔ آپ کو کتنی ہوا چاہئے۔ باہر جاکر سونگھ آیئے۔ اس کمرے میں سامان بھرا ہے۔ کارپوریٹر صاحب کو کرایے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے محبت میں ہمیں یہ کمرا رہنے کو دیا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ تھوڑی سی دھول میں رہ لیں گے تو کیا نقصان ہوجائیگا۔''

جاوید کو پروفیسر دیشمکھ صاحب کے زریں خیالات نے جھنجھوڑ کر رکھدیا۔ گویا آسمان سے گرے اور ببول میں اٹکے۔ پڑھنا لکھنا بعد میں یہاں تو سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ اس شخص کو کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ مسہری پر نئے پرانے توشک، رضائی، تکیوں اور کپڑوں کے انبار میں یہ کتنے آرام سے رہتا ہے۔ اتنا بے اثر تو وہی ہوسکتا ہے جس کا کرایہ معاف ہو۔ کہیں یہ بھی فری میں تو نہیں قیام پذیر ہے۔ یہی بات ہے۔ لیکن اس گھٹن میں یہاں پر مزید ٹھہرنا ذہنی اور جسمانی دونوں طرح مضر ہوگا۔ نیا پڑاؤ دیکھنا ہوگا۔ نیا آشیانہ ڈھونڈنا ہوگا۔

بزم ادب کے تحت ہونے والے پروگراموں میں سب سے اہم پروگرام کا نام تھا جان بہادر نجات اللہ ٹرافی کل مہاراشٹر اردو تقریری مقابلہ۔ یہ جان بہادر کون تھے۔ ان کا کالج سے کیا تعلق تھا۔ انہوں نے کالج کے لئے کون سی قربانی دی تھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ بزم ادب کے چیرمین جان بہادر تقریری مقابلہ کے چیرمین سب صدر شعبہ ہی ہوتے تھے۔ انہیں بھی جان بہادر کا کوئی علم نہ تھا۔ گویا وہ خود انجان بہادر تھے۔ کالج کے کسی پروفیسر سے پوچھنے پر وہ یہی کہتے کہ اس نام پر ہر سال شعبۂ اردو میں کوئی تقریر وغیرہ کا مقابلہ ہوتا ہے اور

ہر سال اس کی ٹرافی کو مالیگاؤں کے طلباء جیت کر لے جاتے ہیں اس سے زیادہ وہ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ تقریری مقابلہ جو کالج آرگنائز کرتا ہے اس کے طلباء کبھی اس ٹرافی کو نہیں حاصل کر پاتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مالیگاؤں میں اب بھی اردو کلچر قائم تھا جبکہ کالج اور اس کے شہر میں کوئی اردو تہذیب نہ تھی۔ یہاں لوگ ملی جلی زبان تیرے کو میرے کو بولتے تھے۔ اردو پڑھنے والے زیادہ تر طلباء جھونپڑ پٹیوں میں رہتے تھے یا شہر کے غیر ترقی یافتہ علاقوں میں جہاں وہی ملی جلی زبان بولی جاتی تھی یا ریاستی زبان۔

جاوید نے کئی بار صدر شعبہ اور شناسا پروفیسروں سے پوچھا کہ یہ جان بہادر صاحب واقعی کون تھے مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے سوچا جانے بھی دو۔ کوئی ہوگا۔ مجھے کیا۔ تقریری مقابلہ کروانا ہے کروا دیں گے۔ کالج کے پاس ہی ایک دوسرا تعلیمی ٹرسٹ تھا۔ وہاں کسی پروفیسر نے اس ٹرسٹ کے کہنے پر ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ان حضرات کا ذکر کیا تھا جنہوں نے ٹرسٹ کے تعلیمی کیمپس میں اپنی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔ ان اشخاص میں ایک نام جان بہادر نجات اللہ کا بھی تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد جاوید کو معلوم ہوا کہ یہ نجات اللہ صاحب ان کے کیمپس کے اسکول میں اسپورٹس ٹیچر تھے اور ملکہ وکٹوریہ کو اردو پڑھاتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کو اردو بمبئی میں جا کر پڑھایا یا لندن میں اس کا ذکر نہ تھا۔ واضح یہ ہوا کہ نجات اللہ صاحب کا تعلق آدم کیمپس کے ایک سکنڈری اسکول سے تھا تو پھر ان کے نام پر بحر الاسلام کالج میں ٹرافی کیوں اور تقریری مقابلہ کیوں؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ تھا تو اتنا کہ بس یہ پروگرام برسوں پہلے سے ہوتا آرہا ہے۔ جان بہادر ٹرافی دیکھنے میں اصل میں شیلڈ تھی۔ شیلڈ کو ٹرافی کیوں کہا جارہا تھا اسکا جواب بھی کسی کے پاس نہ تھا۔

جان بہادر نجات اللہ ٹرافی کل مہاراشٹر اردو تقریری مقابلہ پروگرام کی تیاری مہینوں پہلے سے شروع ہو جاتی۔ اس کے لئے ہر سال ایک مہمان خصوصی اور دو جج کا انتظام کرنا پڑتا۔ اس انتخاب میں بڑی رسہ کشی ہوتی تھی۔ پرنسپل کی پسند الگ، وائس پرنسپل کی

الگ، کالج دفتر کے رجسٹرار کی الگ۔ اس پروگرام میں رجسٹرار اہم رول ادا کرتے تھے۔ تقریری مقابلہ میں ہمیشہ وہ ایک غزل ترنم سے سناتے تھے اور خود کو مہدی حسن کا داہنا ہاتھ سمجھتے تھے۔ ایڈمیشن سے لے کر اکزامنیشن تک طلباء کا ریکارڈ رجسٹر ایسا بنواتے تھے جس کے ہر دوسرے تیسرے صفحے پر کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوتی تھی۔ یا تو نام غلط یا تاریخ پیدائش یا امتحانوں کا اندراج۔ دراصل وہ فوج میں کلرک تھے۔ وہاں سے سبکدوشی کے بعد کالج میں کلرک ہوئے پھر آفس سپرٹنڈنٹ پھر رجسٹرار۔ اس لیے کالج کے تمام رجسٹروں میں جاتے جاتے ساودھان وشرام کی پریڈ کرا دی جسے بعد کے رجسٹرار نے بھگتا۔

تو بات ہو رہی تھی پروگرام کے مہمان خصوصی اور دو ججوں کی۔ رجسٹرار کی پسند کے بعد پروفیسر شمیم ماما میاں اور پروفیسر نعیم کی بھی پسند الگ۔ کئی ہفتوں تک یہی طے نہیں ہوتا تھا کہ کون مہمان خصوصی ہوگا اور کون جج۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جسکی کوئی پسند نہ تھی اور وہ تھا جاوید۔ وہ چپ چاپ سب کچھ دیکھتا رہتا۔ اسے بار بار خیال آتا کہ یونیورسٹی سے کہاں اس کالج میں آ گئے جہاں ایسے لوگوں کا جمگھٹا ہے جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ لوگ مہمان خصوصی اور جج بھی انہیں بناتے ہیں جو ادب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ تقریری مقابلہ تو کہنے کو تھا دراصل اس کے ذریعے اپنی جان پہچان کے افراد کو بلایا جاتا تھا۔ ملاقاتیں اور باتیں ہوتی تھیں۔

جج اور مہمان خصوصی کے انتخاب کا سلسلہ ہفتوں تک چلتا رہتا۔ صدر شعبہ جاوید سے کہہ دیتے کہ آپ پرنسپل اور وائس پرنسپل سے مشورہ کر کے نام طے کر لیجیے میں آپ کے ساتھ ساتھ ہوں۔ انہیں معلوم تھا کہ جج اور مہمان خصوصی کا تعیین ٹیڑھی کھیر ہے اتنی بھاگم بھاگی کون کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ یہ ذمہ داری جاوید کو سونپ دیتے تھے۔ جہاں کام مشکل ہو تو جاوید کے ذمہ اور جہاں کریڈٹ لینا ہو تو خود آگے۔ جاوید ناموں کی فہرست لے کر اس کے پاس سے اس کے پاس اس طرح بھاگتا اور لڑھکتا رہتا جیسے میدان کی فٹ بال۔ ایک وائس پرنسپل نے کہا یہ یہ نام جج کے لئے لکھو۔ جاوید نے جب نام وائس پرنسپل معمر کو دکھایا تو

انہوں نے کہا ان ناموں کو کینسل کرو اور میں جو بتاتا ہوں اسے لکھو۔ اس نے لکھ لیا۔ یہ نام لے کر وہ پرنسپل تونڈوال کے پاس پہنچا۔ انہوں نے کہا تم وائس پرنسپل ناصرالدین کے پاس جاؤ اور جیسا وہ کہیں کرو۔ جاوید پروفیسر ناصرالدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کا تعلق کیمسٹری سے تھا۔ جاوید کی باتیں سنیں۔ چہرے پر غور وفکر کا نقشہ بنایا جیسے وہ اس موضوع پر نہایت سنجیدہ ہیں۔ فرمایا جج کے لیے تم مالتی کنج رہائشی کالونی میں چلے جاؤ۔ بلڈنگ نمبر ۱۵ فلیٹ نمبر ۳ میں جناب فہیم قلعدار صاحب ہوں گے۔ ان کو پروگرام کی تاریخ بتا کر جج کے لئے تیار کر لینا۔ وہ مان جائیں گے۔ میری ان سے بات ہو چکی ہے۔ جاوید ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کے فلیٹ میں پہنچا۔ پروگرام کی تفصیل بتائی۔ موصوف نے فرمایا میں نے کسی بھی اقلیتی ادارے میں جانا بند کر دیا ہے۔ ایسے اداروں میں پڑھائی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہاں صرف سیاست بازی اور اقربا پروری ہوتی ہے۔ ہماری خوبصورت ریاست کو بہار، بنگال، یوپی، اور دلّی والوں نے آکر برباد کر دیا ہے۔ وہ یہاں نوکری کرتے ہیں اور روپے اپنے آبائی وطن کو بھیجتے ہیں۔ وہ یہاں مسجدوں مدرسوں میں بھر گئے ہیں اور دادا گیری بھی کرتے ہیں۔ جاوید نے کہا آپ اپنے مدرسوں اور مسجدوں میں اپنے مولوی کیوں نہیں رکھتے۔ کہا کیا کریں جناب یہاں دینی تعلیم یافتہ نہیں ملتے۔ قلعدار صاحب کسی طرح جج بننے کو تیار نہیں ہوئے۔ جاوید ناکام لوٹ آیا۔

انہیں دنوں ایک افسانہ نگار بحیثیت رجسٹرار بمبئی کے کسی کالج سے رٹائر ہو کر وہاں آئے تھے۔ ایک افسانوی مجموعہ چھپ چکا تھا۔ جاوید نے اپنے شعبے کے پروفیسروں کے سامنے افسانہ نگار عابدین کا بطور مہمان خصوصی نام لیا۔ پروفیسر شمیم ماما میاں نے کہا نہیں نہیں یہ نام نہیں چلے گا۔ ان کا اردو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلے انہوں نے کامرس میں کچھ کیا تھا پھر ملٹری میں آگئے اور پھر اردو وغیرہ کا شوق ہوا۔ یہ آدمی نہیں چلے گا۔ جاوید نے کہا تو ٹھیک ہے یہ آدمی نہیں چلے گا آپ کوئی اور نام بتائیے۔ بولیں لکھئے پروفیسر یونس نسیم، اور جج کے لیے پروفیسر عشرت باجی اور پروفیسر مسرت باجی۔ جاوید نے خاموشی سے یہ نام لکھ

لیے۔ پروفیسر یونس نسیم پہلے آٹھویں جماعت تک کے اسکول میں ٹیچر تھے۔ پھر بارہویں تک کے ہائر سیکنڈری اسکول میں ایک سال کے لئے پرنسپل ہو کر رٹائر ہو گئے تھے۔ پروفیسر عشرت باجی جونیر ٹیچرس ٹریننگ کالج میں استاد تھیں جس میں دسویں پاس طلباء کا یک سالہ ٹیچرس ٹریننگ کے لئے داخلہ ہوتا تھا اور پروفیسر مسرت باجی ہائر سیکنڈری گرلس اسکول (جونیر کالج) میں اردو پڑھاتی تھیں۔

جج اور مہمان خصوصی کے ناموں کا آخری فیصلہ پرنسپل کرتے تھے۔انھوں نے اسمائے گرامی کو پڑھا اور فرمایا میں ایسا نام چاہتا ہوں جو سماجی خدمت کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی تعلق رکھتا ہو۔مولانا نے جاوید کے کان میں کہا یہ ایسا اس لیے بول رہا ہے کہ اس کے دماغ میں پہلے سے کوئی نام طے ہے۔ وائس پرنسپل سے کہا سر ایسا آدمی اس شہر میں کہاں ملے گا۔ پرنسپل نے کہا صاحب ڈھونڈنے سے ضرور ملے گا۔ میں ایسا مہمان خصوصی چاہتا ہوں جو انفارمیشن ٹکنالوجی اور اردو ادب اور کمپیوٹر تمام سے واقف ہوتا کہ وہ یہ بتا سکے کہ اگلی صدی میں انسان اور انسانی معاشرہ کو کیا ضرورت پڑے گی۔آپ لوگ اس طرح کا نام ڈھونڈ یئے۔علی گڑھ سے بلوایئے۔حیدرآباد سے بلوایئے۔دلی سے بلوایئے۔ میں خرچ کرونگا۔ عابدی صاحب ،اسلم جیراجپوری صاحب ۔کیوں بیگار صاحب۔ فزکس کے پروفیسر بیگار صاحب پرنسپل کے پاس پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے کہا آتو جائیں گے گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری اور دوسرے بڑے اشخاص مگران کے لیے یہ محفل چھوٹی ہے۔

’’ہم اس محفل کو بڑی کر دیں گے۔ لان لگا دینگے۔ پارک میں مجلس کریں گے۔‘‘ پرنسپل نے کہا۔

’’دراصل اس موضوع پر وہ جو کچھ اظہار خیال کریں گے اس کے لئے اس معیار کے سامعین بھی ہونے چاہئیں۔‘‘ پروفیسر بیگار نے کہا۔

’’ہاں ہاں ہم اس کا بھی انتظام کر دیں گے۔‘‘ پرنسپل نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

''ایسی جگہوں پر اور اتنی چھوٹی محفل اور تقریری پروگرام میں ان کا آنا اور اس موضوع پر کچھ بتانا ان کی حیثیت کے برخلاف ہوگا۔'' پروفیسر بیگار نے وضاحت کی۔

''دراصل یہ موضوع سمینار اور کانفرنس کا ہے۔ یہ تو طلباء کا تقریری مقابلہ ہے۔'' جاوید نے کہا۔

پرنسپل نے جاوید کی باتوں کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ کوئی اہمیت نہ دی اور مولانا سے کہا ''دیکھو تم کسی کو لاؤ۔ بمبئی سے لاؤ۔''

''ہاں سر بمبئی میں یہ صاحب ہیں وہ صاحب ہیں۔''

''کیا یہ لوگ انفارمیشن ٹکنالوجی پر بول پائیں گے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

جاوید نے مولانا کے کان میں کہا آج اس کو انفارمیشن ٹکنالوجی کا بھوت سوار ہے۔ مولانا نے گردن جھکائی اور
مسکرائے۔

''کیوں نہیں سر وہ لوگ تو اس کی اسپانسر شپ بھی کردینگے۔ انعامات بھی دینگے۔ مولانا نے رائے دی۔''

''نہیں نہیں اسپانسر شپ نہیں انعامات نہیں مجھے انفارمیشن ٹکنالوجی کا جانکار آدمی چاہئے۔'' پرنسپل نے کہا۔

''ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں دیکھئے شاید وہاں اس طرح کا کوئی اردو جانکار مل جائے۔'' شمیم ماما میاں نے بتایا۔

''جو اردو کمپیوٹر پر کام کیا ہو۔ ایسا آدمی چاہئے۔'' پرنسپل نے رائے دی۔

اسی درمیان ایک شخص کسی کام سے اندر آیا۔ پرنسپل نے اس کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو پرنسپل یہ بھول گئے کہ ابھی دو منٹ پہلے کیا بات ہورہی تھی۔ وہ شخص چلا گیا اور کوئی کچھ نہیں بول پارہا تھا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جاوید نے تمام اشخاص کو دیکھتے ہوئے کہا ''دو تین دن اور ہم لوگ ایسے آدمی کے بارے میں سوچ کر دیکھتے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ دو تین دن آپ لوگ سوچئے پھر بتایئے۔'' پرنسپل نے کہا۔

شعبہ اردو کے سارے پروفیسر پرنسپل چیمبر سے باہر آئے۔ جاوید نے کہا چلئے ذرا ہم لوگ وائس پرنسپل معمر صاحب کو آج کی میٹنگ کے بارے میں بتادیتے ہیں۔ شاید ان کے پاس کوئی ایسا نام ہو۔ سب لوگ معمر صاحب کے چیمبر میں پہنچے۔ انہوں نے تفصیل سنی فہرست دیکھی اور بولے۔

''سکریٹریٹ میں عبدالرحمٰن صاحب ہیں ان سے جاکر آپ لوگ ملئے۔ دیکھئے کیاوہ اس مجلس کے لئے مناسب ہیں یانہیں۔''

''کیاان کاتعلق اردو سے ہے۔'' جاوید نے پوچھا۔

''نہیں وہ تو گجراتی کے آدمی ہیں۔'' وائس پرنسپل نے کہا۔

''تو سران کو کسی دوسرے موقع کے لئے رکھئے۔'' مولانا نے رائے دی۔

''سر پروفیسر شمیم ماما میاں بمبئی جارہی ہیں وہاں ان کے کئی جاننے والے ہیں۔ بہتر ہوتا ایک ساتھ یہ کام بھی ہوجاتا۔'' جاوید نے بتایا۔

''نہیں نہیں یہیں سے دیکھ لیجئے۔ یہاں مل جانے سے اچھا ہوگا۔'' ماما میاں نے پلاّ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''سر پروفیسر شمیم رتنا گیری کی کسی محترمہ کو جانتی ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''سر وہ پچھلی بار بھی آئی تھیں۔'' ماما میاں بولیں۔

''ہاں ان کو جج کے لئے رکھئے۔'' وائس پرنسپل نے کہا۔

''سر ہم لوگ عبدالرحمٰن صاحب کے یہاں جائیں گے۔'' مولانا نے کہا۔

''سر پرنسپل صاحب نے کہا ہے کہ ایسا آدمی ہو جو سماجی خدمت میں مصروف ہو اور اردو ادب سے آگاہ ہو۔'' جاوید نے کہا۔

''تو بھئی یہ عبدالرحمٰن صاحب اس معیار پر کہاں اترتے ہیں؟'' وائس پرنسپل نے کہا۔

''سر ہندوستان ٹائمز، اردو ٹائمز اور انقلاب اخباروں کے ایڈیٹر کے تین ناموں

پر غور کیا جاسکتا ہے۔'' مولانا نے دوسرا مشورہ دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ پرنسپل صاحب کو تیار کیجئے۔'' وائس پرنسپل نے کہا۔

ایسا مہمان خصوصی ڈھونڈتے ڈھونڈتے سب لوگ تھک گئے۔ مگر وہ بندہ نہ ملا۔ آخر کار ایک ایسا شخص ملا جو انفارمیشن ٹکنالوجی سے قطعی واقف نہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔

اب مہمان خصوصی، صدر، جج اور ٹرافی کے لیٹرس تیار کرنے تھے۔ تمام لیٹرس کے خاکے بنا کر جاوید آفس ٹائپسٹ کے پاس پہنچا۔ اس سے بتایا کہ جان بہادر نجات اللہ پروگرام کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔ یہ خاکے میں نے بنادئے ہیں۔ انہیں آپ ٹائپ کردیجئے تاکہ مدعوئین کو وقت پر بھیجا جاسکے۔ اس ساڑھے چار فیٹ ٹھگنے ٹائپسٹ نے اپنے بال کا اسٹائل فلمی ہیرو دلیپ کمار جیسا بنا رکھا تھا۔ دلیپ کمار صاحب یہ کہہ کر پروفیسر اسے بے وقوف بناتے تو وہ پھولے نہیں سماتا۔

ٹائپسٹ نے کہا ہم اس طرح لیٹر ٹائپ نہیں کرتے۔ پہلے ان خاکوں پر پرنسپل کا ریمارکس لاؤ۔ تب ہم ٹائپ کریں گے۔ جاوید ان خاکوں کو لے کر پرنسپل کے پاس پہنچا۔ ٹائپسٹ کی ہدایت سنائی۔ انہوں نے کہا ایسے چھوٹے چھوٹے کام کے لئے مجھ سے مت کہا کرو۔ اس کے لئے وائس پرنسپل ہیں۔ معمر صاحب کے پاس جاؤ۔ جاوید ان کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا تم ٹائپسٹ کے پاس جاؤ میں اس سے کہہ دونگا۔ وہ پھر ٹائپسٹ کے پاس پہنچا۔ ٹائپسٹ بولا میں تمہاری بات کو کیسے مانوں۔ تم میرے ساتھ پرنسپل کے پاس چلو۔ دونوں پرنسپل کے چیمبر میں گئے۔ ٹائپسٹ نے کہا سر ایسا ایسا ٹائپ کرنے کا ہے؟ پرنسپل نے خاکوں کو ہاتھ میں لیا اور ایک پر اپنا ریمارکس لکھ دیا۔ ٹائپسٹ نے جاوید سے کہا دو دن بعد آکر لے جانا۔

دو دن بعد وہ ٹائپسٹ کے پاس گیا۔ اس نے لیٹرس تیار رکھے تھے۔ پرنسپل کے دستخط لے کر ان خطوں کو پوسٹ سے بھیجنا تھا۔ معلوم ہوا رجسٹرار کے دفتر میں ٹائپسٹ بیٹھا ہوا

ہے۔ جاوید وہاں پہنچا تو دیکھا ٹائپسٹ پرنسپل پر چیخ رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں کہہ رہا تھا ''تم پرنسپل ہو کر آخر کیا کر رہے ہو۔ ایک لابی کو خوش کر رہے ہو اور مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ میری پہلی جگہ چھین کر یہاں بٹھا دیا۔ میں ہیومن رائٹس کمیشن کو لکھونگا۔ آخر تم مجھے اس طرح انگلی کیوں کر رہے ہو۔''

پرنسپل نے کہا ''تمہارے بات کرنے کا طریقہ گنواروں کا ہے۔ تمہارے جواب میں میں بھی تمھیں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں مگر میں نے تمہاری ہمیشہ عزت کی ہے اور (جاوید کی طرف بتاتے ہوئے) اس پروفیسر کے سامنے تم کیا انگلی اور کھجلی کی بات کر رہے ہو۔ کیا بات کرنے کا یہی طریقہ ہے؟''

''کالج آفس میں وہ ملتان کے بازو میں جو جگہ ہے تمہیں وہاں پر شفٹ کر سکتے ہیں۔'' رجسٹرار نے کہا۔

''نہیں مجھے وہی جگہ چاہیے پرنسپل آفس میں۔'' ٹائپسٹ نے اصرار کیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ٹرسٹ کے چیرمین کا فیصلہ ہے۔'' پرنسپل نے بتایا۔

''میں سب جانتا ہوں تم لوگ دوسری لابی کے لئے مجھ سے نفرت کر رہے ہو۔ تم نے سب کو مجھ سے دور رہنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ کیا میں جنگلی ہوں جو دوسروں کو کاٹ کھاؤنگا۔ تم نے میرے لئے میٹنگ میں کہا کہ ایسے لوگوں سے پروفیسروں کو دور رہنا چاہیے۔ یہ پروفیسر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بات کرتا ہے یہ سب صرف تم نے میرے لیے کہا۔ تم مجھ سے بدلہ لے رہے ہو۔ میں بھی تم کو نہیں چھوڑونگا۔ اب دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔'' ٹائپسٹ نے دعویٰ کیا۔

''دیکھو اس کے جواب میں میں بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔'' پرنسپل نے دھمکایا۔

جب ان تینوں کی گفتگو نرم پڑی تو جاوید نے لیٹرس پرنسپل کے سامنے رکھ دیے۔ دستخط لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ متعلقہ حضرات کو خطوط پوسٹ کر دیے گئے۔

دوسرے دن صدر شعبہ نے اپنے تمام کلیگ سے کہا کہ ہم سب لوگوں کو ایک ایک تقریر اپنے پروگرام کے لیے تیار کروانی ہے۔

جاوید نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح۔''

صدر شعبہ نے کہا۔ ''بھئی آپ سب کو معلوم ہے۔ ہمارے بچے کس معیار کے ہیں۔ ہر سال مالیگاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں یہ ٹرافی جیت کر لے جاتے ہیں۔ دراصل وہاں ماحول بھی ہے اور وہاں کے بچے پوری تیاری کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک مہینہ تقریر کی تیاری کرتے ہیں۔ ہمارے طلباء کا حال کچھ اور ہے۔ یہ اتنی محنت نہیں کر پاتے اور یہاں کا ماحول بھی الگ ہے۔ اس لیے ہم سب لوگ تقریری مقابلہ کے موضوع پر ایک ایک تقریر لکھیں گے اور اپنی پسند کے ہونہار طالبعلم کو دے کر زبانی یاد کروائیں گے تا کہ اپنے کالج کے اردو طالب علم کی نمائندگی ہو جائے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ ہمارے طالب علم پہلا سے تیسرا کوئی انعام نہیں حاصل کر پاتے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم لوگ میزبان ہیں۔ ہم لوگوں کے لئے جیتنا کوئی ضروری بھی نہیں۔ آپ لوگ کل تک تقریر لکھ لیجئے۔ اور طلباء کے حوالے کر دیجئے۔ تین دن بعد سبھوں کو بٹھا کر سن لیں گے کہ انہوں نے کیسا یاد کیا ہے۔''

سارے کلیگ نے کہا ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم۔

تیسرے دن پرنسپل نے جاوید کو اپنے چیمبر میں بلایا۔ پوچھا تقریری مقابلہ پروگرام کی تیاری کیسی چل رہی ہے۔ جاوید نے بتایا بخیر و خوبی۔ پرنسپل نے کہا ''جس دن تمہارا تقریری مقابلہ پروگرام ہے اسی دن ریاستی حکومت ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ایجوکیشن آفیسر اپنے کالج میں آرہے ہیں۔ انہیں اسی پروگرام میں استقبالیہ دینا ہے۔ تم اپنی تکریر و کریر پہلے سیشن میں ختم کر لینا۔ دوسرے سیشن میں آفیسر کا شاندار استقبالیہ ہونا چاہئے اور انہیں کے ہاتھوں طلباء کو انعام و ٹرافی بھی دی جائے گی۔''

''جی ایسا ہی ہوگا۔'' جاوید نے کہا

پرنسپل نے کہا ''ایجوکیشن آفیسر آرہے ہیں اس لیے کھانے کا انتظام برابر ہونا

چاہیئے۔ کھانے میں اچھی ڈشیز اور میٹھار کھنے کا۔ چکن کی دکان میں خود سے جا کر آڈر دینا اور اس سے کہہ دینا کہ ٹھیک ایک بجے کھانا ادھر پہنچ جانا چاہیئے۔ ایجوکیشن آفیسر کو دوسری جگہ بھی جانا ہے۔ وہ زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ تم لوگ خود سے کھانا سرو کرو گے۔ پینے کا پانی بھی بوتل کا ہونا چاہیئے۔''

جاوید نے کہا۔''سر آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ کسی بات کی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ چیمبر سے باہر آ گیا۔ مولانا نظر آئے انھوں نے پوچھا کوئی خاص بات۔ جاوید نے کہا جی ایجوکیشن آفیسر آ رہے ہیں۔ چلئے چکن اور میٹھا کا آڈر دینے۔ پروگرام کے دوسرے سیشن میں ایجوکیشن آفیسر کو استقبالیہ دینا ہے۔ اب تقریری مقابلہ سے زیادہ استقبالیہ کی تیاری کرنی ہے۔ شاندار استقبالیہ۔ گویا ایک ساتھ دو پروگرام کی تیاری۔ دونوں، چکن والے، کرسی والے، فوٹو گرافر، تمام کو آڈر دینے روانہ ہو گئے۔ جان بہادر نجات اللہ ٹرافی کی پالش کرائی گئی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا ایک مہینہ سے انتظار تھا۔ کانفرنس ہال جس میں کالج کا ہر پروگرام ہوتا تھا کی صفائی ایک دن پہلے جاوید اور مولانا نے شام کے چار بجے ایک سوپر سے کرادی تھی تا کہ دوسرے دن ہال پوری طرح تیار ملے۔ قریبی ضلعوں سے کچھ طالب علم ایک دن پہلے ہی آ گئے تھے۔ انہیں گرلس ہاسٹل میں ٹھہرا دیا گیا۔ ان کے لیے رات کے نو بجے جاوید اور مولانا کو کالج آنا پڑا تھا۔

صبح نو بجے سے طلبا و طالبات آ رہے تھے کچھ شہر کے مختلف کالجوں سے اور کچھ شہر کے باہر دوسرے ضلعوں کے کالجوں سے۔ اس میں سینئیر اور جونیئر کالج دونوں کے طلباء تھے۔ عام طور پر طلباء کی اکثریت اپنے ہی شہر پر مشتمل ہوتی تھی۔ لیکن مالیگاؤں سے کم از کم تین کالجوں کے طلباء ہمیشہ اس پروگرام میں شرکت کرتے تھے۔ اور وہی بازی مار لیتے تھے۔ تمام کالجوں کے پتے اور فون نمبر جاوید کے پاس تھے۔ دس بج رہے تھے۔ گیارہ بجے

پروگرام شروع کرنا تھا۔ مالیگاؤں، احمد نگر، ممبئی اور ناسک کے طلباء آچکے تھے۔ شہر کے کالجوں کی تعداد کم تھی۔ پرنسپل وزیٹرس روم میں بیٹھ کر پرنسپل کے کارڈلیس فون سے ایک ایک کالج میں جاوید نے فون لگایا۔ پوچھا کہ پروگرام شروع ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی ہے آپ کے طلباء ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ انہیں فوراً بھیجئے۔ جواب ملا روانہ ہو چکے ہیں۔ مہمان خصوصی اور ججوں کا بھی پتہ نہیں تھا۔ حالانکہ سبھوں نے وقت پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ججوں کو فون لگایا گیا۔ جواب ملا پہنچ رہے ہیں۔ گیارہ بجے مہمان خصوصی ندارد اور جج غائب اور کل طلباء بیس جس میں دس مقرر طلباء تھے۔ اب کیا کیا جائے۔ پرنسپل نے کہا کالج کے دو پروفیسر کو جج کے مقام پر بٹھا دیا جائے۔ اور مہمان خصوصی دیر سے بھی آئیں گے تو کوئی بات نہیں۔ کیونکہ دوسرے سیشن میں تینوں کامیاب مقرر طلباء کی تقریر دوبارہ کرنا ہے۔ مہمان خصوصی تین تقریریں دوسرے سیشن میں بھی سن سکتے ہیں۔ دو پروفیسر بطور جج بٹھا دیے گئے۔ بارہ بج گئے تھے۔ پرنسپل آگئے۔ پانچ منٹ بعد مہمان خصوصی بھی آگئے اور دس منٹ بعد دونوں جج بھی بھاگتی ہوئی آئیں۔ پروفیسر ججوں کو ہٹا دیا گیا۔ محترمائیں براجمان ہوگئیں۔ صدر شعبہ مائیکروفون پر تقریر کے اغراض ومقاصد بتانے لگے۔ انہوں نے چند باتیں مہمان خصوصی کے متعلق بھی کہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ آج کے مہمان خصوصی اردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعہ کا نام مدبر ہے۔ انہوں نے مدبر کے ب پر زبر لگا دیا۔ یہ نام سنتے ہی جاوید بھی چونک پڑا۔ خود یہ سنکر افسانہ نگار کو بھی جھٹکا لگا لیکن وہ موقع و حالات کو دیکھ کر چیں بجبیں خاموش بیٹھے رہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ اسی پروگرام میں چند سالوں پہلے ہوا تھا جب اغراض ومقاصد بتانے کے لیے پروفیسر شمیم مامامیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ مولانا آزاد تقریر کا موضوع تھا۔ پروفیسر محترمہ شمیم مامامیاں نے مولانا آزاد کے دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے حبیب الرحمٰن شیروانی کو جیب الرحمٰن (یعنی رحمٰن کی جیب) کہہ دیا تھا۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار انہوں نے ایسے ہی اس نام کو پڑھا۔ سامعین نے سمجھ لیا کہ یہ بچپن سے ہی جیب الرحمٰن پڑھتی آئی ہیں۔ پروگرام کے بعد پروفیسروں اور طلباء نے ان کی تصحیح

کی۔ پھر تو وہ اتنی شرمندہ ہوئیں کہ آئندہ کسی بھی پروگرام میں اغراض ومقاصد بتانا ہی چھوڑ دیا۔

پرنسپل نے جاوید سے کہا وائس پرنسپل سے بولو ہال میں کسی کلاس سے اسٹوڈنٹ کو بھیجیں۔ جاوید ان سے ملا۔ انہوں نے کہا تھرڈ فلور پر ہال نمبر ۳۳ میں کامرس کلاس ہو رہی ہے۔ کریم صاحب کلاس لے رہے ہیں ان سے کہیے کلاس چھوڑ دیں اور طلباء سے کہیں کہ کانفرنس ہال میں پہنچ جائیں۔ کانفرنس ہال کے پاس ہی گراؤنڈ کی طرف جانے کا راستہ تھا۔ جاوید اسی جگہ کھڑا ہو گیا کیونکہ طلباء گراؤنڈ کی طرف زیادہ بھاگ رہے تھے اور ہال کی طرف کم۔ خدا خدا کر کے ہال بھر گیا۔ کامرس کے طلباء کو اردو سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ ہال کے پچھلے دروازے سے ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔ جاوید دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے ہی دروازہ سے ڈائس کی طرف آتا لڑکے پھر بھاگنے لگتے۔ آخر کار اس نے دروازہ بند کر دیا۔

پروفیسر شمیم ماما میاں کو یہ دکھ تھا کہ نہ جانے کہاں کہاں سے اور کون کون سی یونیورسٹی سے جاوید جیسے لوگوں کو اس کالج میں ملازمت مل گئی ہے۔ ان لوگوں کو اپنے وطن اپنے علاقے اور اپنی یونیورسٹی میں کوئی پوچھتا نہیں اس لئے روزی روٹی کے لئے ادھر جوق در جوق بھاگے چلے آتے ہیں۔ یہ لوگ چاپلوس زبان دراز اور باتونی ہوتے ہیں ہر انجمن اور بزم کے انچارج بن جاتے ہیں اور اپنی چرب زبانی سے کریڈٹ لیتے رہتے ہیں۔ شمیم ماما میاں اس لیے شعبہ کے فنکشن میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ پروگرام کی میٹنگ میں اقرار اور دستخط کر دیتی تھیں کہ وہ اپنے حصے کا کام کریں گی مگر میٹنگ کے بعد انھیں کوئی مطلب نہیں رہتا تھا۔ انھیں جاوید سے جنم جنم کی حسد تھی۔ وہ جاوید سے تعلیم و تحقیق میں مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے اس تاک میں رہتی تھیں کہ اس کی انچارج شپ میں جو فنکشن ہو اس میں کہیں پر بد نظمی ہو جائے۔ اسے پرنسپل کی ڈانٹ پھٹکار ملے اور تب قہقہہ لگایا جائے۔ وہ موقع ملنے پر پرنسپل اور وائس پرنسپل کے پاس جاوید کی شکایت کرتی تھیں۔ ان کے کان بھرتی رہتی تھیں۔ بہت حد تک انھیں جاوید کے خلاف کر بھی دیا تھا۔ ظاہر ہے جہاں دفتر، انتظامیہ اور پرنسپل مقامی ہوں وہاں پر ایک دور سے آئے ہوئے ملازم کو لوگ

کچھ اور ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جاوید کی کہانی ایسی ہی تھی۔

تقریری مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ طلباء سات سات منٹ کی تقریریں کر رہے تھے۔ پروفیسر شمیم ماما میاں سامعین کی اگلی صف میں ہاتھ سینے پر باندھے بڑے اطمینان سے تقریریں سن رہی تھیں۔ ڈائس سے نیچے داہنی طرف ایک کونے میں ایک کرسی میز تھی جس پر پروگرام کے سارے کاغذات کی فائل لئے جاوید بیٹھا تھا۔ صدر شعبہ ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ مولانا ہال کے باہر کوریڈور کو سنبھال رہے تھے تاکہ ادھر سے طلباء گذرتے ہوئے کوئی ہنگامہ نہ کریں۔ جاوید پروگرام کنڈکٹ کر رہا تھا۔ پرنسپل دس منٹ بیٹھ کر جا چکے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ تقریر چلنے دو۔ میری ضرورت ہو تو بلا لینا میں اپنے چیمبر میں ہوں۔ ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ جاوید دو منٹ کے لیے کوریڈور کی طرف گیا تو دیکھا کہ وائس پرنسپل بیگار صاحب چند پروفیسروں کے ساتھ ہال کے پچھلے دروازہ کے پاس کھڑے تقریر سن رہے ہیں۔ جاوید نے نہایت احترام سے کہا سر اندر تشریف لائیے۔

سائنس کے وائس پرنسپل بیگار صاحب نے اپنا چہرہ گراونڈ کی طرف اور آواز جاوید کی طرف کر کے کہا۔ ”کیا تقریر اور کیا پروگرام ایسا کہیں فنکشن ہوتا ہے۔ کیا ترتیب ہے کیا انتظام ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔“

جاوید نے کہا۔ ”تقریر حسب پروگرام ہو رہی ہے۔ سامعین سے ہال بھرا ہے۔ جج اپنا کام کر رہے ہیں پرفیسر شمیم ماما میاں اور جونیر کالج کی پروفیسر شازیہ سامعین کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہیں۔ سب کچھ بخیر و خوبی چل رہا ہے۔ کیا کمی رہ گئی بتائیے۔“

انھوں نے خشمگیں ہو کر کہا۔ ”تم لوگ ایک گلاس پانی بھی ٹیبل پر نہیں رکھ سکتے۔ کیا اسی کو بخیر و خوبی کہتے ہیں۔“

جاوید کو اندازہ ہو گیا کہ اگر اس نے جواب دیا تو پھر سوال ہوگا اور پروگرام پر اس کا غلط اثر پڑے گا اس لیے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ بیگار صاحب میز پر ایک گلاس پانی نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح بگڑ رہے تھے جیسے ہال میں سامعین کے چہرے شمال اور مقرر

کے جنوب میں ہوں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ڈائس کے حضرات نے ایک ایک گلاس پانی پی لیا تھا۔ طالب علم گلاس دفتر میں رکھ کر پانی کی بوتل لانے گیا تھا۔ یہ سب کچھ تو بیگار صاحب نے دیکھا نہیں اور خواہ مخواہ برس پڑے۔ وہ گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ پرنسپل مہمان خصوصی کو لے کر گئے تو آخری آدھے گھنٹے میں ان کے ساتھ واپس آئے اور مائکروفون پر مہمان خصوصی کی ہزاروں خوبیاں بتائیں جن کا ماحصل یہ تھا کہ جان بہادر نجات اللہ تقریری مقابلہ مہمان خصوصی ہے اور مہمان خصوصی جان بہادر نجات اللہ تقریری مقابلہ ہے۔ تقریری مقابلہ کا موضوع اقبال کی عصری معنویت تھا۔ اس پر وہ بولتے خاک۔ نہ انھیں اردو آتی تھی اور نہ ان کے افراد خانہ کو۔ ان کے بچوں اور وائس پرنسپل کے بچوں نے اس کالج سے گیارہویں بارہویں اور بی اے بی ایس سی کیا تھا۔ اپنے بچوں کو کسی نے اردو نہیں پڑھائی اس کی جگہ گجراتی اور انگریزی پڑھائی لیکن انھیں اردو سے بڑی ہمدردی تھی۔ بہ ہر حال وہ دوبار مائیک پر گئے اور دونوں دفعہ مہمان خصوصی مہمان خصوصی کا طوطا نامہ پڑھ کر بیٹھ گئے۔ دراصل انھیں عجلت تھی دوسرے سیشن کی جس میں ایجوکیشن آفیسر آنے والے تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ جیسے تیسے یہ پروگرام گزر جائے۔

پہلے سیشن اور دوسرے سیشن کے درمیان چائے کا وقفہ ہوتا تھا۔ پروگرام کے ایک دن پہلے جاوید نے رجسٹرار سے کہا تھا کہ چائے کے لئے ہال نمبر ۳ میں انتظام کرنا ہے۔ اس کے لئے دو چپراسی چاہئے۔ رجسٹرار نے کہا دو نہیں بلکہ چار چپراسی کو میں نے کہہ دیا ہے۔ کل آپ کا پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہال نمبر ۳ ٹی بریک کے لئے پوری طرح تیار ملے گا۔ اس کی دیکھ ریکھ پروفیسر شمیم مامامیاں کریں گی۔ آپ اطمینان سے پروگرام کروایئے۔ ہال نمبر ۳ کی فکر چھوڑ دیجئے۔ تقریریں ہوگئیں پہلا سیشن ختم ہوگیا۔ جاوید نے اعلان کیا کہ تمام حضرات چائے کے لئے ہال نمبر ۳ میں تشریف لے چلیں۔ پیچھے پیچھے وہ بھی چلا۔ پھر اس نے دیکھا کہ پروفیسر مامامیاں ہال نمبر ۳ سے نکل کر کچھ پریشان واپس آرہی ہیں۔

جاوید نے پوچھا۔ ''کیا ہوا۔ آپ نے چائے نہیں لی؟''

شمیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ارے آپ کو کچھ معلوم ہے۔ پروگرام کرواتے ہیں۔اور کچھ آپ کو آتا ہے۔ یہ بہت خراب بات ہے۔'' (اسی طرح وہ ہمیشہ جاوید پر نکتہ چینی کرتی تھیں)

''کیا ہوا میں سمجھا نہیں؟''

''ذرا جا کر دیکھئے ہال کو وہاں کیا حالت ہے؟ توبہ توبہ!!''

جاوید نے سمجھا کہ لڑکوں نے بدنظمی کی ہوگی۔ چائے زمین پر گرا دیا ہوگا۔ وہ بھاگتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ ہال میں چپراسیوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بنچ ڈسک سے ہال بھرا تھا۔ فرش میلی تھی۔ چائے اور پیالی رکھنے کے لئے کوئی میز نہ تھی۔ مجبور اًبنچوں کے درمیان آنے جانے کی جگہ میں چائے تھرمس اور پیالیوں کو رکھا گیا۔ پرنسپل مہمان خصوصی کو اپنے چیمبر میں لے آئے۔ جاوید بھاگتا ہوا پروفیسر شمیم ماما میاں کے پاس گیا جو ہال کے پاس چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ لئے کھڑی تھیں۔

جاوید نے پوچھا۔''وہ ہال تو آپ کی ذمہ داری میں تھا آپ نے کچھ دیکھا نہیں؟''

ماما میاں غصہ اور تیور کے ساتھ بولیں۔'' میں کیا کرتی۔ کیا یہ میرا کام ہے۔ چپراسی کا کام ہے۔''

''چپراسی کا کام تو ہے لیکن آپ کی نگرانی میں وہ لوگ کرنے والے تھے۔''

''ارے تو کیا میں انھیں شہر میں ڈھونڈتی۔ وہ آتے تو میں دیکھتی۔''

جاوید نے سوچا اس سے بحث فضول ہے۔ یہ تو ایسے موقع کے انتظار میں رہتی ہے۔اور موقع مل بھی گیا۔ آج تو اس کی عید ہے۔ کچھ اور کہونگا تو پاگلوں کی طرح چلانا شروع کردے گی جیسا کہ ہمیشہ کرتی ہے اور لوگ عورت کی پکار فوراً سن لیتے ہیں۔ اس نے طلباء وطالبات کو کسی طرح ہال نمبر ۳ کے باہر چائے پلادی۔ ہال سے دو بنچ باہر نکلوایا اس پر چائے کا تھرمس اور پیالی رکھی گئی۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے کھڑے کھڑے چائے نوش کرلی۔

ہفتوں پہلے سے جاوید جانوروں اور چپراسیوں کی طرح بھاگ رہا تھا اس کے

باوجود یہ انعام؟ ساری محنتوں کا صلہ اب سنئے۔اب جواب دیجے۔

جاوید پرنسپل چیمبر میں پہنچا۔ پرنسپل نے کہا۔ ''اتنا خراب انتظام ۔تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

جاوید نے کہا۔''سر رجسٹرار صاحب نے کہا تھا ہال پروگرام کے دو گھنٹہ پہلے تیار ملے گا۔ چار چپراسی پروفیسر شمیم ماما میاں کی نگرانی میں یہ کام کرلیں گے۔''

دراصل یہ ساری کارستانی پروفیسر شمیم ماما میاں کی تھی۔ اسے کام خراب کرنے کا ہنر آتا تھا۔ کسی پروگرام میں وہ کچھ نہ کچھ ایسا کر دیتی تھی جس سے اچھے خاصے پروگرام کی بدنظمی اور بدنامی ہوجاتی اور خود بڑی ہوشیاری سے کنارے لگ جاتی۔ آج اس نے پھر یہی کیا تھا۔ اسے پروگرام اور جاوید دونوں کی فضیحت پر خوشی ملتی تھی۔ وائس پرنسپل معمر صاحب نے کہا اس بدنظمی پر پھر میٹنگ ہونی چاہئے۔ وائس پرنسپل بیگار صاحب نے سمجھایا ابھی کیسے کیجئے گا کل کر لیجئے۔ سبھوں نے طے کیا کہ اس خراب نظم ونسق کے لیے پرسوں ایک اہم میٹنگ پرنسپل کے چیمبر میں ہوگی۔ شعبہ اردو کے تمام پروفیسر اس میں حاضر رہیں گے۔

پرنسپل نے کہا چلو چلو ایجوکیشن آفیسر آنے والے ہیں۔ ہال میں دیکھو سب کچھ ٹھیک ہے؟ ایک گھنٹہ کے لئے ایجوکیشن آفیسر مستان صاحب آنے والے ہیں۔ انھیں فون لگاؤ۔

دوسرا سیشن دو بجے دن میں شروع ہوا۔ چائے کے وقفہ میں کامرس کے طلباء بھاگ گئے۔ مشکل سے بیس پچیس ہال میں تھے جو غالباً مقررین تھے۔ پھر سکنڈ فلور سے فزکس لیب سے طلباء کو لایا گیا جو پریکٹیکل کر رہے تھے۔ گیارہویں کے تھے۔ یونیفارم پہن رکھا تھا۔ پریکٹیکل میں بور ہو رہے تھے اس لیے سب کے سب ہال میں آگئے یہ سوچ کر کہ ذرا تفریح رہے گی۔ ایجوکیشن آفیسر کے ساتھ پرنسپل ہال میں آئے اور ڈائس پر براجمان ہوگئے۔ جاوید نے دوسرے سیشن میں ایجوکیشن آفیسر کا استقبالیہ اور تقسیم انعامات سے سامعین کو آگاہ کیا۔ پرنسپل مائکروفون پر آئے اور فرمایا۔

''آج ہماری محفل میں شعبۂ تعلیم کے ایک بڑے آفیسر ڈاکٹر مستان صاحب

تشریف رکھتے ہیں۔ یہ ایک مستعد ،محنتی ،لائق اور دوراندیش آفیسر ہیں۔ ریاستی حکومت نے ان کی کارکردگی سے خوش ہوکر انھیں یہ مقام عطا کیا ہے۔ سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے سنسکرت میں ابھی ابھی پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔ (پی ایچ ڈی پچاس سال کے بعد کی تھی) سنسکرت ایک مشکل زبان ہے اور اس میں پی ایچ ڈی اس سے بھی مشکل تر۔ لیکن انھوں نے ان مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے یہ معرکہ سر کرلیا۔ ہم اپنی طرف سے اس کالج اور کالج ٹرسٹ کی طرف سے انھیں مبارکباد دیتے ہیں۔‘‘

ایجوکیشن آفیسر کو شال اوڑھائی گئی۔ کالج کا میمنٹو دیا گیا۔ گلدستہ پیش کیا گیا۔ آدھا گھنٹہ استقبالیہ پروگرام ہوا۔ اسکے بعد تقریری مقابلہ میں اول دوئم سوئم مقام حاصل کرنے والے طلباء کی تقریریں ہوئیں۔ ایجوکیشن آفیسر صاحب نے انعامات اور سرٹیفکیٹ تقسیم کیے۔ جاوید کے شکریے کے بعد جلسہ ختم ہوگیا۔ اس نے یہ بھی اعلان کردیا کہ تمام حضرات ہوسٹل کے لان میں تشریف لے چلیں وہاں لنچ کا انتظام کیا گیا ہے۔ سب لوگ وہاں چلے گئے۔ والینٹرس نے کرسی اور میزیں لگادی تھیں۔ کچھ سرٹیفکیٹس پر نام لکھنے رہ گئے تھے۔ جاوید ہال میں ہی ٹھہر گیا۔ وہ ان پر نام لکھنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد پروفیسر شمیم ماما میاں اپنی دوست کے ساتھ ہال میں واپس آئیں اور جاوید سے کہا ارے آپ ابتک یہیں ہیں۔ جائیے جائیے کھانا کھائیے کھانا شروع ہوچکا ہے۔ جاوید نے کہا تو آپ ادھر کیوں چلی آئیں۔ شمیم بولیں میں ایسے وقت پیچھے نہیں رہتی میں کھانا کھاکر آرہی ہوں۔ اب کون اتنا انتظار کرے۔ کھانا تو بڑی دیر تک چلے گا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے تو کھالیا۔ جاوید نے دل میں کہا اس کام چور کو دیکھئے چائے کے لئے ہال کو تیار نہیں کیا اور کھانے کا وقت آیا تو سب سے پہلے پیٹ بھر آئی۔ اس کی عیاری دیکھئے جو کام کرے اس پر الزام و تعزیرات اور جو کچھ نہ کرے وہ سب سے پہلے کھاکر ہاتھ سکھارہی ہے۔ اور غور کی بات یہ بھی ہے کہ اتنا ہونے کے باوجود انتظامیہ اسی کے ساتھ ہے۔ معلوم نہیں اتنی محنت اتنی دوڑ بھاگ کے بعد ہم لوگوں سے انتظامیہ کو کیوں عناد ہے ،حسد ہے، نفرت ہے۔ خدا معلوم۔ جاوید

نے ماما میاں سے کہا ہاں چل رہا ہوں یہ چند سرٹیفکیٹس رہ گئے ہیں۔ ان پر نام لکھنا ہے آپ نے تو کھالیا ہے بقیہ سرٹیفکیٹ پر ذرا نام لکھ دیجئے۔ ماما میاں نے کہا نا بابا یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ لکھیے آپ تو اچھا لکھتے ہیں۔ کھانا بہت ہے یہ لکھنے کے بعد بھی آپ کھا سکتے ہیں۔
تمام سرٹیفکیٹ لکھنے کے بعد جاوید ہوسٹل کے لان میں پہنچا۔ سب لوگ کھا رہے تھے۔ مولانا والنیٹرس کے ساتھ میز بانی کر رہے تھے۔ پرنسپل نے جاوید سے کہا ہر طرف دیکھتے رہیے کس کو کیا ضرورت ہے۔ جاوید یہاں وہاں کھانا، پانی اور سوئٹ ڈش سرو کرنے لگا۔ مولانا اور والینٹیر بھی ساتھ دے رہے تھے۔ جب سبھوں نے کھا لیا تو جاوید اور مولانا والینٹیرس کے ساتھ کھانے کو بیٹھے۔ ابھی کھانا شروع کیا تھا کہ چپراسی نے کہا آپ دونوں کو پرنسپل صاحب نے اپنے کوارٹر میں بلایا ہے۔ جلدی جلدی زہر مار کیا۔ اور بھاگتا ہوا کوارٹر میں پہنچا۔ وہاں پرنسپل کے ساتھ پروفیسر عبدالقوی صوفے پر آرام سے بیٹھے ایک ہاتھ سے دانتوں میں خلال اور دوسرے ہاتھ سے پھولا ہوا پیٹ سہلا رہے تھے۔ جاوید اور مولانا سے کہا ''بیٹھئے اور کہا کھانا اچھا تھا۔ بریانی بھی لذیذ تھی۔ کہاں سے منگوایا؟''

''نیشنل کیٹرر سے۔'' جاوید نے بتایا۔

''ٹھیک بنایا ہے بریانی پوری ختم ہوگئی یا کچھ باقی ہے؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''نہیں سر بچ جائے گی۔'' جاوید نے بتایا

''جو بچ جائے ادھر بھیج دیجئے اور کسی کو نہیں دینا ہے۔'' پرنسپل نے حکم دیا۔

''سر قوی سر کے گھر بھی بھجوا دیتے ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''وہ ہم کرلیں گے۔'' پرنسپل نے کہا۔

''اچھا آپ لوگ جائیے۔ ایسے ہی پروگرام کرتے رہنے کا ہے۔ اس سے کالج کا نام ہوتا ہے۔ مہمانوں کو دیکھ لیجئے کن کو کہاں جانا ہے کسی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ پروفیسر قوی نے چبا چبا کر کہا۔ ہاں آئندہ اس سے اور اچھا کرنا ہے۔''

پروفیسر قوی ہر پرنسپل کے ساتھ اسی طرح بریانی کھانے کے بعد مشورہ دیتے

تھے۔ داڑھی اور شیروانی نے ان کے حوصلے اور مقام دونوں بلند کر دیے تھے۔ مولانا اور جاوید سلام کر کے فرسٹ فلور سے نیچے لان میں آئے۔ کیٹرر سے اور چپراسی سے کہا جو کھانا، ڈش اور سلاد بچا ہے سب ایک بڑے برتن میں رکھ کر اوپر فرسٹ فلور پر پرنسپل کے کوارٹر میں فوراً پہنچا دو۔ چپراسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج ویسے بھی پرنسپل کے یہاں کھانا نہیں بنا ہے۔

جاوید نے کہا ''ہاں اس لیے یہاں پر جو کچھ ہے سب وہاں پہنچا دو۔''

جاوید اور مولانا لان سے نکل کر گراونڈ میں آئے۔ ایک ایک مہمان سے پوچھنا شروع کیا۔ آپ کو کہاں جانا ہے کیسے جانا ہے۔ سب کے لیے رکشا منگواتے رہے۔ بس اسٹینڈ کا پتہ بتاتے رہے۔ نذرانہ دیتے رہے۔ شکریہ ادا کرتے رہے۔ مہمان، شرکاء، طلباء اور چپراسی سب جا چکے تھے۔ ایک چپراسی سے کہا ذرا کانفرنس ہال میں دیکھ لیتے ہیں۔ اس نے کہا مجھے ضروری کام ہے۔ شام ہو چلی تھی۔ جاوید کانفرنس ہال میں گیا۔ ڈائس کے میز کی ٹیبل کلاتھ کو شمار کیا۔ مائکروفون اور اسٹنیڈ کو کونے میں رکھا۔ پروگرام کی فائل کو اٹھایا۔ کھڑکیوں کے پردے برابر کیے۔ کھڑکیاں بند کیں۔ لائٹس آف کیا۔ گلدستوں کو میز کی دراز میں رکھا۔ جگ گلاس ٹرے سب کو ایک جگہ رکھا۔ ہال کے دونوں دروازے بند کیے۔ تالا لگایا ہال سے دس قدم پر کالج کا گراونڈ تھا۔ اور اس سے لگ کر کالج سے باہر جانے کا دروازہ۔ جاوید جب گراونڈ میں پہنچا تو کسی شخص کا پتہ نہ تھا۔ پرنسپل اپنی رہائش گاہ پر جا چکے تھے جو کیمپس میں ہی کانفرنس ہال سے دو منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے گراونڈ میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ خاموشی تھی۔ ماحول اداس لگ رہا تھا۔ مہینوں کی دوڑ بھاگ آج ختم ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت اسے رخصت کرنے کے لئے کوئی نہ تھا۔ دن رات کی جانفشانی کے عوض شکریہ کا ایک لفظ کہنے کے لئے کوئی نہ تھا۔ جس نے پرفیسر ہو کر ہوٹل کے بیرا کی طرح کھانا کھلانے سے لے کر پانی پلانا، چائے پلانا، میز کرسی لگانا، کھانا سرو کرنا، کھانا کسی کی رہائش گاہ پر پہنچوانا، مہمانوں کے لئے رکشا لانے تک کی خدمت کی اسے کسی نے ایک لفظ تشکر کا نہیں کہا۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ کالج کا گیٹ آ گیا اس نے

آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے دل میں کہا یا خدا تو نے مجھے کیسے لوگوں کی بستی میں لا کھڑا کیا ہے۔ پروردگار مجھے ان سے نجات کب ملے گی۔ یہ کہتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

ایسے کئی پروگرام سال میں ہوتے رہتے تھے۔ ان مواقع پر جاوید سے دن رات کام لیا جاتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ ذمہ داری دی جاتی۔ بار بار رپورٹ کی جاتی۔ اس کے باوجود صدر شعبہ اور پروفیسر شمیم ماما میاں دونوں وائس پرنسپل اور پرنسپل سے بتاتے کہ یہ لوگ جو باہر سے دوسری ریاستوں سے آتے ہیں وہ بالکل کام نہیں کرتے۔ وہ جاوید جو یونیورسٹی کا ٹاپر تھا یہاں بھیگی بلی بن گیا تھا۔ یہاں شعبہ کے کلیگ اور وائس پرنسپل اور پرنسپل، رجسٹرار اور دفتر کے کلرکوں اور کالج کے چپراسیوں نے اس کی شخصیت کو کچل دیا تھا۔ اس کی انا کو مجروح کر دیا تھا۔ اس کے علم و صلاحیت کی بجلی کو منجمد کر دیا تھا۔ اس کی شخصیت کے اعتماد کو کمزور کر دیا تھا۔ وہ روز بروز قعر ذلت کے دلدل میں دھنستا جا رہا تھا اور اس پر ستم یہ تھا کہ کوئی اس کا ہم زبان نہ تھا۔ کوئی ہم خیال نہ تھا۔ ماحول کی گھٹن اسے آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں کرتی جا رہی تھی اور دور دور تک کوئی باغ نہ تھا کوئی بہار نہ تھی۔ اس کے ناسک جانے کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔

جاوید کے غائبانہ میں یہ میٹنگ پرنسپل کے چیمبر میں ہوئی۔ دونوں وائس پرنسپل، مولانا اور پروفیسر شمیم ماما میاں اور صدر شعبہ موجود تھے۔

پرنسپل نے کہا۔ ''ایسا کیونکر ہوا۔ لگتا ہے شعبے میں کوآپریشن نہیں ہے؟''

مولانا نے کہا۔ ''سر صدر شعبہ نے پروگرام کے پہلے میٹنگ لی تھی۔ اس موقع پر سب کے کام بانٹ دیے گئے تھے۔ مجھے اور جاوید صاحب کو ہال کی تمام ذمہ داری پروگرام کے شروع تا آخر تک اور طلباء اور مہمانوں کے لنچ کا انتظام کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ تو ہم دونوں بہ حسن و خوبی انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر شمیم ماما میاں کے ذمے چائے کے لیے ہال نمبر ۳ کو تیار کرنا تھا۔ اتنا کہا ہی تھا کہ شمیم بھڑ گئیں اور بولیں تو کیا میں اس کام کے لیے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی پھروں؟''۔

پرنسپل نے کہا۔ ''پروفیسر شمیم ماما میاں ابھی آپ سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ جب پوچھا جائے گا تب بولئے۔ اس طرح درمیان میں بول کر میٹنگ کو ڈسٹرب نہ کیجئے۔'' وہ چپ ہوگئیں۔

مولانا کے بیان سے بات واضح ہوگئی تھی کہ کام منقسم تھا اور کس نے اسے انجام نہیں دیا اس کے باوجود میٹنگ چلتی رہی۔

وائس پرنسپل معمر نے کہا۔ '' دوسرے کالج کیطرح اس ڈپارٹمنٹ کو بھی بند کردیا جائے۔''

وائس پرنسپل بیگار نے رائے دی۔ ''فوراً بند نہیں کیجئے۔ آرام سے بعد میں بند کریں گے۔''

شمیمہ بولیں۔ ''وہ جو غیر حاضر ہے اس نے ہم سب کا اڑایا ہے مذاق۔''

پرنسپل نے مولانا سے کہا۔'' جاوید کو فون لگاؤ۔ فون لگ گیا۔'' مولانا نے پوچھا آپ کہاں ہیں۔ یہاں میٹنگ ہورہی ہے۔ آپ کیوں نہیں آئے؟''

جاوید نے بتایا۔'' میرا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ میری بیگم کی طبیعت پہلے سے خراب چل رہی تھی۔ وہ ناسک میں تنہا رہتی ہے۔ میں ناسک سے بول رہا ہوں۔ یہاں پر ڈاکٹر موجود ہیں کہیئے تو ڈاکٹر سے بات کرادوں۔ مولانا نے فون رکھ دیا اور حاضرین میٹنگ سے روداد بتادی۔''

پرنسپل نے کہا۔'' یہ میٹنگ دوبارہ ہونی چاہئے اور مہمان خصوصی کی جو بے عزتی ہوئی ہے (ہال میں چائے نہ پی کر) اس کا مواخذہ یہی ہے کہ انھیں دوبارہ کسی پروگرام میں بلا کر ان کی عزت افزائی کی جائے۔ انھیں پھر سے پھول پہنایا جائے اور ان کی شان میں میں پیپر پڑھے جائیں تب ہی جا کر اس کالج کی شان اور وقار کو پھر سے بحال کیا جاسکتا ہے جو چائے کی بدنظمی کی وجہ سے برباد ہوگیا ہے۔ چائے کی بیڈ سروسنگ (bad servicing) نے ہمارے ادارے کو بدنام کردیا ہے۔ وہ ادارہ جہاں ریاستی سطح پر تقریری

مقابلہ ہوتا ہے مگر یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس مقابلہ میں صرف مالیگاؤں اور احمد نگر کے طلباء شریک ہوتے ہیں یہ روش قائم رہی تو اردو کا کیا ہوگا۔ مہمان خصوصی نے بھی اپنی تقریر میں اردو کی بدحالی کا ذکر کیا تھا انھوں نے کہا کہ اردو پڑھنے والے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ ان سب کی تلافی یہی ہے کہ مہمان خصوصی کو پھر سے دعوت دی جائے، بلایا جائے ان کی عزت افزائی کی جائے اور اردو کو بچایا جائے۔''

میٹنگ کے تمام شرکاء نے پرنسپل کے خیال سے اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ کسی اچھے موقع پر قاضی اشتیاق احمد کو بلائیں گے اور ان کے شایان شان پروگرام بھی کریں گے تاکہ ان کا جو کچھ کھو گیا ہے وہ واپس مل جائے۔ یہ وہی مہمان خصوصی تھے جن کی کتابوں کو شہر کی لائبریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے نکلوا کر سڑک پر پھینکوا دیا گیا تھا اور چیرمین آدم ٹرسٹ جمعدار نے گالی دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس کتے کو پھر کبھی ادھر دیکھنا نہیں مانگتا اگر دکھے تو اس کی جم کر دھلائی کرو۔ اس کتے کمینہ نے لائبریری کمیٹی کے چیرمین شپ کے لئے مجھے ووٹ نہیں دیا اور میں اس کی کتاب لائبریری میں رکھونگا۔ باہر پھینکو اور اس میں آگ لگا دو۔ اس عزت افزائی کے بعد قاضی اشتیاق احمد کبھی اس لائبریری کی طرف نظر نہیں آئے اور اس لائبریری سے تین منٹ کے فاصلے پر بحرالاسلام کالج میں ان کی عزت افزائی کے لیے شاندار پروگرام کے انعقاد کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ایسا نہیں ہوا تو اردو خطرے میں پڑ جائے گی اور اردو کو خطرے میں پڑنے نہیں دیں گے یہ تینوں پرنسپل صاحبان جھنوں نے اردو نہیں پڑھی۔ جن کے کسی بچے نے اردو نہیں پڑھی، گجراتی پڑھی انگریزی پڑھی مگر اردو کو منہ تک نہیں لگایا وہی پرنسپل صاحبان اردو کو بچانا چاہتے ہیں۔ اردو پروفیسروں کی خدمات پر جوتے رکھتے ہوئے جب مہمان خصوصی ڈائس پر پہنچیں گے تو اردو کو حیات نو ملے گی۔

کیمسٹری کے پروفیسر جہانگیر کے ذریعے کالج سے پندرہ کیلومیٹر کی دوری پر جید نگر میں جاوید کو ایک فلیٹ ملا۔ پیشگی رقم دس ہزار روپے دیے گئے اور کرایہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ طے پایا۔ وہ اپنے بوریا بستر کے ساتھ وہاں شفٹ کر گیا۔ وہاں سے کالج جانے کا راستہ

طویل تھا۔ فلیٹ سے نکل کر دس منٹ پیدل چلنے کے بعد وہ روڈ پر آتا۔ وہاں سے کالج کے لئے ڈائرکٹ بس نہیں تھی۔ اس لیے سکس سیٹر (SIX SEATER) رکشا سے چار کیلومیٹر کے بعد ہائی وے پر آتا۔ وہاں سے دس کیلومیٹر کا سفر بس سے طے کرنے کے بعد اتر جاتا۔ دو کیلومیٹر پیدل چلکر کالج میں پہنچتا۔ گویا فلیٹ سے کالج جانے کیلئے رکشا بس اور پیدل تینوں کا سہارا روزانہ لینا پڑتا۔ صبح ساڑھے سات بجے کی کلاس لینے کے لئے پانچ بجے علی الصباح اسے اٹھنا پڑتا۔ چھ بجے اسے روڈ پر آجانا تھا ورنہ ساڑھے سات کی کلاس ناغہ ہوجاتی۔ رکشا سے اتر کر بھاگتے ہوئے روڈ کراس کرنا، دوڑ کر بس میں چڑھنا سیٹ ملے یا نہ ملے اسی بس سے کالج تک جانا اور پھر تیزی سے بھاگتے ہوئے کالج پہنچنا۔ کلاس میں پہنچتے پہنچتے وہ تھک جاتا۔ کبھی کبھی رکشا یا بس تاخیر سے ملنے کی وجہ سے دس منٹ لیٹ بھی ہوجاتا۔ وہ سب سے نظریں بچاتے ہوئے کلاس کی طرف بھاگتا رہتا۔ ایک بار ایسے ہی بھاگ رہا تھا کہ وائس پرنسپل معمر نے اسے بیچ میں روک دیا اور پوچھا کہ تم لیٹ آرہے ہو۔ جاوید نے کہا سوری سر رکشا اور بس کے ملنے میں دس منٹ دیر ہوگئی۔ مین روڈ پر معینہ وقت پر پہنچ گیا تھا لیکن بس دیر سے آئی۔ وائس پرنسپل نے کہا اب کیا پڑھاؤ گے اتنا وقت تو نکل گیا۔ جاوید نے کہا نہیں سر ابھی تو چالیس منٹ باقی ہیں۔ وائس پرنسپل نے منہ بنایا اور منہ پھیر لیا۔ جاوید بھاگتا ہوا کلاس روم میں داخل ہوا اور پڑھانے لگا۔

روز پانچ بجے صبح میں اٹھنا، حاجت ضروریہ، غسل، کپڑے پہننا اور بغیر کچھ کھائے بھاگنا بھاگنا اور بھاگنا۔ اس بھاگم بھاگ سے وہ عاجز آگیا تھا۔ اور بارہ بجے کلاس ختم۔ لیجئے اب پورا دن یونہی مٹرگشتی کرتے رہے۔ کوئی کام نہیں۔ وہ کالج ختم کرکے ہوٹل سے کھانا کھاتا ہوا فلیٹ واپس آتا۔ اسے دیر سے سونے اور دیر سے جاگنے کی عادت تھی۔ یہاں ضابط سویرے سوؤ اور سویرے جاگو کا ہوگیا۔ اس الٹے ضابطے نے اسے ذہنی اور جسمانی طور پر آزردہ اور علیل کردیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ایک سال گذر گیا۔ جس پروفیسر نے جاوید کو یہ فلیٹ دلوایا تھا اس نے ایک دن جاوید سے کہا کہ اگلے مہینے آپ فلیٹ خالی کردیجئے۔ میرا

رشتہ دار جس کا فلیٹ ہے وہ اپنے گاؤں سے رہنے کو آرہا ہے۔ اس لئے خیال رہے۔ تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔

بارش کا زمانہ تھا۔ ایسے موسم میں مکان ڈھونڈنا بڑا مشکل تھا۔ بارش میں کدھر اور کہاں جایا جائے وہ بھی پیدل۔ بس روڈ تک جاتی تھی اس کے آگے جانے کے لئے آٹو رکشا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس کے پاس اسکوٹر بھی نہیں تھا اس لئے سوائے پیدل کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ کچے راستے پر پیدل چلنے میں جوتا اور پتلون دونوں کیچڑ آلود ہو جاتے تھے۔ لیکن مکان تو ڈھونڈنا تھا۔ اس لیے جیسے ہی کالج ختم ہوتا وہ مکان ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ کوئی شام میں بلاتا، کوئی رات میں، کوئی کالج کے وقت، کوئی اتوار کو اور کوئی دوسرے دن۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں باتیں ہوتی رہیں مگر کہیں کچھ نہیں ہوا۔

ایک مہینہ بیت گیا۔ وہی پروفیسر جہانگیر صاحب ایک رات نو بجے دو آدمی کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آئے۔ جاوید نے بیٹھنے کو کہا لیکن وہ نہیں بیٹھے۔ اس رات ان کا تیور بدلا ہوا تھا۔ پروفیسر نہیں لگ رہے تھے۔ بینک کی جماعت برائے انسداد قرض کے فرد نظر آرہے تھے۔ خشمگیں آنکھوں سے جاوید کو دیکھتے ہوئے کہا: ''تاکید کے باوجود آپ نے میری باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ آپ کو کیا بولا تھا۔ اب آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ نے ایک ہفتہ میں فلیٹ خالی نہیں کیا تو آپ کا سارا سامان باہر پھینک دونگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم سے باہر چلے گئے۔

اب جاوید پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ کیا کیا جائے۔ کس سے ملا جائے۔ ایک ہفتہ۔ پروفیسر صاحب کے انداز بیان میں وہ نفرت بھی جھلک رہی تھی کہ یہ غیر ریاست کے لوگوں کو رہنے کو فلیٹ بھی دو اور انھیں خالی کرنے کو بھی بار بار کہو۔ یہ لوگ ہماری ریاست کے بوجھ ہیں اور یہاں کے باشندوں کے لئے دردسر۔

یہ لوگ تو ایسا سوچیں گے ہی۔ انھوں نے ہمیں ملازمت دی ہے۔ ہم یہاں ملازم ہیں۔ ان کی سن کر اور ان سے ملکر رہنا پڑے گا۔ اگر ہم اتنے ہی خوشحال ہوتے تو یہاں

کیوں آتے۔ ہم مجبور ہیں۔ ضرورتمند ہیں۔ ان کی نفرت کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ چلو ہم چھوٹے اور حقیر ہی سہی۔ لیکن نئی رہائش کے لئے اب کیا کریں۔

اداس رات کے بعد اداس صبح آئی۔ جاوید اسٹاف روم میں اداس بیٹھا تھا۔ معاشیات کے پروفیسر جلیل آئے۔ انھوں نے جاوید کو متفکر اور مغموم دیکھا تو پوچھا۔

''کیوں...... صاحب اداس بیٹھے ہیں خیریت؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

جناب فلیٹ اونر نے ایک ہفتہ کا وقت دیا ہے۔ اگلے سنڈے اس کا فلیٹ ہر حال میں خالی کر دینا ہے ورنہ وہ میرا سامان سڑک پر پھینک دیں گے۔ دیکھئے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اس موسم میں فلیٹ ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟

پروفیسر نے سوچتے ہوئے کہا۔'' آپ مغموم نہ ہوں۔ میں اپنی ہاوسنگ سوسائٹی میں ایک فوجی کرنل سے پوچھتا ہوں۔ ان کا فلیٹ بند پڑا ہے۔ وہ سرکاری بنگلہ میں رہتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی جاوید کو جیسے ریگستان میں نخلستان مل گیا۔ اس نے عاجزی سے کہا دیکھئے صاحب جیسے بھی ہو آپ ان سے آج ہی بات کیجئے۔ مجھے ہر لمحہ فلیٹ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ کیسے انتظام ہوگا۔ کہاں نیا فلیٹ ملے گا۔ کس سے کہوں۔ خدا معلوم کیا ہوگا۔

پروفیسر نے کہا۔'' میں کل اسی وقت آپ کو بتاؤنگا۔''

وہ رات بھر یہی سوچتا رہا کہ خدانخواستہ پروفیسر جلیل سے کچھ نہ ہوسکا تو کیا ہوگا؟ ایک ہفتہ میں دو دن گذر چکے ہیں۔ پانچ دن باقی ہیں۔ جتنے لوگوں کو جانتا تھا ایک ایک کو تصور میں لاتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان میں سے کون اس کی مدد کرسکتا ہے لیکن ایک بھی نام ایسا نظر نہیں آیا جو اس کے لئے کچھ کرسکتا تھا۔ ایجنٹ مہنگا فلیٹ دلاتا تھا اور ڈپازٹ، کمیشن کے پیسے الگ۔ ایک ساتھ اتنے روپے اس کے پاس نہیں تھے۔ مارچ اپریل میں ہر سال انکم ٹیکس کی بنا تنخواہ دو مہینے بعد ملتی تھی۔ ان مہینوں میں والدہ اور چھوٹے بھائی بہن

مقروض ہو جاتے تھے جو گاؤں میں رہتے تھے اور یہاں ایجنٹ پورے دو مہینے کا کرایہ بطور کمیشن اور فلیٹ اونر دس ہزار پیشگی مانگتا تھا جو کہ اس کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

اگلے دن کالج اسٹاف روم میں معینہ وقت پر پروفیسر نے بتایا کہ فوجی افسر کا فلیٹ بند پڑا ہے۔ وہ اس میں سے صرف ایک کمرا اور باتھ روم کرایہ پر دینے کو تیار ہیں۔ ایک روم میں رہیں گے؟ اگر پسند ہو تو آج ہی آپ وہاں شفٹ کر سکتے ہیں۔

جاوید نے کہا میں ایک روم میں رہ لونگا اور آج ہی رات دس بجے میں اپنا سامان لے آتا ہوں۔

وہ اسی رات فوجی کے فلیٹ میں شفٹ کر گیا۔ یہ فوجیوں کی رہائشی کالونی تھی۔ کالونی کے قریب ہی ایک دو کیلومیٹر کا ٹیبل لینڈ تھا۔ شام میں کالونی کے لوگ اس پر چہل قدمی اور سیر کرنے کے لئے جاتے تھے۔ وہ بھی جانے لگا۔ اسکی زندگی نشیب وفراز سے گذرتی آرہی تھی۔ اب بھی یہ سلسلہ قائم تھا۔ اسکول میں سب سے کم عمر طالب علم وہی تھا۔ بچپن سے ہی وہ شرمیلا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے لئے اپنے ضلع کے شہر کے کالج میں داخلہ لیا جو اس کے گاؤں سے تیس کیلومیٹر دور تھا۔ یہ سب کچھ اس نے تنہا کیا۔ خاندان میں کوئی اتنا تعلیم یافتہ نہ تھا جو اس کی رہنمائی کر سکے۔ وہ پوچھ پوچھ کر اپنے کام کرتا رہا۔ ایڈمیشن، شہر میں رہنے کا انتظام، کھانے کا بندوبست سب خود ہی کیا کیونکہ کالج کا ہوسٹل نہ تھا۔ خانگی مسائل کی بنا انٹرمیڈیٹ اور بی اے دونوں میں داخلہ لینے میں دیر ہوگئی۔ وہاں بھی کوئی دوست نہ بن سکا۔ ایم۔ فل۔ مکمل کیا۔ پی ایچ ڈی جاری تھی۔ اسی دوران وہ کالج کی ملازمت میں آگیا۔ تنہائی کا سلسلہ یہاں بھی قائم رہا۔ یہاں کا نیا ماحول، نئے لوگ اور نئی پریشانیوں نے اسے اور بھی تنہائی پسند کر دیا۔ یہاں بھی کوئی دوست نہ بن سکا۔ وہ فوجی کے فلیٹ میں آگیا۔ یہ علاقہ شہر سے آٹھ کیلومیٹر دور تھا۔ مین روڈ سے تین کیلومیٹر اندر کالونی تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ایک بار فلیٹ

میں آ گئے تو دوسرے دن ہی شہر جانا ہوتا تھا۔ کالونی سے قریب ہی چار پانچ کیلومیٹر پر پھیلی ہوئی سطح مرتفع تھی جس پر کالونی کے لوگ ہر شام ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ وہ بھی جانے لگا تنہا تنہا اپنی یادوں میں کھویا ہوا، اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوا، اپنے بچھڑوں کے بارے میں سوچتا ہوا، اپنے گھر والوں کو تصور میں دیکھتا ہوا۔ یہی یادیں، چہرے اس کے ساتھی تھے۔ ایک دن رائٹنگ پیپر کاغذ اور قلم لے کر اسی سطح مرتفع پر سیر کرنے گیا۔ ایک سنسان جگہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ دور دور تک قدرت کے دلفریب نظارے تھے۔ اس کا قلم کاغذ پر چلنے لگا۔

پونا شہر سے دس کیلومیٹر دور فوجیوں کی رہائشی کالونی کے پاس کا یہ پہاڑ سطح زمین سے تقریباً تیس فیٹ بلند ہے۔ آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ آج ہوا گذشتہ ایام کی طرح تیز اور سرسر نہیں چل رہی ہے بلکہ ہلکے ہلکے جیسے بادصبا مجھ سے محوِ گفتگو ہو۔ سامنے نشیب میں خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں دکھائی پڑ رہی ہیں جہاں سے بچوں کی کلکاریاں سننے میں آ رہی ہیں۔ ایک گھنٹی بھی بار بار بج رہی ہے۔ یہ گھنٹی نہیں بلکہ خانہ بدوش بچے بجلی کے کھمبے کو پتھروں سے نشانہ بنا رہے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان جھونپڑیوں کے بیچ سے کچھ لوگ شاید مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن یہاں سے وہاں تک اتنا فاصلہ ہے کہ کوئی کسی کو غور سے پہچان نہیں سکتا۔

بائیں طرف جو پہاڑوں کا سلسلہ ہے اس پر بھی یہی قوم براجمان ہے لیکن وہاں مکمل خاموشی ہے اور اس سے پرے ایک اور اونچا پہاڑ ہے۔ جس پر مندر کے کلس نظر آ رہے ہیں۔ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک پتلی سی سڑک نکلی ہے جو پہاڑوں کے دامن کو چھوتی ہوئی ہڑپسر کے علاقے میں داخل ہو گئی ہے۔ یہاں سے سڑک کی صورت نصف چاند جیسی دکھائی پڑتی ہے۔ اسی سڑک پر ایک لڑکی موپڈ کو تنہا آہستہ آہستہ سیکھنے کے لئے چلا رہی ہے۔ اس لیے بار بار آتی ہے اور جاتی ہے۔

خانہ بدوش (بنجارے) کی جھونپڑیوں کے نشیب کی زمینوں کے بعد ریلوے لائن ہے جو ہڑپسر اسٹیشن کو جاتی ہے۔ سامنے حدنگاہ تک کھیتوں، مکانوں، بجلی کے تاروں،

سڑکوں، درختوں اور پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ پہاڑ کی آغوش میں آبادیاں بسی ہوئی ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی جیسے محافظ کا کام کر رہی ہو اور پھر نشیب میں جایئے تو آدم زاد نظر آجائیں گے۔

دور کہیں سے نغمے کی آواز آرہی ہے۔ موسیقی گونجتی ہوئی، کھنکتی ہوئی جیسے تمام یادوں کو سمیٹتی ہوئی سماعت میں داخل ہو رہی ہے۔ سچ ہے یہاں سے دنیاوی رشتے، تعلقات، دوستی، محبت، دشمنی یہ سارے جذبات کتنے ہیچ اور معمولی نظر آتے ہیں جس طرح یہاں سے نشیب کی ہر شئے حقیر و ادنی دکھائی پڑتی ہے۔

سورج غروب ہونے کو ہے۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جارہی ہے۔ جنوری کا مہینہ ہے۔ اس شہر میں اس کا احساس صبح اور شام میں ہوتا ہے۔ دن میں گرمی پڑتی ہے۔ جھونپڑیوں سے کبڈی کھیلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ پوری فضا پر اندھیرا آہستہ آہستہ چھاتا جارہا ہے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ بادل یکجا ہو رہے ہیں اب بارش ہوگی لیکن یہ بادل ابھی منتشر ہو جائیں گے اور بارش نہیں ہوگی۔ اگر اس وقت میرے پاس کیمرا ہوتا تو یہاں سے کئی خوبصورت یادگار تصویریں عکس میں آجاتیں۔ حدنگاہ تک جتنے مکانات دکھائی دیتے ہیں اب ان پر روشنیوں کے قمقمے چمکنے لگے ہیں۔ چاند جیسی سڑک پر جو لڑکی موپڈ چلا رہی تھی اب وہ بھی جاچکی ہے۔ دور کوئی چھوٹا سا ریلوے اسٹشین ہے اس کے پاس کوئی کارخانہ ہے جہاں سے دھواں آسمان کی طرف جارہا ہے۔ بس اور موٹر گاڑیاں نظر نہیں آتیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کافی دوری پر کوئی سڑک ہے جہاں گاڑیاں گذر رہی ہیں۔

اپنے شہر کی تنہائیاں کس قدر سم قاتل تھیں کہ جیوں ہی اکیلا ہوا مایوسیاں، ناکامیاں اور یادیں مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتی تھیں۔ آج اس پہاڑ کی بلندی سے جب میں گذرے ہوئے ان تمام واقعات کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک الگ احساس ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی زندگی میں ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ کیسے کیسے جاں سوز اور نازیبا سلوک کرتا ہے۔ ذرا سے فائدے، تھوڑی سی لالچ اور وقتی مفاد کے لیے یہ آدم زاد کچھ

بھی کرنے سے نہیں چوکتا۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس نے بہت کچھ وہ کیا جو اسے نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ آج اس پہاڑ کی بلندی سے ہمارے وہ دوست یاد آرہے ہیں جو ہر لمحہ جاں نثار کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن وہ سب کے سب کتنے کم ظرف، احسان فراموش اور موقع پرست ثابت ہوئے۔ واقعی دنیا کے رشتے ناتے کسقدر ناپائدار اور جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا ہے۔ کہیں دور سے اذان کی آواز آرہی ہے جیسے سچائی کہیں قائم ہے کہیں موجود ہے۔ سسک رہی ہے۔ آہیں بھر رہی ہے، نوحہ کر رہی ہے، گریاں کر رہی ہے۔ اذان کی آواز سے یہ احساس بھی ہو رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں سچائی، محبت اور دوستی اب بھی موجود ہے۔ ماں، بھائی، بہن اور استاد کی محبت اس احساس کی علامت ہے۔

اب اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اپنے فلیٹ کی طرف گامزن ہوں۔ پہاڑ کے دونوں طرف دور دور تک روشنیوں کی قطار کھڑی ہے۔ چھوٹے جگنو، بڑے جگنو اور اس سے بڑے جگنو چاروں طرف منتشر ہیں۔ وہاں دور قمقموں نے سانپ کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کے آس پاس کے یہ قمقمے پانی میں کنول جیسے نظر آتے ہیں اور اس سے پرے اس کی ہئیت گلاب کے پھولوں جیسی ہے۔ میں روشنیوں کے قریب ہوتا جا رہا ہوں اور پہاڑوں سے دور آ گیا ہوں۔ آبادی پر پھیلے ہوئے قمقموں نے فضا کو اس طرح بدل رکھا ہے کہ جیسے یہ شہر پانی پر پھیلا ہوا ہے اور پانی میں قمقمے جگنوؤں کی طرح چمک رہے ہیں۔ اب میری رہائشی کالونی چند قدم پر ہے۔ یادیں ہمارے ذہن سے بھاگ بھاگ کر معدوم ہوتی جا رہی ہیں اور نئے ارادے اور نئے مقاصد مجھ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔

جاوید نے مہینہ کے آخری ہفتہ میں فوجی کے فلیٹ میں شفٹ کیا تھا۔ چند مہینوں کے بعد سے ہی فوجی صاحب کی سپاہی گیری شروع ہو گئی۔ کبھی کہتے پانی کا کرایہ الگ، کبھی بجلی کا الگ، کبھی ایک کمرے کے کرایہ میں دو سو روپے اور جوڑا جائے۔ جاوید ٹالتا رہا۔ لفٹننٹ کرنل صاحب صرف ایک کمرا میرے استعمال میں ہے۔ ایک بلب جلتا ہے۔ اتنا سا

کے لئے پانی اور بجلی اور کمرے کا کرایہ کیوں بڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے نہیں یہ تو آپ کو دینا پڑے گا۔ اگلے مہینہ میں نہیں چھوڑونگا۔ شہروں میں کرایہ کا ایگریمنٹ گیارہ مہینے کا ہوتا ہے۔ یہ اگریمنٹ بھی بنایا گیا تھا۔ گیارہویں مہینے کے نصف میں ہی جاوید نے کمرا خالی کردیا اور مومن پورہ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں شفٹ کر گیا جو کسی ہاؤسنگ سوسائٹی میں نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا دو فلیٹ کا مخدوش مکان تھا۔ ڈھیر ساری دقتیں تھیں۔ کہنے پر بھی کوئی نہیں رہتا تھا۔ جاوید کو ضرورت تھی چلا گیا۔

ادھر نصف مہینہ کا کرایہ دینے لفٹنٹ کرنل صاحب کے بنگلے پر جاوید پہنچا۔ کرنل صاحب غصہ میں آگ بگولہ۔ کرایہ لینے کو تیار نہیں۔ میں اس طرح کرایہ نہیں لونگا۔ یہ کرایہ پورا نہیں ہے۔ ہر مہینہ کا دو سو روپیہ بقایا یعنی اضافہ شدہ کرایہ دو ہزار دو سو۔ بجلی پانی کا کرایہ الگ دینا پڑے گا۔ آپ نے خاموشی سے کمرا چھوڑ دیا۔ کمرا خالی کرنا ہے کیوں نہیں بتایا۔ جاوید نے کہا میں تو نصف مہینہ کا کرایہ ہی دے پاؤنگا۔ فوجی بولا تو میں پروفیسر جلیل سے بات کرونگا۔ ان کے سامنے فیصلہ ہوگا۔ جاوید لوٹ آیا۔ جلیل صاحب سے ملا۔ داستان سنائی۔ وہ غصہ میں آگئے۔ کہا فوجی ہوگا اپنے گھر کا۔ کوئی زبردستی ہے۔ کرایہ کا مکان جب چاہا خالی کردیا۔ کوئی پورا فلیٹ تو انھوں نے نہیں دیا تھا۔ ایک کمرے کا کیا ہے رہے نہ رہے۔ میں ان سے بات کرونگا۔ لیکن فوجی نے جلیل صاحب کی بات بھی نہیں مانی۔ کہا مجھے کرایہ میرے حساب سے دینا پڑے گا ورنہ میں کورٹ میں جاؤنگا۔ جلیل صاحب کو بھی غصہ آگیا۔ انھوں نے جواب دیا جس کورٹ میں جانا ہے جائیے۔ اسی پر بات ختم ہوگئی۔ جاوید کو بتایا کہ یہ فوجی ایسے نہیں مانے گا۔ فوجی میڈیکل کالج اے۔ ایف۔ ایم۔ سی۔ میں ایک ڈاکٹر ہے جس نے اس لفٹنٹ کرنل کی ایک بار پٹائی کی تھی اسی کے فلیٹ میں گھس کر۔ پھر اسی سے اسے ٹھیک کرانا ہوگا۔ فوجی ڈاکٹر نے فوجی کی جم کر خبر لی۔ پانی، بجلی اور دو سو روپے سب طاق پر دھرے رہ گئے۔ آخر کار وہی لینا پڑا جو جاوید نے کہا تھا۔ وہ رقم فوجی ڈاکٹر کے ذریعے ہی اسے دی گئی تب جا کر فوجی سے جان چھوٹی۔

تقریری مقابلہ ہو یا کتاب کی رسم اجراء یا ادیبوں کا استقبالیہ یا سیمینار کالج میں ان کا انداز ترتیب اور پیشکش مختلف ہوتی ہے۔ مختلف کو کالے جیّت بھی کہہ سکتے ہیں جیسے علاقائیت، مکانیت یا ارضیت وغیرہ۔ اگر ایک پروفیسر ایسا ہے جو کسی پروگرام کو اس کے معیار پر کرنا چاہتا ہے تو وہاں بیس پروفیسر، دس غیر تدریسی اسٹاف (جس میں وائس پرنسپل پرنسپل اور رجسٹرار بھی شامل ہیں) ایسے ہوتے ہیں جو پروگرام کو اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ یعنی وہی کالے جیّت کا ایسا رنگ چڑھائیں گے کہ دیکھنے اور شریک ہونے والا سمجھ جائے کہ یہ پروگرام اس کالج کا ہے اور جب یہ بیس ہر فنکشن کو اپنی لونڈی سمجھنے لگتے ہیں تو اس ایک پروفیسر کو جس ذہنی کرب سے گذرنا پڑتا ہے اس کا اظہار ممکن نہیں۔ وہ لمحہ لمحہ اپنے آپ میں مرتا ہے مگر کچھ کر نہیں پاتا۔ اس کے بس میں کچھ ہوتا بھی نہیں۔ کالجوں کے فنکشن کو غور سے دیکھیئے تو محسوس ہوگا کہ یہ سیمینار نہیں بلکہ دوستوں اور رشتہ داروں کے ملنے ملانے کی محفل ہے۔ سلام وملاقات پر فنکشن شروع سلام و خدا حافظ پر ختم۔ سکنڈ گریڈ کے پیپرس اور تھرڈ گریڈ کی بحث سیمینار کا حاصل صفر۔

بحرالاسلام کالج کے ادبی جلسوں کی بھی یہی حالت تھی۔ جب ذمہ داران ہی اردو سے پیدل ہوں تو فنکشن سے طلباء کو کیا حاصل ہوا اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بحرالاسلام کالج کے بے روح فنکشن کو دیکھ کر یہ لگتا کہ یہاں اردو زبان کو دافع بلیات کے لئے رکھا گیا ہے۔ گویا اردو کے رہنے سے بھوت پریت دور رہیں گے اور برکت نزدیک رہے گی۔

جاوید اور مولانا سیمینار کے سلسلے میں گفتگو کرنے پرنسپل کے چیمبر میں داخل ہوئے۔ سلام کیا۔ بڑا سیاہ چہرہ، بڑی آنکھیں، پھولے گال، بڑا منہ اور بڑے دانت کو دکھاتے ہوئے وعلیکم سلام کہا۔ جاوید نے بتایا کہ اگلے مہینہ ریاستی سیمینار کرنا ہے۔ اس لیے ہم لوگ حاضر ہوئے ہیں۔

پرنسپل نے کہا۔ ''تم لوگ کچھ بھی نہیں کرتے۔ کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ کوئی ایکٹی ویٹی نہیں ہوتی یہ فضیحت ہمیشہ جاوید کی کی جاتی تھی۔ پروفیسر شمیم ماما میاں سے اس لب ولہجہ

میں مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ پروگرام کی تیاری شروع تا آخر جاوید ہی کرتا اور ڈانٹ پھٹکار اسی کو پڑتی۔ اس سے ایسی بات پوچھی جاتی جس سے اسے ذہنی اور نفسیاتی چوٹ پہنچے۔ اسے رسوا کیا جا سکے۔ موقع، کچھ سوال کچھ۔

''تمہارے TYBA SPECIAL (بی اے آنرس آخری سال میں) میں کتنے اسٹوڈنٹس ہیں؟''

''سر پانچ یا چھ ہیں۔''

''لکچر کو کتنے آتے ہیں۔''

''دو تین آتے ہیں۔''

''نہیں کوئی نہیں آتا ہوگا۔ وہ اسٹوڈنٹ TYBA GENERAL (بی۔ اے پاس کورس) کے ہونگے۔''

''جی ہاں وہی کلاس میری ہے۔ پانچ چھ اسٹوڈنٹس ہیں۔'' ایسا HOD نے بھی کہا ہے۔

مگر ایسا کس طرح چلے گا۔ TYBA SPECIAL میں اتنے کم اسٹوڈنٹس۔ تم لوگ آخر کرتے کیا ہو۔ لڑکوں میں انٹریسٹ نہیں پیدا کرتے۔ ان سے ملتے نہیں۔ انھیں ڈھونڈتے نہیں کلاس نہیں لیتے۔ کلیگ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے نہیں تو لڑکے آئیں گے کہاں سے۔ اگر یہی صورت حال رہی تو ایکدن کاڈیا کالج کی طرح یہاں کا اردو ڈپارٹمنٹ بھی بند ہو جائے گا۔ وہاں کے اسٹاف بھی آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے نتیجتاً ڈپارٹمنٹ بند ہو گیا۔

جاوید محتاج، بھکاری اور فقیر بنا سر جھکائے سنتا رہتا۔ یہ واقعہ ہر سال ہوتا۔ ہر سال کسی نہ کسی کلاس میں لڑکے کم رہتے ہیں۔ جس کی پھٹکار صرف جاوید کو سنائی جاتی۔ مولانا آگئے۔ کہنے لگے اس سال اردو میں جو لڑکے نظر آرہے ہیں وہ میری کوششوں کا ثمرہ ہے ورنہ اتنے بھی نہیں ہوتے۔ لیجئے پھٹکار پہلے سے پڑ رہی تھی انھوں نے آکر جلے پر نمک ڈال دیا۔

جاوید نے دھیرے سے مولانا کے کان میں کہا ''اس کی کئی وجہیں ہیں۔ لڑکے جان بوجھ کر سوچ سمجھ کر ہندی لیتے ہیں۔ انٹریسٹ کے لئے کہو تو کہتے ہیں مکھن مت لگاؤ سر۔''

مولانا نے اونچی آواز میں کہا۔ ''ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ مجھ سے بھی کئی لڑکوں نے یہی کہا سر تم مجھے زبردستی اردو عربی میں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ اس کے پڑھنے سے کیا ہونے والا ہے؟''

پرنسپل کے بازو کی کرسی پر کلیم کلرک بیٹھا تھا اس نے کہا: سر مجھے اسی طرح ایک اسٹوڈنٹ نے کہا۔ دراصل اردو میں طلباء کی تعداد میں اضافہ کے لیے ایک پالیسی بنانی پڑے گی جس کی ابتدا جونیر کالج سے کرنی ہوگی اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اردو میڈیم اسکول سے جو طلباء جونیر کالج (گیارہویں بارہویں) میں آتے ہیں وہ اردو میڈیم سے آنے کے بعد بھی جونیر کالج میں ہندی کیوں لیتے ہیں۔

ہائر ایجوکیشن اور ایڈمیشن کی پالیسی پر کلرک کے مشورے کو پرنسپل خاموشی سے سنتے رہے۔ تعداد طلباء کی فہرست کو چیک کرتے رہے۔

جاوید کو مائنر ریسرچ پروجیکٹ کیلئے دلی جانا تھا جس کے لئے پانچ دن کی چھٹی چاہئے تھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ کچھ اور ہی ہوگیا۔ اسٹوڈنٹ کے کم ہونے پر ڈانٹ رہے ہیں۔ پانچ دن کی چھٹی کی سن کر کہیں معاملہ الٹا نہ ہوجائے۔ اس لیے نے اس وقت چھٹی کا ذکر نہیں کیا۔

''تم یونیورسٹی میں اکزامنر کے لیے جاتے ہو یا نہیں؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''نہیں سر۔'' جاوید نے کہا۔

''ذرا کالج سے باہر نکلا کرو۔'' پرنسپل نے کہا۔

ادھر یونیورسٹی اکزامنر کی کہانی یہ تھی کہ مسلسل چودہ سال تک درخواست دینے کے باوجود بھی صدر شعبہ جو اس کمیٹی کے ممبر تھے جاوید کا نام فہرست میں نہیں آنے دیا۔ کلرک کلیم نے بتایا اس بار جونیر کالج کا اپروول ورکشاپ (Approval Workshop) اپنے

کالج میں ہوگا۔

''ٹھیک ہے اس موقع پر تعلیمی انتظامیہ کے چار کارکنان آئیں گے ان کے کھانے کا انتظام اسے (جاوید) دے دو۔''

جاوید نے کہا۔''جی ہاں میں کھانے پینے کا پورا انتظام کرونگا۔''مختلف پروگرام میں جاوید سے اسطرح کا کام بار بار کرایا جاتا۔ پروفیسر کی ذمہ داری چھین کر کلرکوں کو دے دی جاتی۔ کسی کو اس غلط مینی فسیٹو پر اعتراض اور افسوس نہ ہوتا۔ اس لیے بھی سر تسلیم خم کرلیا۔

کلرک کلیم نے جاوید سے مسکراتے ہوئے کہا۔''سر آپ کھانے پینے کا انتظام کرلیں گے؟''

''ہاں میں کرلونگا انشاءاللہ۔'' کلرک مسکرایا اور کاغذات کو دیکھنے لگا۔

کلرک، چپراسی، صدر شعبہ اور انجان افراد کے سامنے بارہا جاوید کو ذلیل کیا جاتا۔ اس پر جو گذرتی اسے خود ہی برداشت کرتا۔ یہ اس کے برے اعمال کا نتیجہ تھا یا تقدیر کی ستم ظریفی اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ سوائے سوچنے کے وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اردو پڑھی اس میں میرا قصور ہے۔ والدین کا ہے۔ سماج کا ہے۔ کس کا ہے کسے کہا جائے۔ والد مرحوم تو میرے گریجویشن کرنے کے پہلے ہی گذر گئے۔ انھیں تو کالج اور سبجکٹ کی جانکاری بھی نہیں تھی۔ خود میں بھی سبجکٹ کی اہمیت اور اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اب جو لوگ اردو پڑھ رہے ہیں وہ کیا سوچ کر پڑھ رہے ہیں۔ یونیورسٹی اس سبجکٹ کو بند کیوں نہیں کردیتی تاکہ آنے والے امیدواروں کے آنسوؤں، ہچکیوں،، نامرادیوں، جھڑکیوں، ڈانٹوں اور پھٹکاروں کا سلسلہ ختم ہوجاتا۔ میری طرح کسی اور کو پھر اس ذہنی اور نفسیاتی کرب سے تو نہ گذرنا پڑتا۔ حکومت کو اس سے کیا غرض ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اردو مسلمانوں کی ہے وہی پڑھتے ہیں وہ سمجھیں وہ بھگتیں مجھے کیا۔ اس کی اسامی بھی وہیں ہے جہاں مسلمان کی اکثریت ہے اور ایسے ادارے بھی گنتی کے ہیں انھیں یونہی چلنے دو۔ احسان تو میرا ہی شمار ہوگا۔ کسی کی زندگی اس میں رتی ہے تو رہے۔ اس

میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد آج یہی احساس ہوتا ہے کہ زندگی رائیگاں چلی گئی۔ اگر اتنی محنت کسی اور سبجکٹ میں کیا ہوتا تو شاید نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ نتیجہ جیسا بھی ہوتا لیکن اتنی ذلت ورسوائی تو نہیں ہوتی۔ ممکن ہے دوسرے سبجکٹ میں نوکری ہی نہیں ملتی کیونکہ وہاں امیدوار بھی تو ہر مذہب وملت کے ہوتے۔ کیا ہوتا اور کیا نہیں ہوتا یہ تو اپنی جگہ مگر مجھے ہر سال اور رٹائرمنٹ تک ذلیل ورسوا ہوتے رہنا ہے۔ چودہ سال ہونے کو جارہا ہے لیکن آج بھی جب کالج میں قدم رکھتا ہوں تو لگتا ہے پہلا قدم ہے۔ وہی اجنبیت، وہی تعصب، وہی علاقائیت اسی شدومد کے ساتھ آج بھی برقرار ہے۔ جیتے جی جب یہ لوگ دشمنوں کی طرح دیکھتے ہیں تو میری میت کو تو کوئی جھانکنے بھی نہیں آئے گا۔

جاوید نے پرنسپل سے کہا۔ ''سر پروگرام ہی کرنے کو ہم لوگ آئے ہیں۔ آپ کو ہی سیمینار کا موضوع انتخاب کرنا ہے۔

''میں نہیں بلکہ ہم اور آپ مل کر طے کریں گے۔'' پرنسپل نے بتایا۔

''جی بہتر جیسا آپ کہیں۔'' جاوید نے کہا۔

جب وہ موضوع طے کر کے بتاتا تو کہتے یہ موضوع نہیں چلے گا۔ آخر میں خود ہی طے کرتے۔ اس لیے جاوید نے موضوع پوچھا تھا۔

''آپ لوگ کچھ کرتے نہیں۔ ریسرچ پروجیکٹ نہیں لیتے۔'' پرنسپل نے خفگی کا اظہار کیا۔

''سر مائنر ریسرچ پروجیکٹ تو لیا ہے میں نے۔'' جاوید نے بتایا۔

پرنسپل نے کہا۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ میجر لینا چاہئے۔'' (جبکہ خود پرنسپل نے اپنی ابتک کی زندگی میں نہ کوئی مائنر ریسرچ پروجیکٹ کیا تھا نہ ایک ریسرچ پیپر لکھا تھا)

جاوید نے کہا۔ ''سر ایک ہی ساتھ آدمی کیا کیا کام کرے گا۔ ابھی تو میں دلی علی گڑھ بمبئی سے ریسرچ کا کام کر کے لوٹا ہوں۔ سلیبس (syllabus) مکمل کرنا ہے۔ امتحان کی ڈیوٹی کرنی ہے اور سیمینار کی تیاریاں ہیں۔ ریسرچ پروجیکٹ کا کام گھر میں کرتا

ہوں۔ کالج میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں بیٹھ کر یکسوئی سے یہ کام کیا جا سکے۔ اردو کا اپنا علیحدہ شعبہ نہیں ہے۔ اس لیے شعبہ میں بھی بیٹھا نہیں جا سکتا۔ ہر سال یہ مشترکہ شعبہ بھی شفٹ ہوتا رہتا ہے۔ کبھی سائنس والوں کے ساتھ کبھی کامرس کے اور کبھی آرٹس کے۔''

یہ سن کر پرنسپل کے چہرے پر تناؤ آ گیا بولے۔ ''ارے آپ کیا ریسرچ کریں گے؟'' ''میں نے بھی ریسرچ کیا ہے (پی ایچ ڈی ریسرچ) آپ کو کیا معلوم۔ کیسی کیسی حالت میں ریسرچ کیا ہے۔ ارے آپ لوگ اردو کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے۔ کوئی اچھا پروگرام ہے تو مجھے انٹریسٹ ہے ورنہ نہیں۔ اس دو لاکھ کے لئے مجھے کیا کیا نہیں کرنے پڑے۔ مجھے یو جی سی آفیسر (ریجنل دفتر کا) نے کہا کہ تو نڈوال صاحب اگر آپ اتنے انٹریسٹیڈ ہیں تو ہم اردو کو فنڈ ضرور دیں گے۔ ایک آپ لوگ ہیں کہ اردو کے لئے کچھ نہیں کرتے۔''

دراصل تو نڈوال صاحب کو دو لاکھ فنڈ کی کہانی سنانی تھی جس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس فنڈ کی منظوری کے لئے یو جی سی ایجوکیشن آفیسر نے کہا تھا کہ اردو پروفیسروں کے ریسرچ پیپرس اور کتابیں جو انھوں نے لکھے ہوں لائیے۔ جاوید نے بھی اپنی دو کتابیں دی تھیں۔ فنڈ منظور ہو گیا۔ روپے بھی مل گئے لیکن اس کے اظہار کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ کر ہی دیا۔

جاوید نے کہا ''سر اسی فنڈ کا اردو کے لے کمپیوٹر خریدا گیا ہے جو مہینوں سے کامرس ڈپارٹمنٹ کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ بقیہ روپے سے کامرس ڈپارٹمنٹ کے لئے کچھ انسٹرومنٹ خرید لیے گئے حساب اردو فنڈ میں منہا کر دیا گیا۔ ہم لوگ تو اس فنڈ کا کچھ بھی نہیں جانتے۔''

اب تو پرنسپل کو ایسا لگا جیسے کسی نے انھیں روپیہ غبن کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ ایسے وقت میں ان کے سیاہ چہرے کی سفید آنکھیں بڑی ہو جاتی تھیں اور بڑے بڑے دانت نظر آنے لگتے تھے جیسے اندھیری رات میں بھوت آنکھیں

کھولے اور منہ کھولے کھڑا ہو گویا سارا کا سارا چہرہ کسی پرلے درجے کے احمق کا چہرہ بن جاتا تھا۔ جب کوئی جواب نہیں سوجھا تو کہا مجھے ایک جگہ جانا ہے ضروری کام ہے۔ کل آپ لوگ وائس پرنسپل معمر سے ملو۔ یہ کہتے ہوئے وہ چیمبر سے باہر چلے گئے۔ جاوید اور مولانا ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

مولانا نے کہا۔ ''جاوید صاحب آپ کو اردو فنڈ کے استعمال کے اکاونٹ بتانے کی کیا ضرورت تھی؟''

جاوید نے کہا۔ ''یہ کوئی بات ہوئی۔ ہم لوگ سال بھر شعبہ کا کوئی نہ کوئی کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت بھی کام سے ہی آئے۔ ہم لوگوں کی ہمت افزائی کے بجائے لگے اپنی داستان امیر حمزہ سنانے۔ فنڈ ملا تو اس میں ہماری کتاب بھی یو.جی.سی والوں نے دیکھی تھی۔ اس کا کبھی ذکر نہیں کیا اور لگے دو لاکھ دو لاکھ رٹنے جبکہ دو لاکھ میں بیس ہزار کا معمولی سا کمپیوٹر اردو کے نام پر خرید کر بقیہ روپیہ کامرس والوں نے استعمال کیا۔ اس ناانصافی اور حق تلفی کا کیا جواب ہے۔ اور وہ کمپیوٹر بھی کامرس والے چلاتے ہیں۔ انھیں کے شعبہ میں رہتا ہے۔ تعریف و تحسین کے بھوکے۔ نہ کوئی ایوارڈ، نہ کوئی ریسرچ پیپر اور ہمیں نصیحت کرتے ہیں۔ پہلے میرے برابر ریسرچ پیپرس اور کتاب تو لکھیں۔ مجھے تو دیکھ کر سلگ جاتی ہے۔ ڈھیلا، متعصب، حاسد کہیں کا۔ سارا بخار علاقائیت کا ہے۔ ہم لوگوں کی جگہ اگر کوئی مقامی ہوتا تو دیکھتے کیسے مسکرا کر باتیں ہوتیں۔ چائے آتی۔ خاندان کی خیریت پوچھی جاتی۔ ہم لوگوں کا تعلق دوسری ریاست سے ہے اس لیے نالائق ہیں۔

مولانا نے کہا اچھا ہو گیا یہ سب رہنے دیں۔ یہ باتیں کرتے دونوں کنٹین میں گئے۔ چائے پی۔ غم وغصہ کو ٹھنڈا کیا۔ اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے مولانا نے جاوید سے کہا سیمینار کے لئے کل وائس پرنسپل سے ملنا ہے۔ کچھ سوچ کر آیئے گا۔

جاوید بستر پر لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ سیمینار کا خیال بار بار آرہا تھا۔ آج ایک پرنسپل نے اردو فنڈ پر سیمینار کی گفتگو ختم کر دی۔ ان کے لیے سیمینار

سے زیادہ اس فنڈ کی اہمیت تھی جو انھوں نے یو جی سی سے حاصل کی تھی۔ سائنس میں پی ایچ ڈی اردو سے نابلد اور سیمینار کا موضوع طے کریں گے۔ موضوع کیا طے کرتے خود ہی طے ہو لیے۔ جاوید جو یونیورسٹی کا ٹاپر تھا۔ مشہور یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھا۔ عالمی شہرت یافتہ ادیب پروفیسر کا شاگرد تھا۔ وہ یہاں کالج میں سائنس کے پروفیسروں کے پاس سیمینار کا موضوع متعین کر رہا تھا۔ کل وائس پرنسپل سے سیمینار پر بات کرنی ہے۔ وہ بھی کامرس کے پروفیسر۔ تجارتی نقطۂ نگاہ سے ادبی جائزہ لیں گے۔ یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن جاوید اور مولانا وائس پرنسپل معمر سے ملنے چلے۔ ان کا چیمبر دس بائی آٹھ کے رقبہ پر تھا۔ نشست کی ترتیب مشرق و مغرب کی تھی۔ مغرب میں خود بیٹھتے اور مشرق میں ملاقاتی اور درمیان میں میز۔ شمال کی لمبی میز پر فون اور کمپیوٹر آس پاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ کمپیوٹر نہ جانے کتنے مہینوں سالوں سے یونہی اسی جگہ کھڑا کھڑا ہر آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ کمپیوٹر کے قریب اسپیکر تھا جسے بولتے ہوئے کسی نے نہیں سنا۔ ہاں فون ضرور بجتا تھا۔ میز کے جنوب میں ایک کرسی تھی جس کے پیچھے کی دیوار پر دو کھڑکیاں تھیں جہاں سے کالج کا گراونڈ، کمپیوٹر سائنس بلڈنگ کینٹین، اور گرلس ہاسٹل دکھائی دیتا تھا۔

دونوں چیمبر میں داخل ہوئے۔ سلام کیا۔ جواب ندارد۔ گردن ہلی۔ بیٹھنے کو نہیں کہا گیا اس لیے دونوں خود ہی بیٹھ گئے۔ پروفیسروں نے جاوید کو بتایا تھا کہ ان کے چیمبر میں تہذیب و اقدار کی امید مت رکھنا۔ یہاں تشریف رکھئے اور خدا حافظ یہ سب کچھ نہیں چلتا۔ بے دھڑک جاؤ بات کرو بیٹھ جاؤ یہی کلچر ہے۔ دونوں کرسیوں پر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ان کی عادت تھی جب بھی کوئی ان کے سامنے بیٹھتا وہ کسی کاغذ کو دیکھنے لگتے اور اس پر ریمارک شروع کر دیتے۔ آج بھی وہی کر رہے تھے۔ دونوں ان کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ انہیں ریمارک سے جب فرصت ملی تو مخاطب کے شرٹ کے سینے پر ٹھہر گئی۔ یہ ان کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ وہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر چہرہ دیکھتے ہوئے کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ سینے پر نظر رہتی اور اسی درمیان ایک لمحہ کے لئے چہرہ دیکھ لیتے اور پھر سینے پر۔ خدا معلوم خواتین

پروفیسر کو کس طرح دیکھتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ مخاطب کے سینے پر سے نظر اٹھی تو میز پر اور وہاں سے ہٹی تو پھر مخاطب کی شرٹ اور سینے پر ٹک گئی۔ نشیب وفراز سے گذرتی رہی مگر ہونٹ ساکن۔ آخر کار جاوید نے خاموشی توڑی اور کہا سر ہم لوگ سیمینار کی تیاری کر چکے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا۔ ''تو پھر دو کیوں آئے۔ سب کو لاؤ۔''

سب کو لاؤ سے مراد تھی شعبہ کے بقیہ پروفیسر۔ دونوں چیمبر سے نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بقیہ دونوں بھی مل گئے۔ ایک لیڈیز اسٹاف روم میں تھیں اور دوسرے کینٹین میں چائے پی رہے تھے۔ اب چاروں وائس پرنسپل کے سامنے بیٹھے تھے۔

وائس پرنسپل نے پوچھا۔ ''کیا تیاری ہے بتایئے۔''

پروفیسر شمیم ماما میاں نے ان کے ہاتھ میں پروگرام چارٹ دے دیا۔ انھوں نے پڑھا اور پوچھا۔ ''کون کیا کام کریں گے؟''

شمیم نے بتایا۔ ''سر ساری تیاری ہوگئی ہے۔ کھانے کے لئے کہہ دیا ہے۔ فوٹو گرافر کو بتا دیا ہے۔ رسورس پرسن سے تاریخ طے ہوگئی ہے۔ کارڈ چھپ گیا ہے۔ سب کچھ ہوگیا ہے۔''

وائس پرنسپل نے کہا۔ ''پروگرام کی ترتیب کیا ہوگی۔ ہال میں اسے کنڈکٹ کون کرے گا؟''

شمیم بولیں ''سر پروگرام کو شروع میں مولانا سنبھالیں گے۔ پھر درمیان میں تھوڑی دیر کے لئے میں آجاؤنگی۔ اور آخری حصہ حارث الدین کے ذمہ ہوگا۔''

وائس پرنسپل نے کہا۔ ''اور شکریہ کون کہے گا؟''

شمیم بولیں ''شکریہ اردو والے کردیں گے۔''

وائس پرنسپل نے جاوید سے پوچھا۔ ''کیوں آپ پروگرام کو نہیں کنڈکٹ کررہے ہیں۔ کم سے کم ایک سیشن آپ لے لیجئے۔''

جاوید نے کہا۔ ''سر سارا پروگرام بن چکا ہے۔ مولانا تیاری کر چکے ہیں۔ کمپیوٹر بلڈنگ کے پیچھے گرلس ہاسٹل سے ملحق گراونڈ میں میں چائے اور لنچ کا انتظام کرونگا اور

انتظام قاعدے سے کرنا ہے۔''

وائس پرنسپل نے پوچھا۔''آپ قاعدے سے کرلیں گے۔''

جاوید نے کہا۔''جی ہاں کرلونگا انشاء اللہ (ظاہر ہے یونیورسٹی ٹاپر کو خانساماں کا کام ہی کرنا چاہئے)''

وائس پرنسپل نے مولانا سے کہا۔''دیکھو مولانا سیمینار میں کسی قسم کی کمی نہیں ہونی چاہئے اور اردو والے کو کوئی شکایت نہ ہو کیونکہ اردو پروگرام میں اکثر کمی رہ جاتی ہے۔ آڈینس نہیں ہوتے لیکن پروگرام اچھا ہونا چاہئے۔''

جاوید نے بتایا۔''سر ساری تیاری ہوچکی ہے۔سب کچھ ٹھیک ہی رہے گا انشاءاللہ۔''

وائس پرنسپل نے پوچھا۔''رسورس پرسن کون کون آرہے ہیں؟''

شمیم بولیں۔''بمبئی سے تمام رسورس پرسن آرہے ہیں۔ان میں ایک لوکل بھی نہیں (کل تین رسورس پرسن تھے دو بمبئی کے رٹائرڈ لیکچرر اور تیسرے مقامی اسکول کے فارسی کے سبکدوش استاد)۔''

وائس پرنسپل نے کہا۔''مائیک وغیرہ دیکھ لیجئے۔دو پیون لے لیجئے۔ایک میرا پیون اور دوسرا ماہ محمد رجسٹرار سے پوچھ لیجئے۔کل مکمل تیاری کر کے وقت پر آیئے اور پرنسپل کو رپورٹ دیجئے۔''

بغیر پانی اور چائے کے میٹنگ ختم ہوگئی۔وائس پرنسپل کی ہر میٹنگ اسی طرح ہوتی تھی۔ان کا خیال تھا کہ میٹنگ کالج کا کام ہے اور کالج کے کام کے لئے چائے کیوں؟ ماما میاں، جاوید مولانا اور حارث اسٹاف روم میں پہنچے۔شمیم ماما میاں نے تینوں کو سیمینار کا دعوتی کارڈ دکھایا۔جاوید نے غور سے دیکھا۔کارڈ پر لکھا تھا شعبہ اردو کا تعاون اور یو جی سی کے زیر اہتمام جبکہ یو جی سی کا تعاون اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام ہونا چاہئے تھا۔کارڈ پر سیمینار کا عنوان بھی رہ گیا تھا جسے ماما میاں نے قلم سے لکھ دیا تھا۔مولانا نے ماما میاں سے کہا کہ اس پر سیمینار کا عنوان تو چھپا ہی نہیں۔وہ بولی ہاں چھپنے سے رہ گیا۔اسے دوبارہ چھاپنے

کو کہا ہے۔ چند روز پہلے ماما میاں نے کہا تھا کہ دس دس کارڈ آپ دونوں لیں گے اور دس دس شرکاء برائے سامعین لائیں گے اس لیے جاوید اور مولانا اس انتظار میں تھے کہ وہ (سیمینار کوآرڈینیٹر) کچھ کارڈ دیں گی تاکہ اپنے دوستوں کو دعوت دے سکیں مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ماما میاں نے ایک کارڈ دونوں کو دکھایا اور پھر اسے اپنے لیڈیز بیگ میں رکھ لیا جہاں سے اسے نکالا تھا اور کہا کہ سیمینار فائل کل کانفرنس ہال میں دیکھ لیجئے گا۔ سیمینار پرسوں تھا۔

دوسرے دن کانفرنس ہال میں تمام اسٹاف شعبہ اردو سیمینار فائل کو دیکھ رہے تھے۔ فائل میں یو جی سی کی جگہ کالج اور کالج کے مقام پر یو جی سی پرنٹ تھا۔ جاوید نے مولانا کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ماما میاں کو یہ غلطی بتادی۔ فاش غلطی کو دیکھ کر وہ چونک پڑیں۔ جاوید نے کہا یہ معمولی سی غلطی ہے۔ اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ مگر اسے اطمینان نہیں ہوا۔ اسی وقت پروفیسر حارث الدین (ایم اے اردو contract hour basis (CHB) سے کہا تم میرے ساتھ میرے گھر چلنا۔ غالباً تمام فائلیں پرنٹ ہوگئی تھیں۔ دوبارہ نیا آڈر نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس لیے تصیح کے لیے وہ معارف کو اپنے گھر لے گئیں۔ اگلے روز سیمینار تھا۔ دوران سیمینار فائل کو دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ لفظوں کی تصیح بلیڈ سے کھرچ کھرچ کر کی گئی تھی۔

پرنسپل کوٹ پر ٹائی باندھے اپنے چیمبر سے باہر اپنی آنکھوں کو مٹکا رہے تھے۔ شعبہ اردو کے پروفیسران کے سامنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے سیمینار کی تیاری میں آجارہے تھے۔ دن کے گیارہ بجنے کو تھے۔ سیمینار ہال ابتک خالی تھا۔ انھوں نے جاوید سے کہا سیمینار شروع کرو audience لاؤ۔ ماما میاں سے کبھی آڈینس لانے کو نہیں کہتے تھے۔ پرنسپل چیمبر سے لگ کر ہی وہ سیڑھی تھی جو فرسٹ فلور سکنڈ فلو اور تھرڈ فلور کو جاتی تھی۔ گیارہ بج رہے تھے اس لیے زیادہ تر کلاسوں کے لیکچرس ختم ہورہے تھے اور طلباء جوق در جوق سیڑھیوں سے اتر کر گراونڈ کی طرف جارہے تھے۔ کوئی سیمینار ہال کی طرف نہیں جارہا تھا۔ جاوید سیڑھی کے سامنے کھڑا ہوگیا اور ہر آنے والے اسٹاف، تدریسی

عملہ، طلباء و طالبات سب سے خوشامد کرنے لگا۔ دیکھئے صاحب سیمینار شروع ہونے والا ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ لیجئے۔ اسٹوڈنس سے کہتا دیکھو تم لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جانا۔ پروفیسروں سے کہتا بس افتتاح ہو جائے آپ چلے جایئے گا۔ پرنسپل جاوید کی جمورا گیری دیکھ رہا تھا۔ ان کو بلا کر کہا کھانا تو بچ جائے گا اس لیے انھیں یہ بھی کہو کہ لنچ کا انتظام ہے۔ جاوید نے کہنا شروع کیا دیکھئے کھانے کا بھی انتظام ہے آپ کو تھوڑی دیر بیٹھنا ہے اور پھر پیٹ بھر کھانا ہے۔ مشکل سے ایک دو لالچ میں تیار ہوئے بقیہ چلتے بنے۔ ظاہر ہے انھیں زبردستی ہاتھ پکڑ کر بٹھا تو نہیں سکتے تھے۔ ایک دو نے تو اس طرح منہ بنایا جیسے جاوید بھکاری ہے اور بھیک کے لئے منت سماجت کر رہا ہے۔

سیڑھی سے طلباء اترتے اور گراونڈ میں پھیل جاتے۔ اپنے اپنے دوستوں سے بات کرنے لگتے۔ جاوید نے دیکھا کہ سیڑھی کے پاس خوشامد سے کوئی نہیں آ رہا ہے تو وہ گراونڈ میں گیا۔ وہاں کئی طالب علموں کے ہاتھ پکڑے اور عاجزی سے کہا بھئی تھوڑی دیر کے لئے چلو۔ ایک نے کہا سر تم جاؤ میں آجاؤنگا۔ دوسرے نے کہا میں اپنے دوستوں کو لے کر آتا ہوں۔ لیکن یہ تو ٹالنے کا طریقہ تھا۔ جاوید پر اس وقت جو گذر رہی تھی وہ سیتا کے دکھ سے کم نہ تھا جب اس نے زمین سے کہا تھا کہ تو پھٹ جا تا کہ میں تم میں سما جاؤں۔ جاوید نے کامرس کے طلباء سے خوشامد کی۔ ان میں سے چند واقعی تیار ہو گئے۔ کیونکہ جاوید انھیں اردو پڑھاتا تھا۔ بقیہ اس کی گذارش اور چہرہ دیکھ کر کھسک گئے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ خود اردو کے طلباء غیر حاضر تھے۔ کچھ طالبہ تو ایسی تھیں جن کے لیے سیمینار بے پردگی کا مظاہرہ تھا۔

گراونڈ کی اس گہما گہمی میں جاوید کو ایک پروفیسر اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ داڑھی ٹوپی اور تبلیغی جماعت کے پکے معتقد۔ جاوید نے سوچا کہ چلو ایک شخص تو ایسا ہے جو خود سے میرے سیمینار میں شرکت کے لئے آ رہا ہے۔ کون کہتا ہے کہ لوگوں کو اردو سے دلچسپی نہیں ہے۔ پروفیسر عابد بشیر مسکراتے ہوئے جاوید کے قریب آئے بڑی محبت سے سلام کیا مصافحہ بھی کیا خیریت پوچھی اور اس سے پہلے کہ جاوید کچھ کہتا

وہ گویا ہوئے یہ ہیں جناب مولانا شجاع الدین دلی سے اور یہ ہیں جناب راشد بن حارث افریقہ سے ہماری جماعت کے پرانے سرگرم رکن۔ خدا کی راہ میں دین کی خدمت کے لئے افریقہ سے ہندوستان آئے ہیں۔ حیرت ہوئی افریقہ والے اردو بھی جانتے تھے۔ وہ شروع ہوگئے۔ دیکھئے پروفیسر صاحب دنیا کا کام تو چلتا ہی رہتا ہے لیکن اس میں آخرت کی نیکی نہیں ہے۔ اصل کام تو اس زندگی کا ہے۔ آپ وہاں کے لے بھی کچھ کیجئے۔ ان کی تقریر شروع ہوگئی۔ جاوید کا ذہن کھول گیا۔ یہاں سیمینار کا کوئی آڈینس نہیں مل رہا ہے۔ پرنسپل اس پر چلائے گا۔ اس افریقن کی تقریر میں طلباء بھی نکل جائیں گے۔ یار یہ آفت کہاں سے سر چڑھ آئی۔ انھیں بھگا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی اثناء میں بمبئی کے ایک رسورس پرسن کانفرنس ہال کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے جدھر سے کوریڈور پر shutter گرا ہوا تھا۔ جاوید کو افریقن سے نجات کا ٹھوس بہانہ مل گیا۔ اس نے پروفیسر عابد بشیر سے کہا کہ اس وقت میں آپ حضرات کی پوری تقریر سننے کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل ہمارے سیمینار کے ایک رسورس پرسن بمبئی سے وہ سامنے آرہے ہیں لیکن ادھر شٹر گرا ہوا ہے مجھے ان کو لینے جانا پڑے گا اور اسکے قدم اٹھ گئے۔ پروفیسر عابد بشیر نے کہا ہاں ہاں ٹھیک ہے لیکن کل اگر آپ کے پاس وقت ہو تو شہر کی جھاڑو والی مسجد میں چار بجے شام میں ضرور تشریف لائیے اور اپنے ساتھ دو چار دوستوں کو بھی لائیے گا۔ جاوید نے سوچا کہ اس وقت تو خود مجھے دو چار سامعین کی ضرورت ہے انھیں کل کی پڑی ہے۔ اس نے کہا کل میں انشاء اللہ ضرور آؤنگا لیکن اس وقت مجھے سامعین کی کمی پڑ رہی ہے براہ کرم آپ حضرات تھوڑی دیر کے لیے سیمینار کے افتتاح ہال میں تشریف لے چلئے۔ تھوڑی دیر بعد چلے جایئے گا۔ ساتھ تو نہیں چلے وہیں پر کھڑے کھڑے اتنا کہا کہ آپ چلئے میں آتا ہوں۔ جاوید رسورس پرسن کو لے کر پرنسپل چیمبر میں گیا۔ سیمنار کے دوران کئی بار جاوید کی آنکھوں نے پروفیسر عابد بشیر اور افریقن کو ہال میں ڈھونڈا مگر وہ نظر نہ آئے۔

رسورس پرسن مقالہ نگار ڈاکٹر اعظم شیخ بمبئی سے آئے تھے۔ بمبئی یونیورسٹی کے

ایک کالج سے سبکدوش تھے۔ وہاں ان کی کوئی خاص وقعت نہ تھی بلکہ بگڑوں میں شمار ہوتا تھا۔ جاوید نے انھیں پرنسپل چیمبر تک پہنچایا مگر انھوں نے کچھ بھی نہیں پوچھا کہ تم کون ہو۔ سیمینار کدھر ہے۔ چیمبر سے سیمینار ہال تک انھیں پروفیسر ماما میاں لے گئیں۔

جیسے تیسے اردو داں کم اور غیر اردو داں بیشتر افراد سے ہال بھر گیا۔ پرنسپل نے جاوید سے کہا دیکھو اب زیادہ دیر صحیح نہیں ہے۔ بارہ بجنے والے ہیں۔ سیمینار شروع کراؤ۔ ڈائس پر پانچ کرسیاں تھیں۔ تین مقالہ نگار کے لئے ایک پرنسپل اور ایک ماما میاں صدر شعبۂ کے لئے۔ ماما میاں بولیں میں اسٹیج پر پانچ اجنبی مردوں کے درمیان نہیں بیٹھونگی۔ اسلامی طور سے یہ غلط بھی ہے۔ میں ڈائس سے نیچے کانفرنس ہال کے دروازے کے قریب آڈینس کی نشست سے لگ کر ایک کرسی میز لے کر بیٹھ جاؤنگی اور وہیں سے سیمینار کی نظامت کے فرائض انجام دونگی۔ جبکہ کالج کے کئی پروفیسروں نے انھیں سلیولیس (sleeveless) ٹاپ جینز پہن کر یونیورسٹی کیمپس میں اجنبی سے سرگوشی کرتے ہوئے اور بائیک پر ہوا لگاتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ وہاں پر کوئی اسلامی قانون نہ تھا کوئی شریعت کا تقاضا نہ تھا۔ پروفیسروں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ایم اے کے زمانے میں باہر گاؤں کا کوئی کلاس فیلو تھا جس نے اس کے ساتھ بھونڈا کا سلوک کیا تھا تب ہی سے انھیں باہر کے باشندوں سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمیم ماما میاں نے سیمینار کا آغاز اس طرح کیا۔

"سیمینار کا آغاز ہو رہا ہے۔ پروفیسر حارث الدین تلاوت کریں گے۔ تلاوت ہوگئی۔ پھر بولیں سیمنار یو جی سی فائنانس سے ہو رہا ہے۔ اب مہمان خصوصان جناب آدم شیخ اسٹیج پر کرسی پر اپنی سیٹ لے لیں۔ پروفیسر ناصر (اسکول ٹیچر) بھی جا کر اپنی جگہ لے لیں۔ اس شہر کے مشہور فارسی کے استاد جناب امین ہستی کو بھی کہتی ہوں کہ اپنی سیٹ لے لیں۔ (پرنسپل تو پہلے ہی کرسی پر براجمان تھے۔) اب میں ایم اے کی طالبہ شبانہ، شاہین، عقیلہ سے کہتی ہوں کہ وہ آج کے مہمانوں کو جا کر پھول دے۔"

اس پروفیسرانہ نظامت کے بعد پرنسپل صاحب نے اردو زبان میٹھی زبان ہے کے متعلق لمبا چوڑا ہمبیا زبان میں بھاشن دیا اور بیچ بیچ میں اقبال کے شعر بھی پڑھتے رہے جسے سیمینار کے پہلے ان کے چیمبر میں جاوید نے انھیں رومن رسم الخط میں لکھ کر دیا تھا۔ مہمان خصوصی ناصر الزماں صاحب مائیک پر آئے۔انھوں نے موضوع سے ہٹ کر اپنی تقریر میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ڈیڑھ گھنٹے اقبال کی زندگی کے واقعات اور انھیں کے شعر پڑھ پڑھ کر بتاتے رہے۔موضوع تھا اقبال کی عصری معنویت اور انھوں نے سنایا واقعہ۔سامعین بور ہو گئے تھے۔انھیں چٹ لکھ کر دی گئی۔ مائیک سے ہٹے۔تب جا کر دو مقالہ نگاروں امین ہستی اور شیخ صاحب نے اپنے مقالے پیش کیے۔مقالہ نگاروں میں کسی کا خصوصی مضمون اقبال نہیں تھا۔آدم شیخ نے فکشن پر تحقیق کی تھی اور ناصر صاحب کا سبجکٹ سیاست تھا اور میاں امین ہستی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔اللہ اللہ خیر صلا۔ پہلا سیشن تین مقالوں پر مشتمل تھا۔ہال میں جو بیٹھے تھے سبھوں کو لنچ کا انتظار تھا۔ پہلا سیشن ختم ہوتے ہی سامعین لنچ گاہ کی طرف کھسکنے لگے۔

دو سیشن میں سیمینار ہوا۔سیمینار سے اچھا کھانا ہوا۔جاوید نے بڑی محنت سے سامعین، تدریسی ، غیر تدریسی اور مقالہ نگاروں کو کھانا کھلایا۔تولیہ صابن کا انتظام کیا۔لنچ کے دوران وائس پرنسپل نے کہا دیکھو کچھ سوال ایم اے کے طلباء کو یاد کرا دو تا کہ دوسرے سیشن میں وہ مقالہ نگاروں اور رسورس پرسن سے سوال کر سکیں۔ پانچ چھ سوالات جاوید نے انھیں یاد کرا دیے۔وہی سوالات طلباء نے مقالہ نگارون سے پوچھے۔امین ہستی بار بار مائیک پر جواب دینے جاتے تھے۔ایک دوبار ناصر صاحب بھی آئے۔سیمینار بور پر بور ہو رہا تھا۔جاوید ہال کے باہر کے انتظامات کو دیکھ رہا تھا۔کبھی کبھی ہال کی پچھلی صف میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔وہاں وائس پرنسپل بیٹھے تھے۔انھوں نے جاوید سے کہا تم بھی کچھ کہو۔اس نے کہا سر میں ادھر ادھر کے انتظامات دیکھ رہا ہوں آپ کہہ رہے ہیں تو ایک سوال پوچھ لونگا۔وہ بولے نہیں سوال نہیں بلکہ کچھ خیالات پورے سیمینار پر کہو تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ

کون آدمی ہے اور کہاں کا ہے اور کالج کا ہے یا باہر کا ہے بلکہ لوگ ہماری باتیں سن کر آپس میں ایکدوسرے سے پوچھنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ کون ہے۔ طلباء نے وہ سارے سوالات پوچھے جو جاوید نے بتائے تھے۔ میاں امین ہستی جو لفظ کا زیر زبر بتا رہے تھے مسلمانوں کے شاندار ماضی پر بانگ دینے لگے۔ مہمان خصاصان (بقول شمیم ماما میاں) کے اٹھنے کے پہلے جاوید نے اپنے خیالات سامعین کے سامنے رکھے۔ لوگوں نے بعد میں کہا کہ جاوید کے خیالات پر سیمینار میں ذرا ہلچل پیدا ہوئی اور لگا کہ سیمنار ہو رہا ہے ورنہ پورا منظر مجلس مرثیہ کا قائم تھا۔ جاوید نے یہ کہا کہ سیمنار کا جو موضوع ہے اس پر اظہارِ خیال کیا جائے۔ فلسفۂ اقبال اور دور حاضر۔ آج اقبال کا فلسفہ ہمیں کیا سبق دے سکتا ہے۔ موجودہ دور میں فلسفۂ اقبال اور ماضی کی عظیم شخصیات ہماری رہنمائی کس طرح کر سکتی ہیں۔ بہرحال آخر میں مہمان خصوصی آئے اور آخری کلمات کہہ کر سیمینار کو ختم کر دیا اور کوئی ادھر گیا کوئی ادھر گیا تمت بالخیر۔

اوروں نے کیا سوچا یہ تو نہیں معلوم مگر جاوید نے بار بار یہ غور کیا کہ اس سیمینار سے کون سے نئے گوشے تصور اقبال کے سامنے آئے۔ کون سے اقبال کے خیالات پیش کئے گئے جو نئے دور میں ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ مگر لاکھ کوششوں کے باوجود ایسا کوئی نکتہ، کوئی اشارہ، نہیں مل سکا جسے جان کر یہ کہا جا سکتا کہ یہ ایک کامیاب سیمینار تھا۔ اس میں مذاکرہ کی خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ اپنے اپنے ملاقاتیوں کو بلایا گیا تھا۔ اپنوں نے اپنوں سے ملاقات کی، کھانا کھایا اور رخصت ہو گئے۔ یو جی سی کے فنڈ کو استعمال کرنا تھا۔ کر دیا گیا۔ اسی طرح تو نڈوال صاحب بھی ایک فنڈ لائے تھے۔ اسے بھی کسی اور زمرے میں استعمال کر کے اردو کی خدمت کی گئی۔ یہ تو کالجوں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں اتنا غور و خوض کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے یہی سوچ کر اپنے آپ کو تشفی دے لی کہ ایسا تو ہر کالج میں ہوتا ہے۔ اصل مقصد فنڈ کو ہوشیاری سے صرف کرنا چاہئے۔ تحقیق و تفتیش کے لیے دوسرے ادارے ہیں۔ کسی کو اتنا ہی شوق ہے تو ادھر کا رخ کرے۔ یہاں کا سیمینار، یہاں کا پروگرام

تو یہاں کے ماحول اور یہاں کے معیار پر ہی منعقد ہوگا۔ جاوید کو ان اقوال پر یقین کر لینا پڑا۔ آئندہ اس نے ایسے جلسوں اور ان کے حاصل پر غور کرنا بند کر دیا۔

بحرالاسلام کالج کے سترہ سالوں میں کیسے کیسے دن گذرے اور نہ جانے کیسے کیسے ڈے بھی منائے گئے۔ انھیں میں ایک کا نام اُردو ڈے بھی تھا۔ ان دنوں کالج کے پرنسپل تونڈوال تھے۔ خدامعلوم ایسے سرنیم SURNAME کیوں رکھتے تھے۔ اشفاق اللہ اردو میڈیم ہائر سکنڈری اسکول کے پرنسپل کا سرنیم مکڈوم تھا۔ جاوید کو پہلی بار انگریزی نام معلوم ہوا۔ پھر پتہ چلا یہ دراصل مخدوم کی بدلی صورت ہے۔ تونڈوال اُردو سے نابلد تھے۔ قران نہیں پڑھ سکتے تھے۔ بڑی توند، سیاہ رنگ، سفید دانت، گنجا سر، بڑی بڑی گھورتی ہوئی آنکھیں۔ منہ کھول کر مسکراتے تو رام لیلا کے راون کا گمان ہوتا۔ سراپا میں بقیہ اجزاء عام لوگوں جیسے تھے۔ اس لیے ان کا ذکر فضول ہے۔

پڑوس کے ایماندار کالج میں اُردو ڈے منایا گیا۔ یہ خبر تونڈوال تک پہنچی۔ ان کا جذبۂ اردو بھی جوش میں آیا۔ جاوید اسٹاف روم میں بیٹھا تھا۔ پرنسپل کا پیغام آیا کہ آپ کو اور پروفیسر شمیم مامامیاں اور پروفیسر نعیم کو ضروری کام کے لئے اپنے چیمبر میں بلایا ہے۔ دس منٹ میں شعبہ اُردو کے تمام پروفیسر پرنسپل کے چیمبر میں حاضر تھے۔ پرنسپل نے حسب دستور سیاہ ہونٹوں سے سفید دانت دکھاتے ہوئے فرمایا۔

"دیکھئے اُردو ایک سوئیٹ لینگویج ہے۔ ہم کو اردو والے سے بات کرنے میں بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لینگویج کو ہم لوگوں کو اور بھی ڈیولپ کرنا ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا ہے۔ ہمارے ہاں تو اس کا فل فلیج (FULL FLEDGE) ڈپارٹمنٹ بھی ہے اور اس میں کوالیفائیڈ اسٹاف بھی ہے۔ ہم اس کو اور ڈیولپ کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے دو نیا پروگرام اور گنائز کرنا ہوگا۔ ایک اردو ڈے پروگرام اور گنائز کرنے کا۔ ہم اس میں نان اردو کے گیسٹ بلائیں گے۔ اسے اردو سے انٹریسٹ ہے۔ وہ غزل لائک (LIKE) کرتے ہے۔ ہماری لائبریری میں ریئر بکس (RARE BOOKS) بھی ہے ہم اس کو ڈسپلے

(DISPLAY) کریں گے لائبریری ریڈنگ ہال میں۔اس میں برابر سے ٹیبل لگا کر بکس (BOOKS) کا اس پر ایکزبیشن (EXHIBITION) لگائیں گے۔گیسٹ کو بھی اچھا لگے گا۔آپ سب لائبریری ریڈنگ ہال میں ایسے بُکس کو لگاؤ۔

انھوں نے دوسرے پروگرام کا نام نہیں بتایا۔''ہیں'' کی جگہ ''ہے'' بول کر تقریر ختم کردی۔

''اس کام کے لئے جاوید صاحب ٹھیک رہیں گے۔''پروفیسر شمیم ماما میاں نے فوراً اپنی رائے دی۔

جاوید نے کہا۔''اتنی کتابوں کو ریکس (RACKS) سے ریڈنگ ہال تک لانا اکیلے کا کام نہیں ہے۔آپ کو بھی ساتھ دینا ہوگا۔''

''چلئے میں بھی مدد کرونگی۔''شمیم ماما میاں نے کہا۔

پرنسپل نے کہا۔''یہ اکزبیشن پرسوں کرنے کا ہے۔آپ لوگ ابھی سے کام میں لگ جاؤ۔کوئی ضرورت ہوتو بولو۔ادھر لائبریری میں پیون کلرک ہے اس سے بولو وہ ہیلپ کرے گا۔''

دونوں چیمبر سے باہر نکلے۔جاوید نے شمیم ماما میاں سے کہا چلئے لائبریری۔وہ بولی آپ چلئے میں دس منٹ میں آتی ہوں۔جاوید لائبریری میں گیا۔وہاں کے چپراسی سے کہا کہ اردو ڈے منانے کے لئے ریکس سے کتابیں ریڈنگ ہال میں لانی ہیں تم لوگوں کو اس کام میں مدد کرنا ہے ایسا پرنسپل صاحب نے کہا ہے۔

چپراسی نے منہ پچکائے ہوئے جواب دیا۔''اس کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے اور سگریٹ پیتے پیتے یہی سوجھتا ہے اور لائبریری کا روزانہ کا کام کون کرے گا اس کا۔۔۔۔۔۔ہم لوگوں سے دوسرا کام نہیں ہونے کا۔جاؤ اس کو بول دو۔

جاوید نے کلرکوں سے مدد کے لئے کہا۔انھوں نے جواب دیا ارے سر یہ دیکھو اسٹوڈنٹس نے کتابیں واپس نہیں کیا ہے اس کی لسٹ بنانے کا ہے۔نئی بکس اور نئی میگزین

سب ادھر رکھی ہے اس کو رجسٹر میں انٹری کرنے کا ہے۔ اس کو چھوڑ کر دوسرا کام کیسے ہوگا۔ یہ کام بھی ارجنٹ ہے۔ پرنسپل نے کل ہی بولا کہ آج یہ کام پورا کرنے کا ہے اور پھر خود ہی دوسرا کام بھیجتا۔ اس کو کچھ یاد نہیں رہتا تبھی تو کتنی بار بیوی کو مارکیٹ میں چھوڑ کرا کیلے اسکوٹر پر گھر چلا جاتا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ مارکیٹنگ کے بعد بیوی سے کہا اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ اس کے بیٹھنے کے پہلے یہ گاڑی اسٹارٹ کر دیتے اور پانچ کیلومیٹر بعد جب اپنے گھر کے دروازے پر اسکوٹر روکتے تو دیکھتے کہ بیوی نہیں ہے۔ فوراً مارکیٹ لوٹتے جبتک ان کی بیوی آٹو رکشا سے گھر پہنچ جاتیں اور یہ اکیلے مارکیٹ سے گھر آتے۔

جاوید نے دیکھا کہ چپراسی تا کلرک کوئی بھی تعاون کو تیار نہیں ہے۔ وہ اس طرح ایک ایک کو پوچھتا رہا تو دن نکل جائے گا اور نتیجہ صفر ہوگا۔ اس لیے وہ خود چھ بکس ریکس (RACKS) کی کتابوں کی سورٹنگ کرنے لگا۔ ہر ریک بارہ فٹ کا تھا اور ان میں تقریباً پانچ ہزار کتابیں تھیں دھول سے اٹی اور بے ترتیب۔ جاوید ریک سے کتاب نکالتا اور خود ہی دس دس کو اٹھا کر ریڈنگ ہال کی میز پر رکھ آتا جو سو میٹر کی دوری پر تھا۔ بک اسٹیک، لائبریری اسٹاف کی نشست اور ریڈنگ ہال دکھن سے اتر ایک ہی قطار میں فرسٹ فلور پر تھے۔ پچاس میٹر پر یعنی درمیان میں وہ چپراسی اور کلرک جاوید کو آتے جاتے دیکھتے رہے۔ تقریباً تین گھنٹے تک جاوید کتابیں ڈھونڈتا رہا۔ اسی اثناء میں ایک بار پروفیسر شمیم ماما میاں لائبریری میں آئیں۔ ناک پر رومال رکھے ریک کے کنارے کھڑی ہو کر پوچھا کتاب مل رہی ہے کیا؟ جاوید گھٹنا موڑ کر رکوع کی حالت میں نچلی شیلف سے کتابیں نکالنے میں منہمک تھا۔ اس نے پوری طرح سنا نہیں کہ کس نے کیا کہا۔ پھر آواز آئی نہیں سنتے تو نہیں سنو، کرو جیسے کرنا ہو میں تو چلی۔ تب جاوید کو معلوم ہوا کہ یہ شمیم ماما میاں تھیں۔ وہ جو پلٹ کر گئیں تو دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیں۔ چار ہزار کتابوں کو جاوید تنہا دو دنوں تک ڈھوتا رہا۔ اس کے ہاتھ کالے ہو گئے۔ ناک منہ چہرے پر دھول جم گئی۔ تین گھنٹے کے بعد اسٹاف روم میں ہاتھ چہرے کو پانی سے صاف کیا۔

چار ہزار کتابیں ریڈنگ ہال میں تیس میزوں پر پھیلا دی گئیں۔ اب کانفرنس ہال کو (جہاں کالج کے پروگرام ہوتے تھے) اردو ڈے پروگرام کے لئے تیار کرنا تھا۔ یہاں بھی میز کرسیوں کو جاوید نے سیدھا کیا۔ ہال کے بورڈ پر پروگرام کی تفصیل لکھی۔ طلباء سے مدد لی۔ مائیک لگوایا۔ جاوید اپنے کام میں مصروف تھا۔ اسی وقت ہال سے ملحق کاریڈور سے جونیئر کالج (2+) کی پروفیسر شاذیہ گذرتی نظر آئیں۔ اس نے جاوید سے کہا ارے آپ ادھر ہیں وہاں ریڈینگ ہال میں کتابوں کی نمائش کا افتتاح بھی ہوگیا۔ پرنسپل وائس پرنسپل اور گیسٹ سب کی فوٹو گرافی چل رہی ہے۔ آپ نے کتابیں لگائیں اور آپ ہی کونہیں معلوم۔

جاوید کو دھچکا لگا۔ تو یہ ہے محنت کا صلہ۔ گویا اس سے جو کام لینا تھا (قلی مزدور کا) لے لیا گیا اب جس کا جو کام ہے (فوٹو گرافی) وہ کر رہے ہیں۔ اس کے جی میں آیا کہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے فلیٹ چلا جائے پھر خیال آیا اسے بھی یہ لوگ لاپرواہی میں شامل کرلیں گے۔ چلو دور سے ہی دیکھ لیں گے برات کو۔ پتہ تو چلے کیا ہورہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بے دلی سے ریڈنگ ہال میں پہنچا۔ دیکھا کہ آٹھ دس افراد کا قافلہ جس میں پرنسپل، وائس پرنسپل، گیسٹ، پروفیسر شمیم ماما میاں اور کلرک ملتان پر مشتمل تھا کتاب کی میزوں کے کنارے کنارے چل رہا ہے۔ اور پرنسپل خدا معلوم کیا الم غلم گیسٹ کو بتاتے جارہے ہیں۔ دونوں اردو سے نابلد اور دونوں نمائش میں مصروف۔ پتہ نہیں نمائش دیکھی جارہی تھی یا نمائش کی جارہی تھی۔ گیسٹ اخلاقاً ہاں ہاں کرتے جارہے تھے۔ فوٹوگرافر جیسے ہی کیمرا مہمان پر فوکس کرتا پرنسپل، وائس پرنسپل اور کلرک سنبھل جاتے۔ جاوید ان تمام کے پیچھے چل رہا تھا۔ پرنسپل نے ایک بار جاوید کو دیکھا مگر نظر انداز کردیا۔ گیسٹ نے پوچھا کل کتنی کتابیں ہیں۔ اب اس کا جواب کون دیتا۔ تب یاد آیا۔ پرنسپل نے کہا جاوید کہاں ہے۔ کسی نے کہا ادھر پیچھے۔ وائس پرنسپل بیگار حسین نے پوچھا ''کتنی کتابیں ہیں؟'' جاوید نے کہا ''چار ہزار۔'' سننے کے بعد وہ سب پھر اگلی میز کی طرف بڑھ گئے۔ کتابیں دیکھ لی گئیں۔ نمائش ختم۔ اُردو کا قافلہ لائبریری سے گراونڈ فلور پر کانفرنس ہال میں پہنچا۔ پرنسپل

،وائس پرنسپل، گیسٹ سب کے سب منچ پر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جاوید سامعین کے ساتھ ایک کنارے بیٹھ گیا۔ پھر کالج آفس کا کلرک ملتان مائیک پر پہنچا اور نظامت کے فرائض انجام دینے لگا۔اس نے بتایا کہ آج اردو ڈے کے مہمان خصوصی شہر کی مشہور پلاسٹک کمپنی کے مالک ہیں۔ گرچہ وہ اردو نہیں جانتے مگر انھیں اس زبان سے بچپن سے ہی دلچسپی رہی ہے۔ان کے کئی دوست ایسے ہیں جو اردو جانتے ہیں۔ یہ اردو غزل شوق سے سنتے ہیں اور اردو پروگرام میں ہمیشہ شرکت کرتے ہیں۔

پرنسپل نے کہا شرما صاحب کو اردو سے بڑا افیکشن (AFFECTION) ہے۔ انھیں اردو سے سمپیتھی (SYMPATHY) ہے۔ان لوگوں کا ساتھ رہنے سے اردو کی ڈیولپمنٹ (DEVELOPMENT) ہوسکتی ہے۔ ہم نے ان کو اردو کے کئی پروگراموں میں دیکھا ہے۔ان کے بزرگ اردو جانتے تھے۔ شرما جی نے آج یہاں اردو ڈے میں آکر ہم پر مہربانی کی ہے۔ان کی وجہ سے اردو ڈے کا پروگرام کامیاب ہوا ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ آئندہ بھی اس پروگرام میں آتے رہیں۔اب ان سے گذارش ہے کہ کچھ باتیں وہ بھی کہیں۔

شرما جی مائیک پر آئے۔ کہا کہ آج مجھے یہاں آکر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ نمائش دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں بڑا اچھا کلیکشن ہے۔ حالانکہ میں اردو پڑھنا نہیں جانتا لیکن ایسا لگا کہ یہاں بہت سی RARE BOOKS ہیں۔آپ سب کو مبارکباد دیتا ہوں۔

کلرک ملتان نے جاوید کو اشارہ سے بلایا۔جیسے وہ پروفیسر ہے اور جاوید کلرک۔ وہ قریب گیا۔ملتان نے کہا دیکھئے بھئی یہ اچھا نہیں لگتا ہے کہ اردو کے پروگرام میں اردو والوں کے رہتے ہوئے میں پروگرام کنڈکٹ کروں۔ یہ حق آپ کا ہے آخر یہاں شعبۂ اردو بھی تو ہے۔لیکن پرنسپل صاحب نے ہم کو کہا تو میں انکار نہ کرسکا۔آپ شکریہ ادا کردیجیئے گا۔

جاوید اپنے آپ میں جل رہا تھا۔موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے شکریہ

ادا کر دیا اور اسطرح اردو ڈے کا شاندار جشن اپنے اختتام کو پہنچا۔اس اردو ڈے سے اردو کے ڈیولپمنٹ میں بڑی مدد ملی۔ وہ کالج جہاں جاوید نے برسوں خدمت کی تھی۔ خصوصاً اس پروگرام کے لئے ایک مزدور کی طرح چار ہزار کتابوں کو لائبریری کے ریکوں (RACKS) سے نکال کر نمائش ہال کی میزوں پر چار پانچ گھنٹوں تک سجایا اور جب پروگرام شروع ہوا تو اراکین نے اسے بھیگی مکھی کی طرح دودھ سے نکال کر پھینک دیا۔ کسی نے اس کی محنت کے صلہ میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔

کہسار باغ ہاؤسنگ سوسائٹی کے بارے میں جاوید نے کئی بار سنا تھا۔ کسی نے بتایا کہ اس سوسائٹی کو خاص مقصد کے تحت بمبئی کے ایک مسلم نواز شخص نے بنوایا ہے تا کہ شہر کے سارے مسلمان یہاں آکر ایک ساتھ رہیں۔ اُنہیں دنوں قریب کے ایک شہر میں ہندو مسلمان فساد ہوا تھا جس میں مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر جانی مالی نقصان ہوا تھا۔ ہمدردانِ قوم نے اندازہ لگایا کہ مسلمان شہر میں مختلف علاقوں میں بسے ہوئے تھے۔ ان کے چاروں طرف غیر مسلم آباد تھے۔ اس لئے فساد میں انہوں نے مسلمانوں کو بڑی آسانی سے لوٹا، مارا، بے عزت کیا اور قتل کیا۔ اگر مسلمان ایک جگہ کثیر تعداد میں رہیں گے تو دوسری قوم اس پر حملہ نہیں کر پائے گی۔ یہی سوچ کر شہر کے کسی دولتمند نے کہسار باغ رہائشی سوسائٹی بنائی۔ لیکن بہت ہی کم مسلمان اس سوسائٹی میں شفٹ کر سکے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں جن کا مکان تھا اسے چھوڑنے پر کوئی تیار نہ ہوا۔ نتیجتاً کہسار باغ میں زیادہ تر فلیٹ خالی تھے۔ کسی نے خریدا بھی تو خالی رکھا یا کرائے پر اُٹھا دیا۔ کہسار میں پکّی سڑک نہ تھی۔ روڈ سے سوسائٹی تک جانے میں ایک نالہ بھی پڑتا تھا جو کافی گہرا تھا۔ برسات میں اس میں پانی بھر جاتا تھا اور کہسار میں جانا بند ہو جاتا تھا۔ پانی جب کم ہوتا پھر جانا شروع۔ ایک کمیونٹی ہال تھا جسے مسجد بنا لیا تھا۔ یہیں نماز ہوتی تھی ایک حافظ صاحب جنہوں نے یہاں فلیٹ خرید کر رہنا شروع کر دیا تھا وہی اس مسجد کے پہلے امام تھے۔ وہ امامت کے ساتھ کمیشن پر زمین فروخت کرواتے تھے اور ضرورتمندوں کو کرایے کا فلیٹ بھی دلواتے تھے۔ سوسائٹی کی کمیٹی

نے سوسائٹی کے پورب ایک بڑے سے قطعہ زمین کو خرید کر قبرستان بنا لیا تھا۔ جاوید کو کسی نے بتایا کہ بھئی کہسار باغ میں کرائے کا فلیٹ لے لو۔ اور اس کے لئے وہاں کی مسجد کے مولانا سے ملو۔ وہ کمیشن پر تمہیں کہسار باغ میں فلیٹ دلوا دیں گے۔ جاوید نے کہا کہ یار کہسار باغ میں پانی کی قلت ہے۔ چلیے تو جائیں مگر پئیں گے کیا۔ بتایا گیا کہ کچھ دنوں میں کارپوریشن انتظام کرنے والی ہے۔ یہ وہی سوسائٹی تھی جہاں رہائشی پلاٹ بھی کم قیمت پر ملتا تھا۔ جاوید سے پلاٹ کے لئے بھی ایک صاحب نے کہا۔ جاوید نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے اس جنگل میں مَیں پلاٹ لونگا۔ کیا آپ کو میں ہی ایک بے وقوف ملا ہوں۔ اور آج وہی جاوید وہاں کرائے کا فلیٹ لینے کے لئے مسجد کے حافظ صاحب کے پاس جا رہا تھا۔ سچ ہے وقت اور حالات بڑے سے بڑے کو سیدھا کر دیتے ہیں۔ آج جاوید بھی سیدھا ہو کر کالونی کے کچے اور خراب راستوں سے گزرتے ہوئے مسجد میں پہنچا۔

اس نے سوچا کہ مسجد میں گفتگو ایماندارانہ اور روحانی ماحول میں ہوگی۔ آخر یہ خدا کا گھر ہے امام صاحب کو کچھ تو خیال ہوگا۔ ایک ضرورت مند پروفیسر پر وہ احسان کرنے جا رہے ہیں۔ پرفیسر تو سماج کا باعزت پروقار اور دانشور کہلاتا ہے۔ جاوید نے سیڑھیوں پر اپنے جوتے اتارے اور مسجد کے اندر داخل ہوا۔ صحن میں ایک مولانا کھڑے تھے۔ معلوم ہوا وہ نائب پیش امام ہیں۔ انہوں نے ہی بتایا امام صاحب مسجد کے اندر تلاوت کر رہے ہیں۔ دو منٹ بعد امام صاحب اندرون سے باہر صحن کی طرف آتے نظر آئے۔ کرتا پائجامہ، لمبی داڑھی، لمبا چہرہ، پچکے رخسار، آنکھوں میں سرمے کی لکیر، سر پر کپڑے کی سفید ٹوپی مسکراتے ہوئے جاوید کو دیکھ رہے تھے۔

''اسلام علیکم۔'' چار پانچ قدم چلنے کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے جاوید نے کہا۔

''وعلیکم السلام آپ کو پہچانا نہیں۔'' انہوں نے آنکتے ہوئے فرمایا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

جاوید نے سوچا یہی موقع ہے اپنا تعارف بھاری بھرکم انداز میں کرانا چاہئے۔
اس نے کہا ''امام صاحب میں پروفیسر جاوید ہوں۔ یہاں کے رحمت اللہ کالج میں ادب کا پروفیسر ہوں۔آپ کے بارے میں کئی بار سنا، ملنے کی آرزو تھی آج نیاز حاصل ہو گیا''۔

یہ خالص اردو ان کے سر سے گزر گئی۔انہوں نے شاید سمجھنے کی کوشش کی اور فرمایا بیٹھئے ہاں ہاں کہئے ۔کسی نے مجھے بتایا تھا یہی نام جو آپ نے کہا۔اچھا آپ ہی جاوید صاحب ہیں۔کوئی کام ہے کیا؟ جاوید نے کہا جی رہائش کا مسئلہ ہے۔آپ کے بارے میں سنا کہ اس سوسائٹی میں فلیٹ آپ کے توسط سے ملتا ہے۔کوئی مناسب فلیٹ میرے لئے بھی دیکھئے۔نوازش ہوگی آپ کا مختنانہ یا کمیشن جو بنتا ہے ہم وہ بھی پیش کریں گے۔

امام صاحب نے اپنی دراز داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ٹوپی اتاری سر پر ہاتھ پھیرا۔ ٹوپی کو ہونٹوں سے پھونک ماری پھر اسے سر پر رکھا۔کھنکارا اور ارشاد کیا۔

''دیکھئے یہ کہسار باغ سوسائٹی آج سے تیس سال پہلے قائم کی گئی تھی۔اس وقت یہاں اکا دکا لوگ رہتے تھے۔تب تو اتنی بلڈنگ بھی نہیں تعمیر ہوئی تھی۔سوسائٹی قائم ہونے کے ساتھ ہی میں یہاں آگیا تھا۔یہ جو آپ مسجد دیکھ رہے ہیں پہلے ایسی نہ تھی اس کی یہ صورت میں نے بنائی ہے۔میں نے لوگوں سے کہا کہ یہاں مسلمان آباد ہونے والے ہیں ایک مسجد ہونی چاہئے۔کمیونیٹی ہال کو مسجد بنانے میں مَیں نے انتھک کوشش کی تھی۔قانونی کاغذات بھی مکمل نہیں تھے۔اس کام میں بھی میں نے سوسائٹی کمیٹی کو پورا تعاون دیا۔بس اسٹینڈ سے آگے بہت سی فرضی سوسائیٹیاں ہیں جو کارپوریشن سے مستند نہیں ہیں۔الحمد اللہ کہسار باغ کارپوریشن سے سند یافتہ ہے۔لوگ یہاں آنے سے ہچکچاتے تھے لیکن جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو ایک ایک کر کے آنے لگے۔یہ اس شہر کی واحد مسلم سوسائٹی ہے جہاں سو فی صد مسلمان رہتے ہیں۔یہاں آپ کو اپنے لوگ اور اپنی تہذیب نظر آئے گی۔ کارپوریشن کا پانی بھی آتا ہے۔بورویل کا بھی انتظام ہے۔یہاں سے پانچ منٹ کے فاصلے پر بس اسٹینڈ ہے۔ہر پانچ منٹ پر شہر کو بس جاتی ہے اور آتی ہے۔ٹرانسپورٹ کی کوئی

دقت نہیں ہے۔ نہ ہنگامہ نہ شور مکمل خاموشی، پڑھنے لکھنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ دراصل اس سوسائٹی کی پوری زمین زراعت کی تھی۔ بمبئی کے ایک صاحب نے بڑی محنت سے کسانوں سے یہ زمین سوسائٹی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم دے کر حاصل کی۔ میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ خدا ایسا ہمدرد قوم دو چار اور اپنی قوم کو نواز دے۔ تو ایسا ہے جناب کہ ابھی تو اس سوسائٹی کے تین طرف دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے لیکن آہستہ آہستہ دیکھئے گا آبادی بڑھے گی کیونکہ شہر ہر طرف سے پھیلتا جا رہا ہے۔ ادھر بھی پھیلے گا۔ ہم آپ کے لئے ایک فلیٹ کا انتظام کر دیں گے۔ مَیں آج ہی اس کے مالک سے بات کرتا ہوں وہ شہر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کا چھپائی مشین کا کام چلتا ہے۔ اچھے لوگ ہیں۔ آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی اس فلیٹ میں سب سہولت ہے آپ کل چار بجے شام میں یہاں آیئے۔ انشااللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

جاوید نے درخواست کی کہ کرایہ کم کرانے کی کوشش کیجئے گا اور آپ کا کمیشن کتنا ہوگا۔ امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا آپ اس کے لئے فکر نہ کریں۔ میں بذاتِ خود کم کرانے کی کوشش کرونگا۔ جہاں تک ہمارے کمیشن کی بات ہے وہ کہاں بھاگا جا رہا ہے۔ آپ جتنا دیجئے گا مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

"پھر بھی کتنا ہوگا اندازاً جاوید نے پوچھا۔"

امام صاحب نے کہا۔ "پہلے فلیٹ اور اس کا کرایہ تو طے ہو جانے دیجئے کمیشن تو آپس کا معاملہ ہے آپ کل آیئے ساری بات ہو جائے گی۔"

جاوید امام صاحب کو خدا حافظ کہہ کر بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہو گیا وہ سوچنے لگا یہ امام صاحب تو بڑے گھاگ قسم کے لگتے ہیں۔ سوسائٹی کی پوری تاریخ، سہولیات اور مستقبل سب بتا دیا مگر فلیٹ کا کرایہ اور کمیشن پر خاموش ہو گئے۔ خدا معلوم کل کیا سنانے والے ہیں۔ مجھے تو کچھ خطرہ لگ رہا ہے۔ مَیں نے سوچا تھا کہ مسجد میں بات ہو رہی ہے صاف صاف ہو جائے گی لیکن انہوں نے تو پردہ ڈال دیا کل تک کے لئے۔ چلو اب جو ہوگا وہ کل دیکھ لیں

گے۔امام صاحب کو اور فلیٹ مالک دونوں کو۔شہر میں رہائش کی پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔ دیکھیں کہسار باغ میں کہاں کہاں کی سیر ہوتی ہے۔

اگلے روز شام چار بجے جاوید کہسار باغ پہنچ گیا۔سوسائٹی میں امام صاحب کی ٹیلرنگ شاپ تھی جہاں ان کے دونوں بیٹے بیٹھتے تھے۔جاوید اسی دکان میں بیٹھا امام صاحب کا انتظار کررہا تھا۔دس منٹ بعد وہ آئے۔دکان کے باہر سے ہی جاوید کو بلایا۔وہ ان کے پاس گیا۔امام صاحب بلڈنگ نمبر 58 کی طرف چلنے لگے۔فرسٹ فلور پر تین نمبر فلیٹ کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔چھ فٹ لمبے، چوڑے چکلے شرٹ پتلون پہنے ننگے پاؤں والے شخص نے دروازہ کھولا۔دروازہ کھلتے ہی ایک بڑا ہال نظر آیا جس کے درمیان میں ایک چٹائی بچھی تھی۔غالباً اس پر وہ صاحب لیٹے ہوئے تھے۔اس شخص نے امام صاحب سے کہا آیئے اندر آیئے میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا۔دونوں اندر داخل ہوئے۔اکلوتی چٹائی پر تینوں بیٹھ گئے۔

امام صاحب نے جاوید سے کہا یہ ہیں جناب معین ٹین والا۔یہ فلیٹ انہیں کا ہے۔اور یہ ہیں پروفیسر جاوید بحرالاسلام کالج میں پڑھاتے ہیں۔جاوید نے سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ہاتھ ملانے کے بعد ٹین والا نے کہا آیئے میں آپ کو فلیٹ دکھلاتا ہوں۔سب کھڑے ہو گئے۔ٹین والا نے کہا یہ تو بڑا ہال ہے۔آگے بڑھے۔ہال سے لگا کچن تھا اور اس سے ملحق بیڈروم۔آٹھ بائی چھ کا کچن اور اتنا ہی بڑا بیڈروم اور بارہ بائی دس کا ہال۔ہال سے لگ کر ایک اور بیڈروم تھا جس کے دروازہ میں تالا تھا۔وہ بڑا بیڈروم تھا جسے بند کر رکھا تھا۔اس میں ضروری سامان فلیٹ مالک کے تھے۔معین ٹین والا نے کچن میں نل کھولا تو پانی گرنے لگا۔بتایا ۲۴ گھنٹے پانی آتا ہے۔استعمال اور پینے کا دونوں،کوئی دقت نہیں ہے۔

کچن اور بیڈروم دیکھ کر تینوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ٹین والا نے کہا دیکھئے پروفیسر صاحب فلیٹ کا کرایہ دو ہزار ماہانہ ہوگا اور دس ہزار پیشگی ڈپازٹ دینا ہوگا۔یہ آپ آج دے دیجئے تو آج شفٹ کر جایئے یا کل تو کل۔جاوید نے کہا میں کل دونگا۔دوسرے دن جاوید

نے روپے ٹین والا کو شہر میں ہی جہاں وہ رہتے تھے دے دیئے اور شام میں نئے فلیٹ میں شفٹ کر گیا۔ اس کے ایک دن بعد وہ امام صاحب کا کمیشن دینے مسجد میں پہنچا۔

یہ کیا بات ہوئی ایک محلے میں مختلف پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہے۔ ایک دوسرے کو معلوم رہتا ہے کہ کل اس کے یہاں شادی ہے۔ فلاں کا بیٹا بیمار ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ فلاں کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کے پاس دو مکان ہے۔ فلاں کا ایک فلیٹ خالی ہے۔ پڑوسی جانتا ہے کہ آس پاس کون رہتے ہیں۔ اس کے کیا حالات ہیں کیا مشکلات ہیں۔ تبھی تو وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں کوئی ضرورت مند آئے اور پوچھے کہ جناب میں سرکاری ملازم ہوں یہاں پر کوئی فلیٹ کرایے پر مل سکتا ہے؟ اس شخص نے کہا ہاں آیئے فلاں صاحب کا ایک فلیٹ خالی ہے وہاں چائے خانہ میں بیٹھے ہیں۔ دونوں چائے خانہ میں گئے فلیٹ مالک سے ملاقات کروادی۔ بات طے ہو گئی اب اس دس منٹ کی ملاقات کے لئے وہ شخص ضرورت مند سے کہے گا کہ لاؤ میرا کمیشن کیونکہ میں نے تم کو فلیٹ دلوایا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ کتنی حقیر حرکت ہے اور کمیشن بھی وہ جو فلیٹ کا ایک مہینہ کا کرایہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں دو مہینہ کا مانگتے ہیں اور یہ ایجنٹ اتنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ضرورت مند کے ساتھ ساتھ فلیٹ مالک سے بھی کمیشن لیتے ہیں یہ کہہ کر کہ تمہارے لئے کرایہ دار ڈھونڈ کر لایا۔ لیکن یہ تو مولانا اور امام صاحب ہیں۔ اپنی قوم کے مذہبی رہنما ہیں۔ ایجنٹ کا دن رات کا یہی کام ہوتا ہے۔ امام صاحب کہاں اور ایجنٹ کہاں۔ کیا پتہ پیش امام صاحب کمیشن بھی نہ لیں۔ چائے وائے پی کر اپنا بڑا پن ثابت کر دیں۔ یہی سب سوچتے ہوئے جاوید مسجد میں داخل ہوا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی امام صاحب اندرون مسجد سے نکلے اور صحن میں جاوید کے ساتھ بیٹھ گئے۔ خیریت آمد وغیرہ کے بعد جاوید نے پوچھا ''امام صاحب میں گذشتہ روز فلیٹ میں آ گیا ہوں۔ آپ کا محنتانہ اور کمیشن دینا ہے بتایئے کتنا ہوگا۔''

امام صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ارے اس کا کیا ہے آپ تو یہیں آ گئے

ہیں کمیشن کہاں چلا جائے گا۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں تو ضرورتمندوں کی اسی بہانے خدمت کر دیتا ہوں۔''

جاوید نے کہا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے مگر یہ تو بتایئے کتنے روپے؟'' یہ کہتے ہوئے جاوید مسجد کے صحن، طاق میں رکھے ہوئے قران، اگر بتّی اور موم بتی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اسے عجیب سا لگ رہا تھا خانۂ خدا میں مول جول۔

امام صاحب نے کہا۔ ''ویسے تو بڑی بڑی رہائشی سوسائٹی میں جو دو مہینہ فلیٹ کا کرایہ ہوتا ہے وہ لیا جاتا ہے۔ آپ پروفیسر ہیں اور اب پڑوسی ہو گئے ہیں اس لئے ایک مہینہ کا دے دیجئے۔ محض آپ کا خیال کرتے ہوئے ایک مہینہ کم کر دیا ہے۔''

جاوید نے کہا۔ ''امام صاحب یہ تو بہت زیادہ۔ آپ جانتے ہیں میں اس شہر میں پردیسی ہوں۔ دور دراز سے یہاں روزی روٹی کیلئے آیا ہوں۔ ایک نوکری پر دارومدار ہے۔ آپ تو خدا رسیدہ ہیں۔ ہمارے مذہبی رہنما ہیں اور مذہب میں احسان کیلئے پیسہ غلط سمجھا جاتا ہے۔ آپ کو تو خوشی سے جو کچھ دیا جائے وہ لے لینا چاہئے۔''

امام صاحب نے روشنی ڈالی۔ ''اجی پروفیسر صاحب آپ کس دنیا میں رہتے ہیں بھئی ہمارے نماز روزہ کو اس کمیشن سے کیا مطلب؟ نماز، مذہبی رہنمائی اپنی جگہ اور یہ فلیٹ کا کاروبار اپنی جگہ دونوں دو کام ہیں۔ آپ دونوں کو جوڑیے مت۔ دیکھئے پروفیسر صاحب یہ فلیٹ کرایہ پر دلانا، فلیٹ فروخت کروانا اور کسی کو خریدوانا ہمارا پیشہ ہے بھئی۔ یہ ہمارا بزنس ہے ورنہ اس امامت میں کیا رکھا ہے اور کیا اللہ نے کہا ہے کہ امامت کے ساتھ تجارت نہ کرو؟ تو یہ ہماری تجارت ہے۔ میں فلیٹ کے ساتھ ساتھ زمین کے پلاٹ خرید فروخت کا پیشہ بھی کرتا ہوں۔ وہاں تو ہمارا کمیشن لاکھ میں دو پرسنٹ ہوتا ہے۔ لوگ خوشی سے دیتے ہیں۔ آپ نئے نئے ادھر کو آئے ہیں اس لئے نہیں معلوم ہے۔ ہمارا ریٹ تو دوسروں سے کم ہے ورنہ سوسائٹی کے باہر ایجنٹوں سے بات کر کے دیکھئے وہ تو تین تین مہینے کا لیتے ہیں۔ آپ نیک آدمی لگتے ہیں اس لیے ایک مہینہ بتایا۔''

جاوید نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں اس شہر میں پردیسی ہوں۔ دور دراز سے یہاں روزی روٹی کیلئے آیا ہوں ۔ایک نوکری پر سارا دارومدار ہے۔آپ خدارسیدہ انسان ہیں۔قوم کے رہنما ہیں۔ یہ چھوٹی سی رقم میں خوشی سے دے رہا ہوں۔آپ کمیشن نہ سمجھئے بلکہ یہ آپ کے بچوں کیلئے شیرینی ہے۔''

امام صاحب نے روپے ہاتھ میں لے کر شمار کئے جیب میں رکھے اور جاوید سے کہا کہ یہ تو کم ہے۔وہ چپ رہا۔ یہ ایک مہینہ کی نصف رقم تھی۔ وہ خوشامد کے الفاظ اور جملے جمع کر رہا تھا کہ مسجد میں دو افراد داخل ہوئے ۔امام صاحب کے پاس آئے سلام کیا اور انتظار کرنے لگے۔ان میں سے ایک چہرہ جاوید کی طرح ضرورت مندوں جیسا تھا۔شاید اسے بھی کرایے کا فلیٹ لینا تھا۔ نئے کسٹمر کو دیکھ کر امام صاحب نے جاوید سے کہا کہ ٹھیک ہے آپ جایئے۔فلیٹ کے متعلق کوئی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔وہ خدا حافظ کہہ کے اپنے فلیٹ واپس آ گیا۔

چندروز میں وہ پوری طرح فلیٹ میں اڈجسٹ ہو گیا۔ڈرائنگ روم میں اسٹیل کے بک شیلف میں کتابیں سجا دیں۔ وہ جب بھی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا سب سے پہلے بک شیلف پر ہی نظر پڑتی۔ہال بھی دیکھنے سے لگتا کہ پروفیسر کا مسکن ہے۔دوست مہمان کی پہلی نظر بھی بک شیلف پر پڑتی۔کچن، بیڈروم سب آراستہ ہو گئے۔ جاوید کو یہاں اچھا لگنے لگا۔

دن مہینے گذرتے گئے اور اس کے ساتھ فلیٹ کے نل کا پانی بھی کم ہونے لگا۔کم ہوتے ہوتے یہ حالت ہوئی کہ قطرہ قطرہ بھی غائب ہو گیا۔فلیٹ اونر یہاں سے پانچ کلومیٹر دوری پر شہر میں رہتا تھا۔جاوید نے وہاں جا کر پانی کی کہانی سنائی۔اس نے کہا کل ٹھیک کرادوں گا۔کل کچھ نہیں ہوا۔دوبارہ وہاں گیا۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ تیسری بار گیا۔کہا کل مستری لے کر آتا ہوں۔ بہانے بازی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔چور سپاہی کا کھیل شروع ہو گیا۔ وہ اکثر بنا غسل کئے کالج جانے لگا۔بارہ بجے تک گرمی شدید ہو جاتی۔اس وقت اس کا جسم

گرمی سے کھولنے لگتا اور اسی ابال میں وہ فلیٹ مالک کے گھر پہنچتا۔ یہ جتنے جوش، غصہ اور گرمی میں فلیٹ کے حالات بتاتا وہ اتنا ہی ٹھنڈے، اطمینان اور مسکراہٹ کے ساتھ مسئلہ ختم کرنے کا طریقہ بتاتا۔ گویا فلیٹ اور بار بار ملنا ایک معمول بن گیا۔ ایسا معمول جس کا کوئی نتیجہ نہیں۔

اس نے اس بلڈنگ کے دوسرے فلیٹ کے مکینوں سے پوچھا کہ ''وہ پانی کیلئے کیا کرتے ہیں؟''

گراؤنڈ فلور کے ریٹائرڈ کیپٹن نے بتایا۔ ''یہ تو پرانی بات ہے۔ آپ کو فلیٹ اونر نے بتایا نہیں؟''

''وہ کیا؟''

''ارے آپ کو معلوم نہیں۔ یہاں کارپوریشن کا کوئی پانی نہیں آتا۔ بورویل کا آتا ہے۔''

''لیکن فلیٹ اونر نے تو کہا تھا کہ کارپوریشن کا پانی آتا ہے اور نل کو کھول کر بھی بتایا تھا اور اتنے دنوں پانی آتا بھی رہا۔''

''فلیٹ اونر جب کرایہ دار کو فلیٹ دکھانے لاتے ہیں تو اس سے پہلے بلڈنگ کے اوپر واٹر ٹینک میں موٹر سے پانی چڑھا دیتے ہیں تاکہ فلیٹ کے اندر نل میں سے پانی گرتا ہوا دکھائی دے۔''

''لیکن اتنے دنوں پانی پھر کیسے آیا اور اب اچانک ختم کیسے ہوگیا۔''

''وہ اس لیے کہ آپ جب آئے تھے تو بارش کا زمانہ تھا اور بارش میں بورویل سے پانی نکلتا ہے جو موٹر کے ذریعے اوپر ٹنکی میں پہنچادیا جاتا ہے۔ اب گرمی کا موسم ہے۔ بورویل خشک ہوگیا ہے۔ اس میں پانی نہیں ہے تو ٹنکی میں پانی کیسے پہنچے گا اور پھر فلیٹ کے نل میں پانی کہاں سے آئے گا۔''

''تو اب گرمی میں بغیر پانی کے رہا جائے گا؟''

''نہیں، لیکن پانی بلڈنگ کے باہر سوسائٹی سے باہر جانے والی سڑک کے کنارے عوامی نل سے ڈھو کر لانا پڑے گا۔''

''کیا آپ لوگ وہاں سے لاتے ہیں؟''

''ہاں۔''

''لیکن میں نے کبھی آپ لوگوں کو وہاں سے پانی لاتے نہیں دیکھا؟''

''آپ کہاں سے دیکھیں گے۔ آپ سات بجے کالج جاتے ہیں۔ ہم لوگ صبح پانچ بجے جب اندھیرا رہتا ہے اپنے سارے پانی کے برتن کین بالٹی لے کر وہاں لائن لگاتے ہیں اور پورے گھر کے لوگ پانی بھر بھر کر لاتے ہیں۔''

''یا خدا ایسا ہے۔ کیا اس طرح پانی لانا ہوگا؟''

''ہاں آپ کو یہاں رہنا ہے تو نو مہینے یہی کرنا ہوگا۔ ہم لوگوں کو عادت پڑ گئی ہے۔ آپ کو بھی عادت ہو جائے گی۔ شروع شروع میں ذرا عجیب سا لگتا ہے پھر معمول بن جاتا ہے۔ کہسار میں رہنے کیلئے PUBLIC TAP سے پانی لانا ہوگا۔ کہسار اتنی آسانی سے کہاں ملتا ہے۔'' جی ہاں۔ اس کیلئے ریاضت اور قربانی تو دینی پڑے گی۔''

وہ لوگ مسکراتے ہوئے اپنے فلیٹوں کو چلے گئے۔ خدا معلوم اس شہر میں رہنے کیلئے جانے کون کون سی قربانی دینی پڑے گی۔ جاوید اپنے فلیٹ میں فرشی بستر پر لیٹ کر آئندہ کے پروگرام مرتب کرنے لگا۔

کالج سے واپسی پر امام صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا کہیئے فلیٹ میں کوئی شکایت تو نہیں ہے۔ دیکھا میں نے کتنا اچھا فلیٹ آپ کو دلایا۔ جاوید نے اپنے غصہ کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا ارے کیا خاک اچھا ہے۔ جو گذر رہی ہے میں ہی جانتا ہوں۔

''کیوں کیا ہوا۔ خیریت؟'' امام صاحب نے پوچھا۔

''آپ بھی خوب ہیں امام صاحب۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہاں پانی کی دقت سال میں نو مہینے رہے گی۔ اگر آپ نے اس وقت بتا دیا ہوتا تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔''

''ارے یہ شکایت تو یہاں چند بلڈنگ کے علاوہ تمام فلیٹس کی ہے۔ سڑک سے بھر لایا کیجئے۔''

''آپ تو ایسے بتا رہے ہیں جیسے ہر وقت سڑک کے نل پر پانی ملتا ہے۔''

''تو کیا آپ پانچ بجے صبح نہیں اٹھتے ہیں؟ اٹھا کیجئے یہ صحت کیلئے بہتر ہے۔ فجر کی نماز بھی ہو جائے گی۔''

جاوید کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ اس کے جی میں آیا کہ اس امام کی پوری خبر لے لیں۔ لیکن موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا اور امام فتح حاصل کر چکے تھے۔ کمیشن کے پانچ سو روپے انھوں نے یونہی قبول نہیں کئے تھے۔ جاوید کی مصیبتیں اور بھی بڑھنے والی تھیں۔ کیونکہ اس کے دو چھوٹے بھائی اور بیوی اگلے ہفتے پہنچ رہے تھے۔ ایک آدمی نے نہایا نہیں نہایا، کہیں کھالیا کہیں پی لیا اب یہ تین کیلئے نہانے، دھونے اور کھانے کا پانی کہاں سے آئے گا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آہستہ آہستہ دن گذرتے رہے۔ ہفتہ پورا ہوا اور وہ تینوں تشریف لائے۔ جس دن یہ تینوں آئے اسی دن جاوید نے ایک الارم گھڑی خریدی۔ ایک الارم پہلے سے تھی۔ اسے اپنے کمرے میں رکھا۔ دوسری بھائیوں کے کمرے میں رکھ دی تا کہ جاوید کی نیند اگر کبھی نہ ٹوٹے تو بھائی بیدار ہو جائیں۔ کیونکہ پانی وقت پر آتا تھا اور وقت پر بند ہو جاتا تھا۔ جاوید جیسے ضرورت مند اور بھی تھے۔ جو پہلے جاگتے پہلے لائن لگاتے اس لیے پہلے پانی بھی نل سے بھرتے۔ اگر دیر سے اٹھے تو لائن لمبی ہوتی ہے۔ نل تک پہنچتے پہنچتے پانی سپلائی کا ٹائم پورا ہو جاتا۔ نل بند ہو جاتا اور تشنگان کو خالی گھڑے واپس لانا پڑتا۔ یہ سوچ کر جاوید نے چار بجے صبح کا ہی الارم لگا دیا۔ چار بجے سب اٹھ گئے۔ تینوں بھائیوں نے کپڑے تبدیل کئے۔ دو دو بالٹی اپنے اپنے ہاتھوں میں لئے اور پبلک نل پر پہنچ گئے۔ آخری نمبر جاوید کا تھا۔ تینوں بھائی نل تا فلیٹ تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ جاوید دو بالٹی بھر کر سو میٹر کے فاصلے پر کھڑے بھائی کو پہنچاتا۔ وہ بھائی سو میٹر چل کر فلیٹ کے پاس کھڑے بھائی تک لے جاتا اور تیسرا وہاں سے لے کر فلیٹ کی دوسری منزل

پر چڑھتا۔ واپسی اسی طرح ہوتی۔ آدھے گھنٹے تک دوڑ دوڑ کر فلیٹ میں رکھے ڈرم کو بھرنے کی کوشش کرتے، کبھی ڈرم بھر جاتا اور کبھی خالی رہ جاتا۔ دونوں چھوٹے بھائی تھے۔ جو نیئر سنیئر کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ بے پرواہ بالٹی ڈھوتے تھے لیکن جاوید تو پروفیسر تھا جب تک وہ بالٹی بھائی تک لے جاتا بیقرار رہتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کتنی شرمندگی ہوگی۔ شرٹ، پتلون اور ننگے پاؤں کیونکہ نل تک پہنچنے کا راستہ اوبڑ کھابڑ قطعہ زمین سے ہو کر جاتا تھا۔ جوتا، چپل پہن کر اس سے گذرنا اور بھری بالٹی لے کر چلنا مشکل تھا۔ آدھے گھنٹے کی پانی بھرائی میں پاؤں دھول مٹی سے اٹ جاتا۔ پاؤں کو لائے ہوئے پانی سے نہیں دھوتے بلکہ تھوڑی دیر میں تینوں غسل ہی کر لیتے اور ایک ساتھ بدن کے ساتھ پاؤں بھی دھل جاتے۔

جاوید کی بیوی نے جب یہ دوڑ بھاگ دیکھی وہ حیران ہوگئی۔ اس نے کہا کہ کیا تماشا ہے۔ تم لوگ کرایہ بھی دیتے ہو اور باہر سڑک پر سے مزدور کی طرح پانی بھی ڈھو کر لاتے ہو۔ یہ کیا ڈرامہ ہے اور یہ کب تک چلے گا۔ فلیٹ اونر سے کہو وہ پانی کا انتظام کرے۔ اس کو نہیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کرنے کو کہہ رہی ہے وہ سب کر کے بیٹھ چکا ہے۔ پھر بھی اس کا دل رکھنے کیلئے اس نے کہا کہ ہاں کل اس کے یہاں جاؤں گا۔ کل اتفاق سے فلیٹ اونر اور اس کی بیوی فلیٹ کے بند کمرے سے سامان لینے آئے۔ جاوید کی بیوی نے دونوں کی خاطر تواضع کی۔ جب وہ جانے لگے تو اونر کی بیوی کو پانچ چھ آم بھی دیے جو اپنے وطن سے لائی تھی۔ جب دونوں چلے گئے تو جاوید نے بیوی سے کہا۔

''تمہیں اس قدر ان کی آؤ بھگت کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کیا تو آم کیوں باندھ دیا''؟

''کیوں کیا ہوا بھئی وہ ہمارے فلیٹ اونر ہیں اس لئے تحفتاً دے دیا۔''

''بے سود ہے، ان پہ کچھ اثر ہونے والا نہیں۔ تم اس شہر کے مزاج کو نہیں سمجھتی ہو۔ یہاں لوگ جو دکھتے ہیں وہ ہوتے نہیں۔ تم سے وعدہ کریں گے، تمہارے ساتھ رہیں

گے تمہارا کھائیں گے مگر تمہارا کام نہیں کریں گے میں انھیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ میرا تجربہ ہے۔''

''میں نے ان کو نل ٹھیک کرنے کو کہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کل پرسوں میں ٹھیک کرادیں گے۔''

''دیکھنا کون سے کل پرسوں میں ٹھیک کراتے ہیں۔''

اور وہی ہوا جو جاوید کا کہنا تھا۔ ہفتوں ہو گئے مہینوں ہو گئے حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ آخر کار بیوی بھی تنگ آ گئی اور اس نے کہنا شروع کیا کہ جگہ تبدیل کرو۔ مگر جگہ اتنی آسانی سے ملتی کہاں ہے۔ نو دس مہینے تینوں بھائی پانی بھرتے رہے۔ ایک دن فلیٹ اونر تشریف لائے۔ جاوید نے سمجھا کوئی خوشخبری ہوگی۔ اونر نے کہا پروفیسر صاحب ہمیں اس فلیٹ کی گھریلو ضرورت پڑ گئی ہے۔ آپ اسے ایک ہفتہ میں خالی کر دیں۔ جاوید نے کہا اتنی جلدی کیسے ہوگا۔ ہمیں ڈھونڈنے کا وقت تو دیجئے۔ اونر نے کہا اتنا وقت کافی ہے میں سات دن کے بعد آؤں گا۔ جاوید نے لاکھ کوشش کی کہیں کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ آٹھویں دن فلیٹ اونر اپنے باپ بیوی اور دو دوست کے ساتھ ایک ٹیم کی شکل میں حاضر ہو گئے۔ ہال میں بیٹھ کر شروع ہو گئے۔

''پروفیسر صاحب آپ سے کیا کہا گیا تھا اور آپ نے اس پر عمل نہیں کیا یہ تو وعدہ خلافی ہے۔''

''ہاں کہا تو تھا آپ نے لیکن میں نے گذارش کی تھی کہ اتنا وقت کم ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''دیکھیے پروفیسر صاحب آپ جس کالج میں پڑھاتے ہیں اسے میں جانتا ہوں۔ وہاں کے پرنسپل اور دوسرے پروفیسر ہمارے دوست ہیں۔ آپ بھی پڑھے لکھے ہیں۔ جب دو آدمی میں کچھ طے ہو جاتا ہے تو اس پر عمل بھی کرنا چاہیے۔'' اونر کے باپ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ان دنوں موسم کتنا خراب چل رہا ہے آندھی طوفان بارش۔ کہیں آنا جانا باعث

زحمت۔ پھر ہمارے ساتھ فیملی ہے۔ اچھا آپ بتایئے اگر آپ میری حالت میں ہوتے تو کیا کرتے؟'' جاوید نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''کیا کرتے فلیٹ خالی کر دیتے۔ تم خالی پیلی کیا کر رے لے ہے پروفیسر۔ میرا فلیٹ کرایہ دار میری مرضی سے رہے گا۔ جب تک چاہا رہنے دیا جب چاہا خالی کرا دیا۔ تم کو آج رات تک کا ٹائم دیے لا ہے۔ کل یہ فلیٹ خالی منگتا۔ کل ہم لوگ پھر ادھر آنے کو ہے اگر فلیٹ خالی نہیں ملا تو تمہارا سارا سامان ادھر کھڑکی سے باہر پھینکے گا اور یہ تمہارا کتابوں کا ڈبہ بھی۔'' اونر کے دوست نے درشتگی سے کہا۔

''ارے ایسا کاہے کو بولتے، یہ پروفیسر ہے بچے لوگ کو پڑھاتا ہے۔'' اونر کے دوسرے دوست نے کہا۔

''پڑھاتا ہوگا اپن کو کیا اپنے کو فلیٹ مانگتا۔'' اونر کے دوست نے رعب سے جواب دیا۔

''کیا پروفیسر صاحب تم نے بھی بے فائدہ اتنی بات سن لیا۔ اگر پہلے خالی کر دیا ہوتا تو لڑنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اونر کے باپ نے کہا۔

جاوید کو بات سمجھ میں آگئی کہ یہ سب آپس میں طے کر کے آئے ہیں کہ پروفیسر کو اتنا ذلیل کرو کہ وہ تنگ آ کر فلیٹ خالی کر دے اور اب ان لوگوں سے مزید گفتگو فضول ہے۔ یہ کسی قسم کی رعایت، مروت اور اخلاقیات کو تیار نہ ہوں گے۔ ان سے آگے بات کرنا اپنے آپ کو بے عزت کرنے کے مترادف ہے۔ ان کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ جاوید نے آخر کار کہہ دیا کہ ٹھیک ہے کل ہم فلیٹ خالی کر دیں گے۔ یہ سن کر سب فلیٹ سے باہر چلے گئے۔

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بیوی نے کہا کل نئی رہائش کا انتظام کیسے کرو گے۔ دیکھو بھئی میرا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں میں نہیں رہ پاؤں گی۔ میں آج ہی شام اپنے اسکول ناسک چلی جاؤں گی۔ کل وہ لوگ سامان پھینکیں گے یہ دیکھنے کیلئے میں نہیں

رکوں گی۔ جاوید نے بیوی اور دونوں چھوٹے بھائی کو آٹو رکشے میں بٹھا کر ناسک کیلئے رخصت کر دیا۔ شہر کے بس اسٹینڈ سے ہر آدھے گھنٹے پر ناسک کیلئے اسٹیٹ بس جاتی تھی۔ وہ لوگ چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد جاوید سیدھے شہر کے سوموار پیٹھ میں ایک لاج میں پہنچا۔ وہاں مہینہ سسٹم پر روم کرایہ پر دیا جاتا تھا۔ ایڈوانس کرایہ دیا۔ رجسٹر میں نام اندراج کرایا اور رات دس بجے تک سامان کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے پھر فلیٹ میں پہنچا۔ سارے سامان باندھ دیے۔ کہسار باغ میں پروفیسر جلیل کے فلیٹ کے سامنے ایک نامکمل فلیٹ تھا۔ اس میں کنسٹرکشن کا کام چل رہا تھا۔ ایک روم کسی طرح تیار ہو گیا تھا۔ جاوید نے ان سے گذارش کی اور اپنے فلیٹ اونر کی وارننگ سنائی اور یہ کہا کہ فی الوقت ہماری کتابیں جو دس بارہ پیکٹس میں بندھی ہیں انھیں اس نامکمل کمرے میں رکھنے کی اجازت دے دیں۔ ان کتابوں کو اس بارش میں کہیں اور لے جانا ممکن نہیں ہے۔ چند روز بعد ہم انھیں لے جائیں گے۔ سوسائٹی میں ایک پروویژن شاپ والے سے ہینڈ کارٹ حاصل کیا۔ اس پر تمام کتابوں کے پیکٹس رکھے۔ کچھ اور بھی چھوٹے سامان اس پر رکھ دیے۔ کارٹ کھینچ کر پروفیسر جلیل کی بلڈنگ تک لے گیا۔ ایک ایک پیکٹ کو تنہا اٹھا کر سیکنڈ فلور کے کمرے تک لے گیا۔ سیڑھی کی چوڑائی کم تھی اس لئے بھی کارٹون کو اٹھانے میں دقت ہوتی تھی۔ ایک ہاتھ بلڈنگ کی عمارت اور دوسرا ہاتھ سیڑھی کی دیوار میں رگڑ جاتا تھا۔ تیرہ کارٹون (پچاس کتابیں ایک کارٹون میں) کو سیکنڈ فلور تک لے جانے میں وہ بار بار ہانپ جاتا تھا تو تھوڑی دیر آرام کرتا پھر دوسرا کارٹون اٹھاتا۔ کارٹون کو سیکنڈ فلور تک سیڑھیوں سے اٹھا کر لے جانے میں اس کے بدن کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو گیا۔ کمر، گھٹنا، گردن، بازو، کندھا لگ رہا تھا سب اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ زیادہ پڑھنا اور زیادہ کتابیں خریدنے کی ایسی بھی سزا ہوتی ہے۔ ایک گھنٹہ تک وہ کارٹون ڈھوتا رہا۔ سیکنڈ فلور پر بازو کے فلیٹ میں پروفیسر جلیل رہتے تھے۔ جب سارے کارٹون ڈھو لئے تو پتہ نہیں پروفیسر صاحب کو کیسے معلوم

ہوا انھوں نے دروازہ کھولا اور کہا ارے آپ نے سب اکیلے رکھ دیا مجھے بتایا ہی نہیں۔ جاوید نے دل میں کہا یہی دن دیکھنے کو باقی رہ گئے تھے کہ بھوکے آدمی کو پوچھا جائے گا کیا تو بھوکا ہے۔اس نے کہا ہاں کارٹون رکھ دیا ہے۔ براہ کرام آپ ان کا خیال رکھئے گا۔میں چند دنوں بعد ہی اسے لے جاؤں گا۔وہاں سے سیدھے بس اسٹینڈ گیا آٹو رکشا لے کر متروکہ فلیٹ کی بلڈنگ میں پہنچا۔فلیٹ میں سے بستر اٹھایا۔دروازے میں تالا لگایا۔رکشے میں بیٹھا اور شہر کے لاج پہنچ گیا۔دوسرے دن بارہ بجے کہسار باغ کے فلیٹ میں وہ فلیٹ اونر کا انتظار کر رہا تھا۔وہ لوگ آئے۔انھوں نے فلیٹ کو سہی سلامت پایا۔جاوید بغیر خدا حافظ کیے رخصت ہو گیا۔بیوی بچے ناسک چلے گئے تھے۔وہ شہر کے لاج میں ماہانہ کرایے پر شفٹ ہو گیا۔

جاوید نے بحر الاسلام کالج میں اردو کے دو صدور شعبہ کو دیکھا۔ایک مرد دوسری عورت۔ایک شادی شدہ صاحب اولاد پروفیسر سید نعیم الدین قاضی۔دوسری غیر شادی شدہ مجرد شمیم ماما میاں۔گھٹی پیشانی، سر پر بالوں کی باونڈری، روشن چندیا، سفید رنگ، چوڑا چہرہ، چپٹی ناک، موٹے ہونٹ، بڑی آنکھیں، پھیلا بدن، متوسط قد، ہاف شرٹ، خاکی پتلون اور سیاہ پمپ شو کے مجموعے کا نام پروفیسر نعیم الدین تھا۔ان کی عمر پچاس سال تھی۔اسی شہر کے کاڈیا کالج سے ایم۔اے اردو کیا تھا۔ایم۔اے کے امتحان میں چیٹنگ کرتے ہوئے پکڑے گئے۔انوبجیلیٹر نے امتحان ہال میں طلباء کے سامنے سزا کے طور پر بڑی دیر تک کھڑا کر دیا تھا۔وہی سزا یافتہ طالب علم بحر الاسلام کالج میں پروفیسر و صدر شعبہ اردو تھے۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔تمام پروفیسر اپنی اپنی کلاس لے رہے تھے۔جاوید کی کلاس نہیں تھی۔اس لیے وہ اسٹاف روم میں تنہا بیٹھا تھا۔اچانک پروفیسر نعیم الدین قاضی بھیگے ہوئے کپڑا کے تھیلا کے ساتھ اندر آئے۔ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔کرسی پر بیٹھے۔تھیلا کو میز پر رکھا جو کھڑا تھا۔دراصل اس میں رکھی کھڑی بوتلوں نے تھیلے کو بیٹھنے نہ دیا۔تھیلا بھیگ کر سرخ ہو گیا تھا۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سرخ کیوں ہے۔صدر شعبہ

اور شراب نہیں نہیں کچھ اور ہوگا۔ وہ بڑے متفکر نظر آرہے تھے۔ چہرہ پسینہ سے تر تھا۔ رومال سے بار بار چہرے کو پونچھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ کبھی تھیلا کو دیکھتے اور کبھی اس کے اندر کی بوتلوں کو گنتے۔ ان سے چھ سات کرسی دور جاوید بیٹھا ہوا بڑے غور سے ان کے حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرر ہا تھا۔

جاوید نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے خیریت آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

''پریشانی کہتے ہیں اس سے بھی زیادہ۔'' انھوں نے کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''ارے صبح صبح دو بوتل کا نقصان ہو گیا۔''

''بوتل کا نقصان؟ سمجھا نہیں۔ آپ کو اس کی عادت بھی نہیں۔ دو بوتل کیا مطلب؟''

''آپ شراب سمجھ رہے ہیں۔ یہ بوتل اس کی نہیں ہے۔''

''تو کس کی ہے اور تھیلا بھی بھیگا ہوا ہے اور وہ بھی سرخ رنگ سے۔۔۔۔''

''ارے کیا بتائیں یہاں سے چار کیلومیٹر جنوب اور شمال میں یہ بوتل روح افزا کی پہنچانے گیا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں میں ہر جگہ سائیکل سے جاتا ہوں۔ آج صبح صبح سات بجے جا رہا تھا۔ دراصل اس وقت دھوپ بھی نہیں رہتی۔ دو جگہ مال دینا تھا ایک جگہ ہی دے پایا۔ ایک مقام پر آٹو رکشا اسپیڈ سے گذر رہا تھا۔ وہیں پر میری سائیکل کا پہیہ پھسل گیا اور میں سائیکل کے ساتھ روڈ پر گر گیا۔ تھیلے میں رکھی روح افزا کی دو بوتل ٹوٹ گئی۔ تھیلا بھی بھیگ گیا۔ یہ سرخ رنگ روح افزا کا ہے۔ یہ تین بوتل بچا کر لے آیا۔ اب دوسرے دن جاؤنگا۔''

''یہ آپ روح افزا پانچ پانچ کیلومیٹر سائیکل سے کیوں لے جاتے ہیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''دراصل میں نے روح افزا کی ایجنسی لے رکھی ہے۔ اس میں کسٹمر کو تین چار روپے کم لگتے ہیں اور ساتھ میں ہوم ڈیلیوری بھی دیتا ہوں۔ اپنا تو دل ہی کچھ ایسا ہے۔'' صدر شعبہ نے وضاحت کی۔

جاوید نے دل میں کہا یہ کیا تک ہے۔ بحرالاسلام کالج کے پروفیسر وصدر شعبہ ''روح افزا'' سائیکل پر تھیلے میں ڈالکر صبح سات بجے گھر گھر پہنچاتے ہیں۔ ایسا کام تو دودھ والے کیا کرتے ہیں۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ یا خدا، صدر شعبہ اور گھر گھر روح افزا کی ڈیلیوری بذریعہ سائیکل۔

پونا شہر کے بیچ سے موٹھا ندی گذرتی ہے۔ اسی ندی کے کنارے کارپوریشن کا دفتر ہے۔ اور ندی کے دوسری طرف کسی بزرگ کا مزار ہے۔ مزار کے آس پاس کئی قبریں ہیں جن پر گنبد نما عمارت کھڑی ہے۔ ان سے ملحق ایک مسجد ہے اور مسجد سے منسلک ایک قبرستان ہے۔ قبرستان کے خاتمے پر رہائشی مکان ہیں۔ جس میں مسجد، مزار اور قبرستان کے متولی اور مجاور رہتے ہیں۔ انھیں میں ایک مکان پروفیسر نعیم الدین قاضی کا بھی ہے۔ مزار کی دیکھ ریکھ کے لئے ایک ٹرسٹ ہے۔ مزار پر سال بھر عقیدت مند پھول اور پیسہ نذر میں چڑھاتے ہیں۔ یہ ساری آمدنی ٹرسٹ کی ہوتی ہے جس کا ذمہ دار سکریٹری ہوتا ہے۔ یہ سکریٹری کبھی پروفیسر نعیم الدین بنتے کبھی ان کے بھائی۔ دونوں بھائیوں میں مقدمہ چل رہا تھا کہ دونوں نے ٹرسٹ کی آمدنی میں غبن کیا ہے۔

ہر روز خصوصاً جمعہ کو پروفیسر نعیم الدین مزار کے پاس کرتا پاجامہ پہن کر خوشبو اور سرمہ لگا کر کھڑے رہتے۔ زائرین کو مزار سے باہر آتے وقت ان کی پیٹھ پر جھاڑو پھیرتے۔ وہیں پر ایک نذرانہ کی پیٹی رکھی ہے جس میں عقیدت مند کچھ ڈال دیا کرتے ہیں۔ اس مزار پر سالانہ عرس بھی منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع پر خاصی آمدنی ہوتی ہے جو ٹرسٹ میں جمع کر دی جاتی ہے۔

اس دن بھی جاوید اسٹاف روم میں بیٹھا تھا۔ گھنٹہ بجنے والا تھا۔ چپراسی کونے میں کوئی کام کر رہا تھا۔ پروفیسر نعیم الدین قاضی تھیلے کے ساتھ آئے۔ تھیلے کو میز پر رکھا اور اس میں سے اگربتی کا تین پیکٹ نکالا۔ چپراسی کو آواز دی ادھر آؤ۔ وہ قریب آیا۔ انھوں نے کہا دیکھو یہ اگربتی سونگھ کر دیکھو کیسی خوشبو ہے۔ اس نے کہا مست ہے۔ پروفیسر صاحب نے

کہا یہ اگربتی شہر میں منفرد ہے۔اس کے حسن و جمال کا جواب نہیں۔آس پاس کی فضا معطر ہو جاتی ہے۔ایک اگربتی ایک گھنٹہ تک چلتی ہے۔دکاندار سے میرے پرانے تعلقات ہیں اس لیے مجھے رعایتی قیمت پر مل جاتی ہے۔یہاں بھی رعایتی در سے دونگا۔اگر تین لوگے تو دو روپے کم پڑیں گے۔لو یہ تین پیکٹ اور اپنے تمام ساتھیوں سے کہنا کہ قاضی صاحب اگربتی لائے ہیں۔جن کو لینا ہو اسٹاف روم میں آ کر لے لیں۔چپراسی سے قیمت لے کر جیب میں رکھا۔جاوید کو تجارتی مسکراہٹ سے دیکھا اور کہا آپ کے لئے۔جاوید نے کہا شکریہ میرے پاس ہے۔ختم ہونے پر آپ سے لے لونگا۔جاوید نے جھوٹ بول کر رعایتی شاپنگ سے خود کو بچا لیا۔

ایکدن زولوجی لیب سے کئی چپراسی نئی تولیہ ہاتھوں میں لئے آتے دکھائی دیے۔کاریڈور میں جاوید کلاس روم سے باہر کلاس کے لئے طلباء کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے تولیہ والے ایک چپراسی سے پوچھا سب کے ہاتھوں میں نئی تولیہ کیا بات ہے۔کہاں بنٹ رہی ہے بھئی۔ہمیں بھی بتاؤ۔

ایک نے کہا۔"سر کہیں نہیں بنٹ رہی ہے۔آپ کے ہیڈ صاحب ایک سو تولیہ لائے ہیں اور زولوجی لیب میں فروخت کر رہے ہیں۔آپ بھی لے لیجئے۔کم ہی بچی ہے۔پروفیسر بھی پہنچ رہے ہیں۔جلدی جایئے ختم ہو جائیگی۔"وہ سب آپس میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

ایک چپراسی نے کہا۔"قاضی صاحب جیسا پروفیسر ہونے منگتا۔"

"کیوں، کاہے کو؟"

"دوسرے پروفیسر کو دیکھو خالی پڑھاتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔اپن کے قاضی صاحب کو دیکھو ہم لوگوں کا کتنا خیال رکھتا ہے۔کبھی اگربتی، کبھی تولیہ، کبھی روح افزا، کبھی بسکٹ۔انھیں جب موقع ملتا ہے کچھ نہ کچھ کالج میں ضرور لاتے ہیں۔پروفیسر ہو تو ایسا۔"

بحرالاسلام کالج سے ایک کیلومیٹر پر کینٹ (CANTONMENT) مارکیٹ تھا۔اسٹیڈیم نما بند عمارت میں اشیائے خوردنی کی تمام اقسام ملتی تھیں۔عمارت کے تین

طرف دکانیں اور ہوٹل تھے۔ چوتھی طرف روڈ تھی۔ ایک بڑے ہوٹل کے سامنے دو تین ہیر کٹنگ سیلون تھے۔ جاوید ہوٹل کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اس کی نظر حجام کی دکانوں پر پڑی۔ اس نے دیکھا اس کے صدر شعبہ پروفیسر نعیم الدین ایک حجام کی دکان میں تین چار لوگوں کے ساتھ بنچ پر بیٹھے ہیں۔ جاوید کی نظران پر پڑی تو وہ رک گیا اور سلام کیا۔ قریب گیا۔

پروفیسر صاحب نے کہا۔ ''میں یہاں بال بنواتا ہوں۔ شام میں یہیں ہماری بیٹھک ہوتی ہے۔ یہ سب ہمارے دوست ہیں اور اچھا بال بناتے ہیں۔ حجاموں کی طرف مخاطب ہوکر کہا دیکھو یہ ہمارے کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ یہ جب ادھر بال بنوانے آئیں تو اچھے سے بال بنانا اور پیسے مناسب لینا۔ جاوید سے کہا یہاں آیا کیجئے۔ یہاں آئیں گے تو جان پہچان بڑھے گی ورنہ آپ کو کون جانتا ہے؟''

جاوید نے کہا۔ ''ہاں ہاں آونگا۔'' اور خدا حافظ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ یہ منظر اسے جب بھی یاد آتا وہ شرمندہ ہوجاتا۔

پروفیسر نعیم الدین صاحب کی تجارت اگربتی پر ہی ختم نہیں تھی بلکہ ہر موقع پر نئی اشیاء لاتے تھے اور اسے فروخت کر کے خدمت خلق کا فرض ادا کرتے تھے۔ کبھی لنگی، کبھی کرتا، کبھی جوتا۔ اسے کالج اسٹاف روم، سائنس لیباریٹری، لائبریری، کالج آفس اور کالج کینٹین میں بیچتے تھے۔ پبلشر سے نصاب کی کتابیں منگوا کر طلباء اور غیر تدریسی اسٹاف کو فروخت کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ ان کا شوق ہے۔ لائبریری سے دس پندرہ روپے کے لئے بار بار تقاضا کرتے تھے۔

ان کا گھر قبرستان اور مزار سے ملحق تھا۔ مزار پر سال میں دوروزہ عرس ہوتا تھا۔ بڑی گہما گہمی رہتی تھی۔ عقیدتمند عرس کی ویڈیو فلمبندی کرتے تھے۔ ایک پرنٹ انھیں بھی مل جاتی تھی۔ اسے کالج میں پروفیسر اور غیر تدریسی عملہ کو دیکھنے کے لئے دیتے۔ ایک سے لیتے دوسرے کو دیتے اور دوسرے سے تیسرے کو۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ اسی طرح قوالی کے (ہندوپاک) کے آڈیو ویڈیو ڈھیر سارے کیسٹ ان کے پاس تھے۔ اس کا تبادلہ

بھی ارکان کالج میں کیا کرتے تھے۔قران کی تفسیر کے کیسٹ تھے۔اسے بھی تقسیم کرتے واپس لیتے اور دوسروں کو سننے کو دیتے۔عرس پر جو مذہبی نظمیں پڑھی جاتیں اسے کالج کے ادبی پروگرام میں حمد ونعت کے ساتھ طلباء سے پڑھنے کو کہتے۔خالص ادبی پروگرام سے وہ بھاگتے تھے۔مشرقی، آنچل ،خاتون مشرق، چہار رنگ رسالوں کا مطالعہ کرتے اور تدریسی وغیر تدریسی اسٹاف کو سرکولیٹ کرتے۔تقریری پروگرام کے طلباء کو تقریر لکھ کر دیتے۔جب ان کی تقریر یرٹ کر طالب علم پروگرام میں سناتا تو بڑے خوش ہوتے اور پروفیسروں سے اس کا ذکر کرتے۔

موضوع پر لیکچر کے بجائے نوٹ لکھاتے تھے جو کتابوں کے ہو بہو نقل ہوتے تھے اور اپنے کلیگ کو ایسا کرنے کی تاکید کرتے تھے۔فارسی کتاب کے متن کا ترجمہ ڈائری میں لکھ رکھا تھا۔طلباء کو کلاس میں اس کی نقل کرادیتے تھے۔ایک دفعہ اخبار پڑھنے کے دوران اس ڈائری کو لائبریری میں بھول گئے۔پورے کالج میں حواس باختہ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ہر شخص جان گیا کہ ان کی ایک اہم ڈائری گم ہوگئی ہے۔فارسی کے پروفیسر جابر لائبریری میں ان کے بازو میں اخبار پڑھ رہے تھے۔انھوں نے دیکھا کہ نعیم صاحب بھول گئے تو اسے اپنے پاس رکھ لیا اور کلاس لینے چلے گئے۔دو گھنٹے بعد اسٹاف روم میں جب انھیں ڈائری واپس کیا تو ان کی جان میں جان آئی جیسے کھویا ہوا لاکھوں روپیہ انھیں واپس مل گیا ہو۔پروفیسر جابر پر برس پڑے اور کہا میں دو گھنٹے سے پورے کالج میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔میں نے چپہ چپہ چھان مارا اور آپ اس رکھے رہے۔جابر نے کہا لائبریری سے میں لیکچر میں چلا گیا۔دو لیکچر کے بعد آرہا ہوں اور آپ کو دے رہا ہوں۔صدر شعبہ نے کہا آپ کو نہیں معلوم اس دو گھنٹے میں ہم پر کیا گذری۔جابر یہ سن کر حیران رہ گئے۔ڈائری میں دائیں صفحہ پر متن تھا اور بائیں پر معنی وتشریح۔بیس سال سے ڈائری دیکھ کر پڑھاتے آرہے تھے اس کے گم ہوجانے پر جل بن مچھلی کی طرح تڑپنے لگے۔

دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے جاوید کالج آفس میں داخل ہوا۔سیلری کلرک

واجد کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سر جھکائے کام کر رہا تھا۔ وہ مخاطب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس درمیان ایک طالب علم آیا اور بونا فائیڈ سرٹیفکیٹ لے کر چلا گیا پھر بھی کلرک نے جاوید سے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دس منٹ بعد جاوید نے پوچھا ''میرے مارچ کے انوسٹمنٹ کا کیا کر رہے ہیں۔ کیا اس کا حساب کتاب فروری میں ہی کریں گے۔ آپ نے نوٹس میں آخری تاریخ ۸/فروری بتایا ہے جبکہ مالی سال ۳۱/مارچ تک ہوتا ہے۔'' کلرک نے تم سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم صرف گورنمنٹ کا فائدہ چاہتے ہو اس سے کالج کا کیا فائدہ ہونے والا ہے۔''

جاوید نے کہا۔ ''بھئی میں نے تو بینک کا قرض لیا ہے۔ اس کا سود ادا کرتا ہوں تب جا کر مجھے تھوڑی سی انکم ٹیکس ریبیٹ ملتی ہے۔ بھلا کالج میں کیا انوسٹمنٹ کر سکتا ہوں؟''

کلرک نے کہا۔ ''تم جتنے مائیگریٹیڈ یہاں اس کالج میں آگئے ہو سب کی ایک ہی ذہنیت ہے۔ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے۔''

''کیا ذہنیت؟'' جاوید نے پوچھا۔

''تم مجھ سے دو نمبر کام کروانا چاہتے ہو۔ یہ سب نارتھ میں چلتا ہے۔ یہاں مہاراشٹر میں نہیں چلے گا۔ یہ صاف ستھرا اسٹیٹ ہے۔ ایسا تم کو کچھ کرنا ہے تو اپنے گھر (اسٹیٹ) جاؤ۔''

جاوید نے کہا۔ ''میں کسی دوسرے کالج کا اسٹاف نہیں ہوں اسی کالج کا ہوں۔ آپ کے نام کی نوٹس پرنسپل نے نکالی ہے۔ اس لیے میں پوچھنے آیا ہوں۔ آپ اس کے لئے نارتھ، دو نمبری اور مائیگریٹیڈ وغیرہ کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ ایسا کہنے کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس طرح آپ مجھے ذلیل کر رہے ہیں۔'' ذلیل پر جاوید کی آواز اونچی ہو گئی پھر بھی اس نے خود پر قابو رکھا۔ بہت غصہ آیا لیکن ضبط کیا۔

کلرک نے کہا۔ ''اس میں چڑنے کی کیا بات ہے۔ تم لوگ سمجھتے نہیں۔ یہ دیکھو پروفیسر وانخ اور دوسرے پروفیسروں کے کاغذات جن میں فروری تک کی ہی انوسمنٹ

دکھائی گئی ہے بلکہ اس نے تو جنوری ہی دکھایا ہے۔ اسے تو تین مہینے کا رٹرن فائل کرنا ہے۔ تم بھی ایک مہینہ کا فائل کردو۔ بعد میں مل جائے گا۔"

جاوید نے کہا۔"بس مجھے یہی پوچھنا تھا جو کہ معلوم نہیں تھا۔ اس کے لئے آپ نے مجھے وہ سب سنا دیا جس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

اس نے منہ پچکارتے ہوئے کہا۔"ہاں ہاں جاؤ۔"

جاوید چلا آیا۔ کالج میں کام کرتے ہوئے سالہا سال گذر گئے لیکن آج بھی اس کو یہی محسوس ہوتا کہ اس کالج میں چپراسی تا کلرک، پروفیسر تا پرنسپل سب اسے باہر کا سمجھتے ہیں یعنی یہ پروفیسر ہمارے علاقے کا نہیں ہے۔ لاکھ چھپانے پر بھی یہ تعصب، یہ نفرت اور علاقائیت موقع ملتے ہی سامنے آجاتی تھی۔ جاوید کے پاس مایوس ہونے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ وہی کلرک تھا جس نے تمام پروفیسروں کے دوسال کے LIC انوسٹمنٹ کے پیسے کو استعمال کرلیا تھا۔ تیسرے سال میں پکڑا گیا۔ LIC کے انسٹالمنٹ کا پیسہ لاکھوں میں ہوتا تھا۔ مسلسل تین سال کی رقم اس نے متعلقہ آفس میں نہیں جمع کیا۔ لیکن پروفیسروں کو رسید دیتا تھا۔ انگریز بیوی سے روزانہ جھگڑا ہوتا تھا۔ گھر کا بخار پروفیسر پر اتارتا تھا۔ کیوں نہیں آخر وہ پیون سے کلرک بنا تھا۔

INVESTMENT کے کاغذات جمع کرنے کی آج کالج میں آخری تاریخ تھی۔ جاوید بینک کے قرض کا ACCOUNT STATEMENT (فروری تک) لے کر کلرک کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کو دیکھے بغیر کلرک نے کہا "یہاں کچھ نہیں دینے کا۔ ادھر سے نکل لو۔ چلو یہاں بھیڑ مت لگاؤ۔"

"آپ اس کاغذ کا تو دیکھئے۔" جاوید نے کہا۔

"کچھ نہیں دیکھنے کا ادھر جاؤ۔ اس کو دو۔"

"کدھر کس کو دوں؟"

"اُدھر اُس طرف۔"

''کس کے پاس سراج الدین یا آفس سپرنٹنڈنٹ ماہ محمد کے پاس؟''

''اُدھر اُدھر۔''

جاوید انداز سراج الدین (کلرک) کے پاس گیا۔ اسے اسٹیمنٹ دکھایا۔ اس نے کہا اس کام کی نوٹس اسی کلرک کے نام سے پرنسپل نے لگوایا ہے۔ بھلا میں کیونکر یہ اسٹیمنٹ لے سکتا ہوں اسی کے پاس جاؤ۔ جاوید پھر اس کلرک کے پاس گیا۔ اس سے کہا سراج الدین نہیں لے رہے ہیں۔ وہ آپ کا نام بتا رہے ہیں۔ اس نے کہا دکھاؤ۔ اسٹیمنٹ کو اپنے ہاتھ میں لیا اس پر جاوید کا نام لکھا اور دراز میں رکھ لیا اور کہا چلو جاؤ اِدھر سے۔ وہ مارچ کے انوسٹمنٹ کے بارے میں کچھ پوچھنے والا تھا مگر اس کی بے رخی اور بے توجہی کو دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہاں سے سیدھے وائس پرنسپل بیگار حسین کے چیمبر میں پہنچا۔ انھیں پورا واقعہ سنایا۔

پروفیسر بیگار حسین نے جاوید سے روداد کلرک سن کر کہا درخواست دے دو اس کی میٹنگ میں خبر لے لیں گے۔ نہ جانے کہاں سے یہ جنگلی لوگ آ گئے ہیں۔ دے دو۔ درخواست دے دو۔ بیگار حسین تو جاوید سے بیزار رہتے تھے۔ خوشامد پسند تھے۔ جوان کے چیمبر میں پابندی سے نہ جائے ان سے خفا ہو جاتے تھے۔ جاوید میں خوشامد پسندی نہ تھی۔ بھلا ایسی حالت میں انھیں جاوید سے کیا ہمدردی ہوتی۔ انھوں نے دل رکھنے کو کہہ دیا کہ میٹنگ میں کلرک کی سوچیں گے۔ کلرک کی بدتمیزی، اجڈپن اور گنوارپن سے جاوید کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اگر اس کے پاس روزی روٹی کا کوئی متبادل ہوتا تو آج اس نے رزائن کر دیا ہوتا مگر ALTERNATE کچھ نہ تھا۔ گھر کی ذمہ داری نے اسے سب کچھ سہنے پر مجبور کر دیا۔

ایسے واقعات ہر سال ہوا کرتے تھے۔ گذشتہ سال کالج کے دفتر میں جاوید کسی کلرک سے بات کر رہا تھا۔ پیچھے سے صدر شعبہ شمیم ماما میاں (جب وہ صدر شعبہ تھیں) نے کچھ کہا جسے جاوید نے کچھ نہیں سمجھا۔ قیاس کرتے ہوئے اس نے ماما میاں سے کہا میں نذیر کلرک سے بات کر رہا ہوں ایک منٹ رکیے۔ لیکن محترمہ کچھ کہے اور بتائے بغیر وائس پرنسپل

کے چیمبر میں جا کر بیٹھ گئیں۔ایک منٹ کے پہلے جاوید وہاں پہنچا لیکن وہاں کا عالم تو کچھ اور ہی تھا اور امید کے بالکل برخلاف۔صدر شعبہ وائس پرنسپل سے کہہ رہی تھیں اس نے جاوید نے ابھی دفتر میں جب میں آرہی تھی کلرکوں کے سامنے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔ایسی ایسی ہیڈ شپ میری جوتیوں پر رہتی ہے۔مجھے اس کا شوق نہیں ہے۔اپنے ہاتھ کے کاغذات کو پرنسپل کی میز پر پھینکتی ہوئی باہر چلی گئیں۔وائس پرنسپل نے کئی بار کہار کئے رکئے سنئے مگر وہ چلی گئیں۔جاوید کو معلوم نہ ہوسکا کہ آخر وہ کس لیے آئی تھیں اور کاغذ کیوں پھینکا؟ بیل،بھینس،گائے راستے پر چلتے جاتے ہیں اور اچانک چمک کر اپنے اگلے دونوں پاؤں اوپر اٹھا کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر چلنے لگتے ہیں۔خدا معلوم جانور کو جن نظر آتا ہے یا شیطان۔بہر حال یہی ادا محترمہ صدر شعبہ میں پائی جاتی تھی۔اچانک وہ نارمل سے ابنارمل ہوجاتی تھیں۔شادی کی عمر نکل چکی تھی۔صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔بدن بھاری تھا۔چہرہ مردوں کی طرح چوڑا۔ہنسنے پر ٹوٹے ہوئے دانت نظر آتے تھے۔شاید انھیں یاد کر کے وہ بھڑک اٹھتی تھیں۔

شعبے میں اقبال پر سیمینار کی میٹنگ ہوئی۔شعبہ یعنی ایک چھوٹے سے کمرے میں تین میز پر تین شعبے۔خیر صدر شعبہ نے کہا اقبال پر سیمینار کر لیا جائے یہ یہ موضوعات ہوسکتے ہیں۔وہ موضوعات کی فہرست لائی تھیں کہ اس میں سے ایک عنوان طے کر لینا ہے۔شاید اقبال پر کسی تنقیدی کتاب کی ایک فہرست مضامین ہی اڑا لائی تھیں۔

جاوید نے کہا میڈم اقبال پر سینکڑوں سیمینار ہو چکے ہیں۔کوئی ایسا عنوان رکھئے جس کا تعلق دکن سے ہو۔کھڑی ہوگئیں جانے کے لئے اور جاتے ہوئے کہا اس موضوع پر ہم لوگ پھر بات چیت کریں گے۔چند دنوں بعد وائس پرنسپل سے جاوید نے کہا کہ سیمینار کے عنوان کے لئے ہم لوگ شعبہ میں بیٹھے تھے لیکن کوئی موضوع طے نہ ہوسکا۔وائس پرنسپل نے کہا آپ کی صدر شعبہ اقبال پر سیمینار کریں گی۔سیمینار کے کاغذات یو جی سی بھیج دیے گئے ہیں۔جاوید نے کہا یہ تو نہایت ہی سادہ عنوان ہے۔کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔وائس پرنسپل

نے کہا اگلے سال کچھ اور رکھ لیں گے۔ وائس پرنسپل بھی خوب تھے۔ مردوں کے سامنے مردوں جیسی اور محترمہ کے سامنے ان کے جیسی۔ اس کے کسی خیال کی تردید نہیں کرتے تھے۔ تھوڑی دیر ان کے چیمبر میں بیٹھ جاتی تھیں تو یہ پگھلنے لگتے۔ تین مرد کلیگس کے ساتھ دس پندرہ منٹ شعبے میں بیٹھتیں تو ان کے دھواں نکلنے لگتا۔ تین مردوں کو ایک ساتھ دیکھتیں تو انھیں گمان ہوتا کہ وہ ان کی شکایت کر رہے ہیں۔ تینوں کے مسکرانے، ہنسنے پر شک کیا جانے لگا۔ ایکدن شعبہ میں تینوں بیٹھے تھے۔ وہ آئیں اور شروع ہو گئیں۔

''آخر آپ لوگ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ میں کالج سے یونیورسٹی اور کالج مینجمنٹ تک دیکھونگی۔ میرے یہاں منسٹر آتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کا معاملہ (پتہ نہیں کون سا معاملہ) وائس چانسلر تک لے جاؤنگی۔'' پروفیسر جابر خاموش تھے۔

عربی کے پروفیسر واحد نے کہا۔'' آپ کو جو کرنا ہے کیجئے۔ مجھے تو نہیں کرنا۔ ہم تو جاوید صاحب کے ساتھ ٹی وی کا کوٹیشن لانے جا رہے ہیں۔ میرے پاس آپ کے ساتھ میٹنگ کا وقت نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر واحد چپ ہو گئے۔

صدر شعبہ نے پھر کہا۔'' میں آپ لوگوں کو دیکھ لونگی۔''

جاوید کو اس کا یہ رویہ برا لگا۔ اس نے کہا۔'' آخر آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں۔ کیا ہم لوگوں کی روزی روٹی کا معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ ہم لوگوں کی رازق نہیں ہیں۔ یہ تو خدائی دعویٰ ہے۔ اس طرح کھڑے کھڑے میٹنگ نہیں کی جاتی ہے۔ ہم لوگ پرنسپل کے ساتھ میٹنگ لیں گے۔''

پروفیسر واحد نے کہا۔'' بیگار صاحب کے پاس چلئے۔ آپ کے ساتھ اس طرح میٹنگ نہیں ہو سکتی۔'' بیگار صاحب کا تعلق نارتھ سے تھا اور نارتھ والوں سے صدر شعبہ کو چڑ تھی۔ کہنے لگیں'' بیگار صاحب کے پاس کیوں؟''

تینوں شعبے سے باہر تیزی سے نکل گئے۔ پرنسپل اپنے چیمبر کے باہر کھڑے تھے۔ جاوید نے ان سے کہا'' سر آپ سے دو منٹ کی ضروری بات کرنی ہے۔'' تینوں ان کے چیمبر

میں گئے۔ جاوید نے ساری روداد سنائی۔ عین اسی وقت ہیڈ بھی آ گئیں۔ وہ اپنے ساتھ پروفیسر واحد کے خلاف ایک درخواست لکھ کر لائی تھیں جس میں لکھا تھا کہ پروفیسر واحد نے سبکدوش لکچرر رابعہ کے بارے میں کہیں پر غلط بیانی کی ہے۔ اس درخواست میں دوسری شکایتیں بھی تھیں۔ درخواست دیتے ہوئے وہ پرنسپل کے سامنے رونے لگیں اور تینوں پروفیسروں کی طرف مخاطب ہو کر کہا ''میں آپ لوگوں کی بڑی بہن کے برابر ہوں۔ بہن سے اس طرح کا سلوک نہیں کرتے جیسا آپ لوگوں نے کیا۔''

پروفیسر واحد نے کہا۔ ''میں نے کچھ بھی ایسا نہیں کیا اگر مجھ سے کوئی ایسی بے ادبی ہوئی ہو تو میں معافی مانگتا ہوں۔ میں آپ کو اپنی بڑی بہن ہی سمجھتا ہوں۔''

پرنسپل نے محترمہ کی درخواست لینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا یہ درخواست وائس پرنسپل کو دے دیجئے۔ میں نہیں لے سکتا۔ انھوں نے درخواست اپنے بیگ میں رکھ لیا اور چیمبر سے باہر چلی گئیں۔ پرنسپل نے کہا میں ایک ضروری کام سے یونیورسٹی اور یو جی سی آفس جا رہا ہوں۔ ایکدن بعد آپ لوگوں کے ساتھ اس سلسلے میں میٹنگ لونگا۔

پھر ایک دن بعد میٹنگ ہوئی اور پرنسپل نے کہا کہ آپ سب لوگ مل جل کر کام کیجئے۔ میں آپس میں کسی قسم کا جھگڑا دیکھنا نہیں چاہتا۔ پروفیسر واحد نے کہا میں HOD کو اپنی بڑی بہن سمجھتا ہوں۔

گرمی کی چھٹی ہو گئی تھی۔ جاوید بینک میں تھا HOD بھی تھیں۔ اس نے جاوید سے کہا کہ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھے شکایت پروفیسر واحد سے ہے۔ اس کے رویے سے ہے۔ جاوید نے کہا میڈم ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کا انداز ذرا ہم لوگوں سے الگ ہے۔ یہ سن کر ہیڈ خوش ہوئیں جیسے جاوید واحد کے خلاف ہے اور اس کے خیال سے اتفاق رکھتا ہے۔ وہ بتانے لگیں یہ لڑکا (آٹھ سال کا) میری بہن کا ہے۔ بمبئی سے چھٹی منانے پونے آیا ہے۔ میں بھی کہیں جاؤنگی بمبئی وغیرہ یا لونی کی طرف۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ جاوید نے بتایا چند روز بعد اپنے وطن جاؤنگا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی

گئیں۔ خدا معلوم اس نے واقعی دل سے یہ گفتگو کی تھی یا کسی سازش کے تحت؟ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ ان سب میں سب سے سینیئر جاوید ہے اور اس کی وجہ سے پروفیسر واحد اور جابر (فارسی کا پروفیسر) اینٹھ رہے ہیں اس لیے جاوید کو اپنا ہم خیال بنالو یہ دونوں اپنے آپ کمزور پڑ جائیں گے۔

انھیں دنوں واحد نے شعبے میں ہیڈ کی لکھی ہوئی نوٹس کا زیروکس کرا کر رکھ لیا۔ نوٹس میں زبان و بیان اور املا کی کئی غلطیاں تھیں لیکن نوٹس تو اپنی جگہ محترمہ گفتگو بھی غلط اردو میں کرتی تھیں۔ شاید اس لیے بھی وہ ان تینوں سے کبھی ایک دو منٹ سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ زیادہ بات کرنے سے ان کی جہالت سامنے آجاتی۔ ایک بار شعبے کی میٹنگ میں محترمہ نے کہا شاید قاضی عبدالستار کی کتاب کا نام ''شبِ گزیدہ'' ہے۔ (شب کی ب میں زیر لگا کر) جاوید نے بتایا نہیں میڈم اس کا نام ''شب گزیدہ'' ہے۔ پھر پوچھا وہ تو شاید آپ کے استاد ہیں۔ جاوید نے کہا ہاں شاید ایسا ہی ہے۔ میں انھیں زیادہ نہیں جانتا۔ جاوید نے سوچا کہ آج اس کا نیا پینترہ ہے۔

جان بہادر نجات اللہ تقریری مقابلہ میں ایک سال بمبئی کے ایک روزنامہ کے فیچر ایڈیٹر بہ حیثیت مہمان خصوصی تشریف لائے تھے۔ ان کے تعارف کے لیے ہیڈ مائیک پر گئیں۔ مہمان خصوصی کو دیکھ دیکھ کر کہنا شروع کیا شاید آپ نے وہاں بھی کام کیا ہے۔ شاید آپ اس اخبار میں بھی تھے۔ مہمان خصوصی محترمہ کی ہر تفتیش پر اپنی گردن ہلاتا رہا۔ تعارف نہایت خراب تھا۔ بھنڈی ہوئی۔ لوگوں نے شکایت کی۔

پروفیسر جلیل احمد نے جاوید سے کہا کہ ''آخر آپ نے کیا سوچا ہے۔ کل آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا معلوم ہوا۔ کل نہ پوچھ سکا۔''

''ہاں آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔ جاوید نے واقعہ دہرا دیا۔''

پروفیسر جلیل نے کہا۔ ''ایک درخواست دے دیجیے۔ میری تنخواہ ایک بار اس نے غلط بنائی تھی تو میں نے درخواست دی تھی۔

جاوید نے کہا جس پرنسپل نے میری ذلت ورسوائی کو سن کر ایک لفظ افسوس کا نہیں کہا بھلا اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔ میں درخواست دوں۔ وہ بھی درخواست دے گا۔ میں گواہ لاؤں وہ بھی گواہ لائے گا اوار آخر کار وہ جیت جائیگا پھر آج سے زیادہ کل میرا مذاق اڑائیگا اور آپ لوگوں کو بھی لطف آئے گا۔ چھوڑیے اس تماشے کو۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ جلیل احمد نے کہا کم سے کم درخواست دینے سے ایک رکارڈ تو ہو جاتا۔ اس کو حالیہ مقام سے ٹرانسفر تو کرا سکتے ہیں۔ جاوید نے کہا چھوڑیے کیا گارنٹی ہے جاوید نے پچھلے مہینے کا واقعہ (جبران کا) بھی دہرادیا۔ جس میں ایک پروفیسر کی پٹائی، درخواست اور تمام پروفیسروں کے احتجاج کے بعد بھی نتیجہ صفر آیا تھا۔

فیزیکس کے پروفیسر مشکور حسین نے اسٹاف روم میں پوچھا۔ ''ارے آپ کے ساتھ سنا کچھ ہوا؟''

''ہاں معلوم تو ہوا ہوگا۔''

''تو پھر کیا سوچا ہے۔ درخواست دی کیا؟''

''کچھ ہونے والا نہیں ہے۔''

''میرے ساتھ بھی اس نے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔ تسپر میں نے خوب اس کی لی۔ میں نے کہا تو پیون ہے پیون کی طرح بات کرو (پیون پر تقرر ہوا پروموشن میں کلرک ہوگیا) میں پروفیسر ہوں۔ یہاں سے باہر نکلو گے خبر لے لونگا۔ جتنا پوچھتا ہوں اتنا ہی بولو۔ تب جا کر وہ ٹھیک ہوا۔''

''ہاں بھئی یہ جوکھم کا کام سب سے نہیں ہوسکتا اور مجھے یہ زبان آتی بھی نہیں ہے۔'' جاوید نے کہا۔

گفتگو کرتے ہوئے کینٹین میں پہنچ گئے۔ پروفیسر سراج آئے۔ یہ شمال کے رہنے والے تھے۔ جاوید سے ہمدردی جتائی۔ پروفیسر جلیل احمد (اکنامکس) اور پروفیسر سلمان (اکنامکس) بھی آگئے۔

سلمان نے کہا۔ ''درخواست کہاں ہے؟ لائے کیا؟''

''درخواست سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''ارے میں نے تمہارے لیے کیا کیا سوچا تھا اور تم ہی پیچھے ہٹ رہے ہو۔ کل دیکھا تھا میری خاموشی پر نسپل پر کتنی بھاری گذر گئی۔'' (یہ پروفیسر صاحب خاموش رہ کر مخالف کو جواب دیتے تھے)

''وہ بھی سمجھا ہوگا کہ آخر میں کیوں چپ ہوں؟''

''درخواست دینا چاہیے۔'' پروفیسر جلیل احمد نے کہا۔

''جس پرنسپل نے میری ذلت پر افسوس کا ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ بھلا درخواست لے کر کیا کرینگے؟ دو گواہ میں لاؤنگا، تین گواہ وہ لائے گا۔ ظاہر ہے میری ہار ہوگی۔ پھر کیا ہوگا۔ میرا مذاق۔''

''بھئی آپ درخواست نہیں دینا چاہتے ہیں تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔'' پروفیسر جلیل احمد نے کہا۔

اسی وقت کامرس کے پروفیسر ضمیر الدین بھی آگئے۔ سلمان نے کہا۔ ارے کالج میں کیا ہو رہا ہے کچھ معلوم ہے۔ وہ ہنسنے لگے۔ سلمان نے مزید کہا اب مائیگریٹیڈ ہو کچھ تو سمجھو لیکن وہ کچھ نہیں سمجھے۔

پروفیسر ساجد گکا (حیوانیات) کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ یہ بھی ٹھگنے تھے۔ وہ پونے میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ پچھلے دس سالوں میں اس نے کبھی جاوید کو چائے کے لئے نہیں پوچھا تھا۔ آج اچانک درخواست کی کہ کینٹین چلتے ہیں چائے پینے کو۔ ایک پیالی چائے کو دو کپ میں تقسیم کیا۔ آدھی جاوید کو دی اور آدھی خود پی لی اور جاوید سے پوچھا۔

''سنا آپ کے ساتھ کچھ ہوا؟''

''ہاں معلوم تو ہوا ہوگا۔'' جاوید نے کہا۔

''ہاں سنا ہے تو پھر کیا ہوا؟'' ساجد نے پوچھا۔

''کیا ہوتا ہے؟''

''مگر اس کے بغیر کوئی کاروائی کیونکر ہو سکتی ہے؟'' ساجد نے کہا۔

''رکشا والے موقع پڑنے پر ایک ہو جاتے ہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ الگ ہے۔''

''LMC ممبر (لوکل کمیٹی ممبر) کیا کر رہا ہے؟''

''درخواست مانگ رہا ہے۔''

''صرف درخواست لے کر کیا ہوگا؟''

''پھر اور کیا طریقہ ہے؟''

''اسٹاف کی میٹنگ ہونی چاہئے۔''

''میٹنگ کرانا تو LMC کا کام ہے''۔

''وہ صرف درخواست مانگ رہے ہیں جبکہ پورے اسٹاف کی میٹنگ ہونی چاہئے تھی۔ سب کی طرف سے مشترکہ درخواست پڑنی چاہئے تھی۔ سب کو ایک ساتھ پرنسپل کے پاس جانا چاہئے تھا۔ کلرک نے صرف مجھکو مائیگریٹیڈ نہیں کہا بلکہ تمام کو مائیگریٹیڈ کہا ہے جن کا تعلق پونا سے نہیں ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''ہاں بھئی میں بھی مائیگریٹیڈ ہوں۔ میرے کام کرنے کا طریقہ الگ ہے۔ میرے پاس کوئی پوسٹ نہیں ہے پھر بھی ہر جگہ دوسروں کے حق کے لئے تنہا آواز اٹھاتا ہوں۔ میرے کام کرنے کا طریقہ ہی جدا ہے۔ میں تو سیدھے کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں۔ کورٹ میں ہی ایسے لوگوں کو بلاتا ہوں۔ جو میرے ساتھ آئے گا میں اسی طرح اس کی مدد کرونگا۔'' ساجد نے کہا۔ اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور کہا ''میں ابھی کورٹ جارہا ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔''

اسٹاف روم کے پاس نان ٹیچنگ اسٹاف کا نمائندہ ملتان (کلرک) کھڑا تھا۔ جاوید کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

''درخواست کا کیا ہوا؟''

''کیا ہونے والا ہے؟''

''پھر انصاف کیسے ہوگا۔ کام تو اسی طرح ہوگا جیسا کہ پرنسپل نے کہا ہے۔''

''کوئی امید نہیں ہے جس شخص نے (پرنسپل) نے افسوس کا ایک لفظ نہیں کہا وہ بھلا اور کیا کر سکتا ہے۔''

''تو پرنسپل اس کے بغیر (درخواست) کیسے فیصلہ کرے گا؟''

''اگر ٹیچر کی یہی وقعت ہے تو رہنے دیجئے۔''

''مگر اس کے بغیر پرنسپل کیونکر سمجھے گا کہ کون صحیح ہے کون غلط؟''

''میرے دو گواہ اس کے دو گواہ پھر اس کے تین گواہ پھر میری ہار اور اس کے بعد میری ذلت۔'' اسی اثناء میں پروفیسر شہپر علی آ گئے۔ ملتان کنارے اور خاموش ہو گئے۔ ملتان کا رویہ روکھا نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ جاوید نے درخواست نہیں دی تھی۔ شہپر علی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

ملتان نے بتایا۔'' ان کے ساتھ راشد نے بدتمیزی کی اور یہ درخواست پرنسپل کے کہنے پر نہیں دے رہے ہیں۔''

شہپر علی نے کہا۔'' وہ تو آدمی دیکھکر ہی مشورہ دیں گے۔ ان کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ زبانی کچھ کریں گے۔ اگر ایسا آپ کے ساتھ ہوا ہوتا تو کیا آپ بھی درخواست دینے پر اکتفا کر لیتے؟''

ملتان مسکرانے لگا۔

''اس طرح انصاف نہیں مانگا جاتا ہے۔ اس کا ایک سسٹم ہوتا ہے۔'' شہپر علی نے کہا۔

''کیا سسٹم ہوتا ہے؟'' ملتان نے کہا۔

''تمام اسٹاف کو متحد ہو کر بات آگے بڑھانی چاہئے۔ پرنسپل سے ملنا چاہئے۔ یہاں تو یہ صورتِ حال ہے کہ اسٹاف آپس میں ہی منقسم ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''یہی تو انتظامیہ کی پالیسی ہے۔'' شہپر علی نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ ملتان کے

ساتھ گراونڈ فلور کی طرف جانے لگے۔

مولانا نے جاوید سے کہا۔ '' آفس سپرنٹنڈنٹ اور وائس پرنسپل کو بتایا؟''

'' جاوید نے کہا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے اور آپ کو معلوم ہے یہ سب دکھاوا ہے۔ ہونے والا کچھ نہیں۔ پرنسپل تا کلرک متعصبانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔''

مولانا نے جامعہ ملیہ میں نان ٹیچنگ کے امتحان، جے این یو اسٹاف کے بائیکاٹ، وائس چانسلر کا آنا اور کلرک کی معافی کی کہانی سنائی۔ میرے سی ایل کے واقعہ کو لے کر پروفیسر جلیل احمد نے پرنسپل کے پاس جانے سے انکار کر دیا اور خود کو اسٹاف کا نمائندہ کہتے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔

فلیٹ آنے کے بعد جاوید نے ساری روداد اپنی بیوی کو سنایا۔ اس نے کہا درخواست دینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ کوئی جب کچھ کہے تو وہیں پر اس کو جواب دے دیا جائے بس۔

پرنسپل نے NSS کی ایک میٹنگ بلوائی۔ نووارد پروفیسر کو بھی بلایا گیا۔ کیمسٹری کے پروفیسر جہانگیر این ایس ایس آفیسر بنائے گئے۔ ان سے کہا کہ این ایس ایس کمیٹی کے لئے نئے ممبر پروفیسروں کا انتخاب کرلیں ۔ نئے ممبروں میں ایک نام جاوید کا بھی تھا۔ دوسری میٹنگ اگلے ہفتے این ایس ایس آفیسر کی قیادت میں ہوگی۔ اس بات پر میٹنگ ختم ہوگئی۔

اگلے ہفتے جب جاوید اسٹاف روم میں بیٹھا تھا ایک پروفیسر نے کہا'' آج آپ این ایس ایس کی میٹنگ میں نہیں تھے؟''

''نہیں تو مجھے کسی نے بتایا نہیں۔ کوئی نوٹس بھی نہیں۔ میں تو روز اسٹاف نوٹس بورڈ دیکھتا ہوں۔''

'' یہاں نوٹس نہیں لگاتے۔ این ایس ایس آفیسر ایک اسٹوڈنٹ کو ذمہ داری دے دیتے ہیں وہ کمیٹی ممبر اور طلباء کو آگاہ کر دیتا ہے۔''

''لیکن مجھے تو کسی طالب علم نے کچھ نہیں بتایا۔''

''ہوسکتا ہے آپ سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔''

''تو اب کیا کریں؟''

''آپ این ایس ایس آفیسر سے مل لیجئے۔''

جاوید پریشان ہوگیا۔ خدا معلوم نیا این ایس ایس آفیسر کیا کہے گا۔ مجھے معلوم ہوتا تو میٹنگ میں ضرور جاتا۔ اس طرح کی لاپرواہی سے غلط تاثر قائم ہوگا۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ پروفیسر جہانگیر سے ملنے لیباریٹری میں گیا جہاں وہ طلباء کو پریکٹیکل کروار ہے تھے۔ پروفیسر ایک کنارے کرسی پر بیٹھے تھے۔ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے جاوید ان کے پاس پہنچا اور نہایت انکسارانہ انداز میں سلام کیا۔ تب ہی وہ بھانپ گئے کہ میاں کی حالت پتلی ہے۔ انکساری جاوید میں اس لیے بھی تھی کہ وہ ایک مہذب یونیورسٹی سے کالج میں پہنچا تھا۔

جاوید نے کہا۔ ''سر وہ میٹنگ کا مجھے نہیں معلوم تھا۔'' وہاں کالج میں ہر پروفیسر ایک دوسرے کو سر کہتے تھے۔

''کیسے نہیں معلوم تھا؟ سب کو معلوم تھا۔''

جاوید چپ۔ اب اس کے آگے کیا بولے۔ لیکن بولنا تو تھا۔ کہا۔ سر ہم سے بھول ہوگئی۔ آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ معذرت خواہ ہیں۔ پروفیسر جہانگیر نے معذرت خواہ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کہا کہ آپ کو پرنسپل سے ملنا ہوگا۔ جاوید گھبرا گیا۔ پرنسپل نہ جانے کیا کیا سنائے۔ بہتر ہوتا یہ معاملہ یہیں رفع دفع ہو جاتا۔ اس نے پروفیسر سے کہا دیکھئے سر ہم معذرت کر چکے ہیں I AM SORRY ۔ پروفیسر صاحب اب بھی معذرت نہیں سمجھے لیکن انگریزی کا مطلب واضح تھا۔ انھیں اندازہ ہوا کہ جاوید کی عقل ٹھکانے آگئی ہے۔ چلو معاملہ ختم کئے دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا تم سے ناسمجھی میں ایسا ہوا ہے اس لیے ہم اس بات کو ادھر ہی ختم کر رہے ہیں۔ دوبارہ ایسا مت کرو۔ اگلے ہفتے این ایس ایس کیمپ کالج سے دس کیلومیٹر دور ہٹر پسر گاؤں میں لگے گا۔ یہ پندرہ دن کا کیمپ ہوگا۔ پندرہ دن اُدھر رہنے کا نہیں تو روزانہ دس بجے جا کر شام میں آنا پڑے گا۔ جاوید نے کہا پندرہ دن میں وہاں نہیں

رہ پاؤنگا ہاں روزانہ جانا آنا کرسکتا ہوں۔ انھوں نے کہا ٹھیک ہے لیکن وہاں جو کام کرنے کو بولا جائے وہ کرنے کا۔ جاوید نے کہا میں کرونگا۔

ہفتے بعد چار پروفیسر بیس طالب علم ہڑپسر گاؤں کے ایک مکان میں دس بجے دن میں پہنچ گئے۔ ان میں جاوید بھی تھا۔ سب نے اپنے بیگ اور سامان ایک کمرے میں رکھ دیا۔ این ایس ایس آفیسر نے کہا کھانا خود سے پکانا پڑے گا۔ برتن تو ہے لیکن پانی نہیں ہے۔ پانی یہاں سے آدھا کیلومیٹر پر سڑک کے کنارے ایک پبلک نل ہے وہاں سے لانا پڑیگا۔ کیمپ کے لئے جو مکان منتخب کیا گیا تھا وہ گاؤں کی آبادی سے باہر ایک طویل وعریض میدان کے کنارے میں تھا۔ اُدھر سو دوسو میٹر کے فاصلے پر مکانات تھے۔ مکانوں کے درمیان خالی پلاٹ تھے۔ مکانوں کے مالک شہر میں رہتے تھے۔ مہینہ دومہینہ میں وہ ایک بار یہاں دوتین دن رہ کر واپس لوٹ جاتے تھے۔ گاؤں سے ان مکانوں اور میدانوں کی طرف کچی سڑک جاتی تھی جس میں کئی جگہ پانچ میٹر دس میٹر کے گڈھے تھے۔ این ایس ایس آفیسر نے سوچ سمجھ کر یہاں کیمپ لگایا تھا۔ اسے انھیں دنوں یہاں آنا تھا۔ این ایس ایس کے طلباء سے کہا کہ کھانا اور دوسری ضرورت کے لئے سب سے پہلے تم لوگ پانی جمع کرو۔ سب پانی لانے چل پڑے۔ یہ مکان دراصل اسی این ایس ایس آفیسر کا تھا اور گاؤں سے مکان تک جانے کا وہی راستہ تھا جس میں بڑے بڑے گڈھے تھے۔ یہ سڑک ان کے مکان کے کنارے سے آگے چلی گئی تھی۔ پہلے دن پورا پانی جمع کرلیا گیا۔ مکان میں کئی کمرے تھے۔ ایک ایک کمرے اور چھت کی صفائی ہوگئی۔ مکان کے باہر میدان میں کھانا پکنے لگا۔ آفیسر نے کہا کہ آج پہلا دن ہے۔ کام کل سے شروع کریں گے۔ پہلا کام سڑک کے چاروں گڈھوں کو برابر کرنا ہے۔ کیونکہ اس پر یہاں کے قرب وجوار کے لوگوں کو چلنے میں دقت ہوتی ہے۔ این ایس ایس کا مطلب ہے قومی خدمت یعنی وہ خدمت جس میں ہر شخص کا بلکہ پوری قوم کا فائدہ ہو۔ اس سڑک سے ہر آدمی کو آنے جانے میں سہولت ہوگی اس لئے ہم لوگوں کا یہ کام قومی خدمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ کل دس بجے کام شروع

ہو جائے گا۔ تمام طالب علم حاضر رہیں گے۔

اس سڑک کی مرمت کے لئے پروفیسر جہانگیر نے کئی بار گاؤں کی پنچایت کو درخواست دی تھی لیکن کچھ نہ ہوا۔ خود سے اتنے گڈھوں کی مرمت ناممکن تھی۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ بیس طالب علم ایک ساتھ اس کام کے لئے مل گئے۔ کل چار گڈھوں میں پانچ پانچ طالب علموں کی جماعت لگادی گئی۔ وہ آس پاس سے پتھر لڑھکا کر لاتے اور گڈھوں کو پاٹنے لگے۔ بیلچہ پھاوڑا کا استعمال کرنے لگے۔ فوٹوگرافی ہونے لگی۔ ہر گڈھے کے پاس جب فوٹو لیا جاتا تو آفیسر صاحب وہاں کھڑے ہو جاتے۔ چاروں گڈھوں کو بھرنے اور سڑک کو ہموار کرنے میں دو ہفتے لگ گئے۔

این ایس ایس کے سارے طالب علم دن رات اسی گھر میں رہتے تھے۔ پروفیسر صاحب روزانہ شہر کے گھر کو لوٹ جاتے تھے اور روزانہ بارہ بجے وہ موٹر سائیکل سے پہنچ جاتے۔ اچھے کپڑے ٹائی وغیرہ باندھ کر آتے۔ کبھی بیوی کو لاتے، کبھی بچوں کو، کبھی والد کو کبھی والدہ کو۔ کوئی نہ کوئی فیملی ممبر ضرور ساتھ ہوتا تھا۔ ایکدن بیوی بچے اور باپ سب کو لے آئے۔ اپنے گھر میں گروپ فوٹوگرافی کا شاندار اہتمام کیا۔ جاوید کے بازو میں بوڑھے باپ کو بٹھادیا اور ان کی بغل میں بیوی کو۔ بیوی کی گود میں ایک بچی تھی۔ والد کی گود میں دوسری بچی تھی۔ جاوید کی کرسی کے ایک ہاتھ سے لگا کر تیسری بچی کو کھڑا کر دیا گیا۔ اور خود کرسیوں کے پیچھے جہاں قطار میں طلباء کھڑے تھے ان کے درمیان سوٹ پہنے کھڑے ہو گئے۔ فوٹوگرافر سے کہا کلک کے پہلے مسکرانے کو بولنا اور مسکراتے ہوئے گروپ فوٹوگرافی ہوگئی۔ کیمپ میں طلباء کام کرتے رہے۔ این ایس ایس آفیسر دن میں کسی وقت آ کر معائنہ کر لیتے اور لوٹ جاتے۔ وہ حسبِ معمول اپنا کام کر رہے تھے اور طلباء اپنا کام۔ جب گڈھوں کو برابر کر کے سڑک کی شکل بن گئی تو ایکدن پرنسپل کو بلایا گیا۔ پرنسپل تونڈوال آئے۔ دیکھا، بڑے خوش ہوئے۔ این ایس ایس آفیسر نے کہا اس سڑک پر آنے جانے میں یہاں کے لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی اب دیکھئے ہم نے کیسا اسے بالکل برابر اور

مضبوط بنادیا ہے۔مسٹر تونڈوال نے دانت دکھاتے ہوئے کہاواہ آپ کا کام تعریف کے قابل ہے۔ایک فوٹوگرافی پرنسپل کے ساتھ بھی ہوئی۔

جب کیمپ لوٹ آیا تو پچیس تصویریں اسٹاف روم میں لگادی گئیں۔اتنی ہی تصویریں لائبریری اور گرلس کامن روم میں لگادی گئیں۔تین اخباروں میں وہ تصویریں شائع ہوئیں جن میں این ایس ایس آفیسر طلباء کے ساتھ گڈھے کے پاس کھڑے تھے۔اخبار میں لکھا تھا کہ پروفیسر جہانگیر نے کالج کے این ایس ایس میں نئی جان ڈال دی ہے۔انھوں نے پندرہ دنوں تک کیمپ کے دوران دن رات ایک کردیا۔خطرناک گڈھوں کو پاٹ کر گاؤں والوں کے آمدورفت کو آسان بنادیا۔کوئی دوسرا پروفیسر ایسا نہیں کرسکتا۔حالانکہ چار دوسرے پروفیسر بھی اس پندرہ روزہ کیمپ میں طلباء کے ساتھ سڑک کی تعمیر میں ہرلمحہ موجود تھے لیکن ان کا کہیں نام اور ذکر نہ تھا۔

جان بہادر نجات اللہ تقریری مقابلہ ہر سال کالج میں منعقد کیا جاتا تھا۔صدر شعبہ پروفیسر سید نعیم کا کہنا تھا کہ یہ لاش جتنی جلدی دفن ہوجائے تو چین آئے۔تقریر لکھنا، طالب علم سے رٹوانا، سامعین کا انتظام کرنا، جج اور مہمان خصوصی کو ڈھونڈنا دردسر تھا۔پوری مغزماری تھی۔شہر میں جتنے ملکی اور بین الملکی ادیب وشاعر تھے سب بحیثیت مہمان خصوصی اور جج کے بلائے جاچکے تھے۔تیسری بار بلانے سے بدمزگی ہوتی یا کالج انتظامیہ یہ کہتی کہ تم لوگوں کو ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ملتا ہے۔اس شہر کے ادیب وشاعر اپنے آپ کو قومی ادیب سے بڑا سمجھتے تھے جبکہ یہ تمام ہائی اسکول اور پرائمری اسکول میں ملازم تھے۔جب کالج میں آتے تو ان کا انداز کچھ اور ہوتا۔یہ اپنے آپ کو پروفیسر سے بڑا سمجھتے۔

اس دن بھی تقریری مقابلہ تھا۔طلباء کانفرنس ہال میں بیٹھ چکے تھے۔مہمان خصوصی اور ججوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔انھیں فون کیا جارہا تھا لیکن جواب ندارد۔اس حالت میں دوسرا مہمان خصوصی اور جج کہاں سے لایا جائے اور کس کو بنایا جائے۔تقریری مقابلہ پروگرام کا انچارج پروفیسر جاوید تھا۔وہ ادھر ادھر آہوئے دم خوردہ کیطرح بھاگ رہا تھا کہ

کسی طرح مہمان خصوصی اور جج کا انتظام ہو جائے لیکن اتنی جلد کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کار پرنسپل نے کہا کہ اپنے کالج کے ہی کسی پروفیسر سے کہو۔

پروفیسر شہپر علی ڈاکٹر تھے لیکن ریڈر بنے نہ ہی صدر شعبہ اس کے پہلے ہی رٹائر ہو گئے۔ انھوں نے جب سروس جوائن کی تو پروفیسر سید نعیم صدر شعبہ تھے۔ ان کے دور صدارت میں ہی شہپر علی سبکدوش ہو گئے۔ بی۔ ایس سی کے بعد وہ بمبئی چلے گئے۔ وہاں ایک فلمی ہیرو کے سکریٹری ہو گئے۔ ہیرو صاحب کے فلموں کی اور سینز ڈسٹری بیوشن کی ذمہ داری پروفیسر شہپر علی کو ملنے والی تھی لیکن شومئی قسمت نئے ممالک سے ہندوستان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور یہ اسکیم کھٹائی میں پڑ گئی۔ ہیرو صاحب کی ہیروئن (بیوی) نے مردہ بچہ پیدا کیا۔ حمل کے باوجود ہیروئن ڈانس کی پریکٹیس کرتی رہی اس لیے بچہ ضائع ہو گیا۔ اولاد نرینہ تھی۔ ہیرو صاحب نے بیوی کو خوب ڈانٹا۔ مردہ بچہ کو کفن میں لپیٹ کر ہیرو صاحب کے پاس آخری دیدار کے لئے شہپر علی لے گئے تھے۔ ان کو پھر دوسری اولاد نہ ہوئی۔ ہیرو صاحب کا آبائی وطن پیشاور تھا۔

پروفیسر شہپر علی کو ہیرو صاحب کے یہاں اپنا مستقبل دھندلا نظر آنے لگا۔ اس لیے انھوں نے وہاں کی ملازمت چھوڑ دی۔ اگر وہ واقعی ملازمت تھی تو۔ اس کے بعد انھوں نے بمبئی کے کسی کالج سے اردو میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور بحر الاسلام کالج میں آ گئے۔ پروفیسر شہپر علی کی زندگی کا سنہرا زمانہ ہیرو صاحب کی خدمت میں گذر گیا اس لیے یہاں کالج میں ریڈر اور صدر شعبہ ہوئے بغیر ہی رٹائر ہو گئے۔

ہیرو صاحب کی خدمت کی داستان پروفیسر شہپر علی فخر سے سناتے تھے گویا ہیرو صاحب سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ وہی پروفیسر صاحب تقریری مقابلہ کے دن کانفرنس ہال کے باہر کوریڈور سے گذر رہے تھے۔ ان دنوں وہ ایم۔ اے کی کلاس بحیثیت کنٹری بیوٹری ٹیچر کے لیتے تھے۔ جاوید کو امید کی کرن نظر آئی۔ یہ اگر تیار ہو گئے تو آدھی پریشانی دور ہو جائیگی۔ ان کو تیار ہو جانا چاہئے۔ آخر یہاں برسوں اردو کے استاد رہے

ہیں۔اردو کی روزی روٹی کھائی ہے۔اردو کا پروگرام ہے اچھے وقت پر ان سے ملاقات ہوگئی۔جاوید ان کے پاس گیا۔

''اسلام علیکم''

''وعلیکم السلام۔کیا بات ہے۔کوئی کام ہے کیا؟''

''ہاں سرایک ضروری کام ہے اور آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے۔''

کانفرنس ہال میں جان بہادر نجات اللہ کا تقریری مقابلہ ہے۔طلباء آچکے ہیں۔وقت زیادہ ہورہا ہے لیکن ابتک مہمان خصوصی اور جج نہیں آئے ہیں۔زیادہ تاخیر ہوئی تو طلباء نکل جائیں گے۔اگر آپ جج ہوجاتے تو......

یہ سنتے ہی شہپر علی کے چہرے کا سکون بدل گیا۔آنکھیں سکڑ گئیں۔بیزاری سے کہا۔

''نہیں نہیں میں یہ کام نہیں کرتا۔''

''اب اس وقت کون ملے گا۔'' جاوید نے خوشامد کی۔

''کہہ دیا نا یہ سب میں نہیں کرتا۔''

شاید جج کا کام یہ معمولی سمجھ رہے ہیں۔مہمان خصوصی کا کہہ کر دیکھتے ہیں۔تب تو تیار ہوجائیں گے۔جاوید نے کہا جج نہیں تو مہمان خصوصی ہوجایئے۔آپ تو اردو کے پروفیسر ہیں۔اس وقت آپ مہمان خصوصی ہوجاتے تو یہ پروگرام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوجاتا۔اردو والے اگر اردو کا ساتھ نہیں دیں گے تو اور کون دے گا؟

یہ جملے سنتے ہی ان کی پیشانی پر شکنیں پیدا ہوگئیں۔چہرے پر تناؤ آ گیا۔آنکھیں غصہ سے سکڑ گئیں۔دانت پیس کر بولے: ''تم نے آج کیا کھایا ہے؟'' میں پوچھتا ہوں تو نے کیا کھایا ہے؟''

جاوید کو سمجھ میں نہیں آیا یہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔شاید جاننا چاہتے ہیں۔جاوید نے کہا۔

''کیا کھایا ہے سر اس کا اس پروگرام سے کیا مطلب؟''

شہپر پہلے سے زیادہ غصہ میں بولے۔''ارے لگتا ہے آج تم نے سب کچھ کھالیا ہے۔اس لیے تم کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''غصہ سے وہ کانپنے لگے۔

اب جاوید کو سمجھ میں آیا کہ یہ اس طرح اپنے غصہ کا اظہار کر رہے ہیں۔جاوید نے یہ کہہ کر جی ٹھیک ہے ہم کسی اور صاحب کو دیکھتے ہیں کانفرنس ہال کی طرف واپس آگیا۔جی میں اس کے آیا کہ آج ان کو بتادیں کہ کیا کھایا ہے اور کیا کھاسکتے ہیں تاکہ ہمیشہ کے لئے ان کی طبیعت صاف ہوجائے مگر ایسا کرنے سے ہنگامہ کھڑا ہوجاتا اور پروگرام ڈسٹرب ہوجاتا۔اس لیے غصہ پی گیا اور جج کے لئے نیا نام تجویز کرنے لگا۔اسی اثناء میں ایک جج آگئے۔انگریزی کے ایک پروفیسر کو جج نمبر دو بنایا۔مہمان خصوصی نہیں آئے۔پرنسپل کی صدارت میں پروگرام شروع کردیا گیا۔پروگرام کے دوسرے اجلاس میں مہمان خصوصی بھی آگئے۔

جاوید اس پروگرام کا پروفیسر انچارج تھا۔اس لیے پروفیسر شمیم مامامیاں اور صدر شعبہ کو اس پروگرام سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔دونوں کانفرنس ہال میں معینہ وقت پر سامعین کے ساتھ اگلی صف کی کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔پروگرام شروع ہونے پر منچ پر چلے جاتے۔شمیم مامامیاں اپنی جگہ براجمان رہتیں۔اس درمیان جاوید مسلسل دوڑ بھاگ کرتا رہتا۔ہال کے نظم ونسق،بورڈ پر لکھنا،طلباء کو کوریڈور،کینٹین،کالج گراونڈ سے گھیر گھیر کر ہال کے اندر لانا،مہمانوں کو بٹھانا غرضیکہ اکیلے تمام امور کو انجام دیتا۔شعبے کے بقیہ پروفیسر میٹنگ میں کہتے کہ ہم پروگرام کے لیے اپنے حصے کا کام کریں گے لیکن عین موقع پر ٹھنڈے پڑجاتے۔ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاتے۔گویا وہ جان بوجھکر ایسا کرتے تھے تاکہ دیکھیں اچانک ساتھ چھوڑ دینے پر یہ کیا کرتا ہے اور جب پروگرام ناکام ہوگا تو اس کی شکایت پرنسپل سے کریں گے کہ آپ ایسے آدمی کو انچارج بنائیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔ایسے موقع پر جاوید کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔وہ اپنا جی جان لگادیتا۔اس کے لئے یہ دن چیلنج بن جاتا۔آخر

آخر وہ پروگرام کو سنبھال لیتا۔ گویا ہر سال اسے جان بہادر نجابت اللہ پروگرام کی شکل میں پل صراط سے گذرنا پڑتا۔ اس کے کلیگ آخر اس کے ساتھ ایسا رویہ کیوں اختیار کرتے تھے۔ ان میں سے جب کوئی انچارج بنتا تھا تو سب مل جل کر کام کرتے تھے۔ جیسے اپنے گھر کا کام ہو لیکن جاوید کا نام آتے ہی چالیس قدم دور۔ دراصل سارا قصور جاوید کے غیر علاقائی ہونے کا تھا۔ وہ ادھر کا نہیں تھا باہر کا تھا۔

دوسرے دن پروفیسر شہپر علی کی پوری روداد جاوید نے پرنسپل معمر کو سنائی۔ پروفیسر معمر صاحب ایم۔ کام تھے۔ گورنمنٹ نے پرنسپل کے لئے پی۔ ایچ۔ ڈی کی شرط لازمی کردی اس لئے وہ پھر سے وائس پرنسپل ہو گئے۔ جاوید نے سوچا شہپر علی کی زیادتی اور بداخلاقی کو سن کر انھیں غصہ آئے گا اور وہ ان کی جم کر خبر لیں گے۔ لیکن انھوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا ارے ایسا تھا تو ان کو کیوں بولے۔ چلو پروگرام ٹھیک ہو گیا۔ کھانا اچھا تھا۔ بریانی کہاں بنوائی تھی۔ شہپر علی کے جملے اگر جاوید نے کہے ہوتے تو ایمرجنسی میٹنگ ہوتی۔ اس کے اخلاق، ٹیچر کے آداب اور کیریکٹر پر سوال کھڑے کئے جاتے۔ اس سے جواب طلب کیا جاتا۔ مقامی پروفیسر دوڑ بھاگ، محنت اور انتظام کا کوئی کام نہ کرتے تھے۔ نہ خود کرتے تھے اور نہ کسی کے کہنے پر تیار ہوتے تھے اس کے باوجود پرنسپل ان کی نازیبا حرکتوں، شکایتوں، کوتاہیوں اور ہٹ دھرمیوں کو ہنس کر ٹال دیتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہی کوتاہی اور سستی غیر مقامی پروفیسروں سے ہو جاتی تو آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ ڈانٹ، تنبیہہ، انکریمنٹ روکنا سب شروع ہو جاتا۔ بے چارے غیر مقامی پروفیسروں کو سب کچھ کرنا پڑتا تھا سب کچھ سننا پڑتا تھا۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ ان کی تمام خوبیوں کو ان کی ایک خامی نے غرقاب کر دیا تھا جس کا نام تھا غیر مقامی۔

وہ ہر روز کسی نہ کسی جاننے والے سے فلیٹ کے لئے کہتا۔ ہر کوئی یہ کہتا کہ میں دیکھونگا۔ پوچھونگا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ جاوید نے ہوٹل والے، چائے والے، سبزی والے، دکاندار، سبھوں سے فلیٹ کے لئے کہا پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ اس کے جی میں آتا

کہ سڑک پر چلتے ہوئے اجنبی سے کہا جائے لیکن سوچ کر رک گیا۔ وہ دن رات سوچتا رہتا کہ کیا کیا جائے۔

ایک دن کالج کی کینٹین میں پروفیسروں کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ کامرس کے پروفیسر محمد ثمر نے جاوید سے پوچھا کہئے ابھی آپ کی شفٹنگ نمبر کتنی چل رہی ہے۔ یہ ثمر صاحب تبلیغی جماعت کے جنونی ممبر تھے۔ چائے پیتے ہوئے، سیڑھی پر چڑھتے اترتے، اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے، سوسائٹی میں راستے میں بات کرتے ہوئے جہاں موقع ملتا تبلیغ کرنے لگتے۔ جاوید احتراماً سن لیتا کچھ نہ کہتا۔ وہ چلّہ میں چلنے کی دعوت دیتے۔ جاوید بہانہ کر دیتا۔ ان کا خیال تھا دنیا کا ہر مسئلہ حل ہو جائے گا اگر انسان تبلیغی جماعت سے منسلک ہو جائے۔

جاوید نے کہا ڈاکٹر صاحب اس وقت ہماری شفٹنگ نمبر سترہویں چل رہی ہے۔ سترہ سال میں سترہویں شفٹنگ۔ اب اسے ہماری خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی۔ ایسا کسی کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ نہ میرے تعلقات نہ رشتے ناتے۔ اس لیے جہاں بھی فلیٹ ملتا ہے مجھے ایک سال میں نکال دیا جاتا ہے۔ یا وہاں کے حالات سے تنگ آکر میں خود ہی نکل جاتا ہوں۔ آپ کی نظر میں کوئی شخص میری مدد کر سکتا ہے تو بتایئے۔

پروفیسر ثمر نے کہا۔ ''بھئی میری سوسائٹی میں ایک فلیٹ ہے۔ کبھی اس میں میں رہتا تھا جب میرا اپنا فلیٹ نہ تھا۔ الحمدللہ میں نے اپنا فلیٹ خرید لیا ہے اور کرایے کے وبال سے نجات پا چکا ہوں۔ کوشش کیجئے کہ اپنا فلیٹ ہو جائے۔''

جاوید نے کہا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے کہ کسی کو ذاتی فلیٹ ہو جائے۔ فی الوقت میری حیثیت کرایہ دار کی ہی ہے۔ آپ کرایہ کا فلیٹ کہاں اور کیسے ملے گا یہ راستہ بتایئے۔''

''بھئی ان صاحب کی اپنے کالج کمپاؤنڈ کے شمال میں میز کرسی شامیانہ کرایہ پر سپلائی کرنے کی دکان ہے۔ وہ سپلائیر کا کام کرتے ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو ابھی چلکر ان سے بات کرلیں۔ جاوید نے کہا نیک کام دیر کیوں؟ دونوں سپلائیر کی دکان میں پہنچے۔ اختر

صاحب نے دیکھتے ہوئے کہا آیئے آیئے پروفیسر صاحب کدھر آنا ہوا؟ ثمر صاحب نے کہا آپ کا فلیٹ خالی ہے یہ پروفیسر جاوید صاحب ہیں۔ ان کو ضرورت ہے۔ اختر صاحب نے بتایا دو کمرے کا فلیٹ ہے۔ ایک ہزار کرایہ اور دس ہزار پیشگی دینا ہوگا۔ کل آپ یہاں آجایئے۔ روپے دے کر اگریمنٹ فارم پر دستخط کر دیجئے اور کل ہی فلیٹ میں شفٹ ہو جایئے۔''

''کیوں یہ فارم بنانا ضروری ہے؟'' جاوید نے پوچھا۔

''ہاں ضروری ہے۔ اور یہ گیارہ مہینے کے لئے ہوگا۔ بعد میں اسے دوبارہ بھی بنا سکتے ہیں۔ اس میں شرائط لکھی ہونگی۔ آپ پڑھ لیجئے گا۔ یہی سب کہ فلیٹ کے کسی سامان کو توڑ پھوڑ نہیں کریں گے۔ کرایہ وقت پر، ڈپازٹ، لائٹ بل کرایہ دار کا وغیرہ وغیرہ۔'' اگلے دن جاوید اونر کے دفتر میں گیا۔ اگریمنٹ پر سائن کئے اور اس کی ایک کاپی لے کر واپس آگیا۔ فلیٹ میں رہنے لگا۔ دن گذرنے لگے۔ مہینے بیتنے لگے۔ گیارہ مہینے گذر گئے۔ گیارہ مہینے کے بعد دوسرا اگریمنٹ بنا۔ کرایہ ماہانہ بارہ سو روپے ہوگیا۔ دن گذرتے رہے، مہینے بیتتے رہے۔ پھر ایکدن اونر نے کہا اگلے مہینے فلیٹ خالی کر دیجئے۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے۔

جاوید کی بیوی نے کہا کہ ہر سال کی شفٹنگ سے میں تنگ آگئی ہوں۔ اب جیسے بھی ہو ایک فلیٹ چھوٹا سے چھوٹا خریدو۔ کل دو تین بینک میں جاؤ اور فلیٹ پر قرج اور شرح سود معلوم کرو۔ نصف قرض کے بعد نصف نقد کا انتظام جیسے بھی ہو ہم لوگ کریں گے۔ ایک بینک تیار ہوگیا۔ جاوید کو کہسار باغ سوسائٹی پسند تھی۔ یہ علاقہ کارپوریشن میں پڑتا تھا لیکن ہرطرح ڈھونڈنے کے بعد بھی یہاں کوئی فلیٹ پسند کا نہ ملا۔ کوئی پرانا تھا کسی میں پانی نہ تھا اور کسی میں باونڈری نہ تھی۔ کسی کے پیپر برابر نہ تھے اور بینک ایسے فلیٹ پر قرض بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک دن وہ سوسائٹی کے پرویزن اسٹور میں کھڑا تھا۔ وہاں سے سو میٹر کی دوری پر تین چار بلڈنگ کے درمیان ایک پلاٹ تھا جس کے چاروں کنارے پر ٹوٹے ہوئے مکان کا ملبہ پڑا تھا اور درمیان میں فرسٹ فلور تیار ہو چکا تھا اور سکینڈ فلور پر کام چل رہا تھا۔ ایک دو

مزدور صفائی کر رہے تھے۔ اسٹور میں کچھ خریدنے کے بعد پرووِیزن اونر سے پوچھا کہ یہاں کوئی فلیٹ ملیگا مجھے خریدنا ہے اور وہ سامنے ملبے کی عمارت میں فلیٹ خالی ہے کیا؟ اس نے کہا آپ کو اس کی مکمل جانکاری مقیم دیگا۔ وہ باہر کھڑا ہے۔ صاف رنگ اوسط قد اور پینتیس کے آس پاس اس کی عمر ہوگی۔ جاوید نے اپنا منشا ظاہر کیا۔

''کتنے کمرے کا فلیٹ، کتنے بجٹ کا، کس علاقے میں چاہئے؟'' مقیم نے پوچھا۔

''کم سے کم کرایے کا کم سے کم بجٹ کا اور مسلم علاقے میں چاہئے۔'' جاوید نے بتایا۔

''میں کل یہیں شام میں رہونگا۔ آپ اسی وقت آجایئے۔'' مقیم نے کہا۔

جاوید سہی وقت پر حاضر ہوگیا۔ مقیم نے کہا آیئے اسکوٹر پر بیٹھئے۔ اسکوٹر کالج کے راستے پر بھاگنے لگا۔ کالج کے پاس ہی ایک بڑی بلڈنگ کے گراونڈ فلور کے ایک لمبے سے کمرے میں وہ جاوید کو لے کر داخل ہوا۔ وہاں ایک چھوٹا قد اور ایک لمبے قد کا آدمی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں بلڈر تھے۔ مشترکہ طور پر عمارت سازی کا کام کرتے تھے۔ مقیم کو پہنچانتے تھے۔ پوچھا مقیم کیا بات ہے۔ اس نے کہا یہ پروفیسر جاوید ہیں انھیں ایک فلیٹ چاہئے تم اپنا فلیٹ ان کو دے دو۔ میں اسی لیے ادھر آیا۔ چھوٹے قد والے نے کہا ٹھیک ہے۔ دس منٹ میں گفتگو ختم ہوگئی۔ مقیم نے جاوید کو اسکوٹر پر بٹھایا اور بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیا۔

اگلی شام جب وہ اشیائے خوردنی کی دکان پر سامان خرید رہا تھا مقیم نظر آیا۔ اس نے کہا۔ ''کیا پروفیسر صاحب آپ نے تو بھلا ہی دیا۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''آپ کا سارا کام کرادیا اور پوچھ رہے کیا ہوا۔''

''ہاں بتاؤ نہ کیا ہوا؟''

''میرا کمیشن کدھر گیا؟''

''کس بات کا کمیشن؟''

مقیم نے کہا۔ ''ارے میں نے تم کو لے جا کر فلیٹ اونر سے میٹنگ کرائی۔ بات

طے کرادی اس کا کمیشن۔''

جاوید نے سوچا دس منٹ کے ملنے کو یہ تو ایسے بتا رہا ہے جیسے راونڈ ٹیبل میٹنگ کرائی ہے۔ بیٹھے بیٹھے دو باتیں کیا ہو گئیں اسے میٹنگ بتا رہا ہے۔ چلو خوشی سے سو دو سو روپے دے دیں گے۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا۔ خوش ہو جائے گا۔ جاوید نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

دو سو روپے دیکھ کر اس کا تیور بدل گیا۔ بولا۔'' ارے سر تم اپن کو کیا سمجھے لا ہے ٹپوری کیا؟ اپنا یہ دھندا ہے بزنس۔ اسی پر میرا روزی روٹی اور فیملی چلتا ہے۔ تم تو ایسے دے رئے لے ہے جیسے اپن بھکاری ہے۔''

جاوید کو اندازہ ہوا یہ پکا دھندے باز ہے۔ کمیشن پورا لے گا۔ پوچھا تو کتنا ہو گا تمہارا کمیشن؟

'' ایسے تو چار مہینے کا کرایہ دوسرا ایجنٹ لوگ لیتا ہے مگر تم بچے لوگوں کو پڑھاتا ہے اسلئے کم کر کے تین مہینے کا دے دو۔''

'' تین مہینہ یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

'' سر تم کو یہ پیسہ تو دینا پڑے گا۔ اس کا تیور کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے کمیشن کے لئے کچھ بھی کرے گا۔''

'' اس وقت تو میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں کل پرسوں دونگا۔''

'' کوئی بات نہیں تم پرسوں دے دو مگر تین مہینہ مانگتا۔''

جاوید نے فلیٹ اونر سے ملاقات کی اور تین مہینے کے کمیشن کا ذکر کیا۔ چھوٹے قد والے نے کہا۔'' ارے پروفیسر صاحب تم مقیم کو لے کر میرے پاس کیوں آئے۔ کیا اکیلے نہیں آسکتے تھے۔ تم اکیلے بھی آتے تو میں آپ کو فلیٹ اتنے ہی کرایے پر دے دیتا۔ یہ لوگ تو کسٹمر کو ڈھونڈتے رہتے اور انھیں الو بناتے اور پیسہ کمیشن کے نام پر لیتے۔''

'' تو اب کیا ہو گا؟'' جاوید نے کہا۔

''اب کچھ نہیں ہوگا۔ وہ آپ سے پیسہ لے کر چھوڑے گا۔ آپ کمیشن اس کو دے دو۔ آپ نے یہاں آنے سے پہلے اس سے کمیشن کا پوچھا بھی نہیں۔ جان پہچان یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کمیشن کے لئے اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ پروفیسر اور سر کیا ہے۔''

''کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟'' جاوید بولا۔

''ارے یہاں کیا نہیں ہوتا ہے سر۔ آپ شاید ادھر نئے نئے آئے ہیں۔ آپ کو شہر کا کچھ پتہ نہیں۔ ادھر کے لوگوں کو آپ نہیں جانتے۔ یہ آپ کے ساتھ رہیں گے کھائیں گے بات کریں گے لیکن کب آپ کو مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور پھر آپ کو مصیبت میں دیکھ کر ہنسیں گے قہقہہ لگائیں گے۔ آپ بہتر ہوگا اسے خاموشی سے کمیشن دے دیجئے ورنہ شور کرنے کے بعد بھی دینا پڑے گا۔ وہ باز نہیں آئے گا۔ ہم لوگ اسے جانتے ہیں۔ کمینہ قسم کا آدمی ہے۔'' اونر نے کہا۔

جاوید کو شک ہوا کہ کہیں یہ شخص بھی تو اس سے ملا ہوا نہیں ہے۔ جاوید نے مقیم کو تین مہینے کا کمیشن تین ہزار روپے دے دیے جو آفس سے باہر بیٹھا تھا۔ چھوٹے قد کا آدمی بلڈر تھا۔ اس نے کہا کل آپ یہاں آجایئے فلیٹ کی خریداری اور اگلی کاروائی پر بات کرنے۔

اختر صاحب کے فلیٹ میں شفٹ کرنے کے بعد جاوید کی بیوی اور ایک سال کی بیٹی بھی یہاں آگئی تھی۔ اس کی بیوی صبح سات بجے اسکول چلی جاتی۔ اپنی بیٹی فلیٹ اونر کے پاس چھوڑ جاتی۔ فلیٹ اونر کی بیوی صبح سات بجے تا دو پہر دو بجے تک (جب جاوید کی بیوی واپس آجاتی) بچی کی دیکھ بھال کرتی۔ اس کے لئے وہ تیس روپے ماہانہ لیتی تھی۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوتے ہی ہر شام افطار کے پہلے میٹھا، نمکین یا پھل افطار کے لئے بھجواتی۔ ادھر سے بھی کچھ نہ کچھ دیا جاتا۔ یہ سلسلہ آخری رمضان تک چلتا رہتا۔

فلیٹ اونر نے جاوید سے کہا کہ ہم لوگ کل بیٹھ کر اس مہینہ کا حساب کرلیں گے۔ تب آپ فلیٹ خالی کیجئے گا۔ کل متعینہ وقت پر دونوں بیٹھے۔ اونر نے ایک کاغذ جاوید کی طرف بڑھایا جس پر آخری مہینہ کے کرایہ کے علاوہ ہزار روپے زیادہ لکھے ہوئے تھے۔

''یہ ہزار روپے کس لئے ہیں؟'' جاوید نے پوچھا۔

''یہ کھڑکی کے شیشے کے لئے ہیں جو ٹوٹ گئے ہیں۔''اونر نے کہا۔

''اسنے میں نے تو نہیں توڑا۔ادھر لڑکے سڑک پر کرکٹ کھیلتے رہتے ہیں۔ان کی بال لگی ہوگی۔میں نے تو دیکھا بھی نہیں کہ کیسے ٹوٹا۔''

''لیکن فلیٹ میں آپ رہ رہے تھے تو یہ نقصان کون بھرے گا؟''

''میں نے توڑا ہوتا تو دیتا۔آپ کا سامان کوئی توڑ دے گا اور جرمانہ مجھ سے یہ کیسے ہوگا۔''

''تو آپ اس کا کچھ نہیں دیں گے۔''

''اگر ہم لوگوں نے توڑا ہوتا تو ضرور دیتے۔''

اونر کی بیوی اندر یہ بحث سن رہی تھی۔اس نے کہا کہ جو رہتا ہے وہی دیتا ہے۔

''میں نے نہیں توڑا اس لیے میں نہیں دونگا۔'' جاوید نے کہا۔

''جب آدمی کی ضرورت رہتی ہے تو فلیٹ اونر کی خوشامد کرتا ہے۔پیر پکڑتا ہے اور کام نکل جانے پر ہوشیاری دکھاتا ہے۔اس لیے تو کوئی کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرتا۔''اونر کی بیوی نے کہا۔

''احسان کس بات کا۔رہنے کے پیسے دیے ہیں۔مفت میں نہیں رہے۔مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہزار روپے ادا کئے ہیں۔لیکن شیشے کا چاہے جو ہو جائے کچھ نہیں دیں گے۔'' جاوید کی بیوی نے جواب دیا۔

''ہاں کیوں نہیں کرایہ دیں گے۔'' جاوید نے کہا۔

''اچھا اسے ہٹایئے باتھ روم میں نل کا ناب ٹوٹا ہوا ہے اس کا دینا پڑے گا۔''اونر نے کہا۔

''وہ ناب اپنے آپ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ہم لوگ کپڑا رسی باندھ کر اسے مہینوں چلاتے رہے۔آپ سے کہا بھی۔آپ نے اس نہیں بدلا۔اس کا پیسہ آپ کیسے چاہتے

ہیں؟'' جاوید نے وضاحت کی۔

''فلیٹ میں آپ رہے تو جو خرابی ہوگی اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟'' اونر نے پوچھا۔

''اگر ہم نے جان بوجھ کر آپ کے فلیٹ کی دیوار توڑ دی ہوتی، کھڑکی توڑ کر باہر پھینک دیا ہوتا۔ فرش کھود دیا ہوتا، نل اکھاڑ کر پھینک دیا ہوتا، بجلی کے تار اکھاڑ دیے ہوتے تب آپ جرمانہ عائد کر سکتے تھے۔ ایسا تو کچھ ہوا نہیں اور آپ ان اشیاء کے پیسے مانگ رہے ہیں جن کو بدلنا یا درست کرانا آپ کی ذمہ داری تھی۔'' جاوید نے کہا۔

''تو آپ کچھ بھی نہیں دیں گے۔'' اونر نے پوچھا۔

''کرایہ دینگے۔'' جاوید نے کہا۔

جاوید سے کرایہ کے علاوہ جو پیسہ مانگا جارہا تھا وہ غلط تھا اس لیے وہ مشتعل ہوگیا۔ اونر نے دیکھا کہ جاوید اور اس کی بیوی کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تو اس نے کہا اچھا لائیے کرایہ دیجئے۔ جاوید نے اپنی جیب سے روپے نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ گڈس کیریر پر سارے سامان رکھوا کر اپنے ذاتی فلیٹ میں بھجوا دیا جسے چند روز پہلے بینک سے قرض لے کر رجسٹری کروایا تھا۔۔ اونر سے کہا میں نے فلیٹ خالی کر دیا ہے۔ آپ چیک کر لیجئے اور اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف رخصت ہوگیا۔

کالج میں ہندو پاک جنگ چھڑ گئی۔ سونامی آگئی یعنی کالج میں نیک (NAAC) آ گیا۔ نیک نے تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف کے ناک میں دم کر دیا۔ پھر تو ایسی بھاگم بھاگی شروع ہوئی کہ الاماں، جسے دیکھئے نیک میں داخل ہو رہا ہے یا نیک سے نکل رہا ہے۔ پروفیسروں کی صورت نیک کی ہوگئی تھی۔ غالباً مہینوں (چھ مہینے) یہ تماشا چلتا رہا۔ اہل کالج اپنا چین وسکون بھول گئے۔ جاوید خشوع وخضوع کے ساتھ تھرڈ فلور کے طلباء کو پڑھا رہا تھا۔ کلاس روم کا دروازہ بند تھا۔ اچانک کسی نے ناک کیا۔ دروزہ کھولا۔ باہر دروازے پر پرنسپل آفس کا پیون کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے تم نے ناک کیا؟'' جاوید نے پوچھا۔

''ہاں سر۔ میں نے ہی کھٹکھٹایا تھا۔ کلاس روک دیجئے۔ پرنسپل صاحب نے تمام پروفیسروں کو کانفرنس ہال میں بلایا ہے۔ دس منٹ بعد میٹنگ ہے۔'' یہ کہتا ہوا وہ اگلے کلاس روم کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

جاوید نے طلباء سے کہا کہ آج کی کلاس یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ بقیہ گفتگو کل ہوگی۔ ابھی پروفیسرس کی میٹنگ ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ گراؤنڈ فلور کے کانفرنس ہال کی طرف چل پڑا۔ کانفرنس ہال آدھا بھر گیا تھا۔ پانچ منٹ میں تمام پروفیسر آ گئے۔ چھم چھم کرتے پرنسپل ندرت اللہ بھی آ گئے۔ ہال کے پلیٹ فارم پر پانچ کرسیاں لگی تھیں۔ ایک پر بیٹھ گئے۔ دو منٹ ہال کا جائزہ لیا پھر لیکچر اسٹینڈ کو تنتے ہوئے بازو اور سکڑے ہوئے ہاتھوں سے پکڑا اور ہونٹوں کو پھیلایا اور فرمایا ''مائے ڈیر پروفیسرس یہ میٹنگ اس لئے بلائی گئی ہے تاکہ آپ کو خبر دے دی جائے کہ چھ مہینے بعد کالج میں NAAC آئے گا۔ ہمیں اس کے لیے جنگی پیمانے پر تیاری کرنی ہے۔ آپ سب کو نیک کی تیاری میں پورا تعاون دینا ہے۔ آج سے کسی کو کسی قسم کی چھٹی نہیں ملے گی سوائے ناگہانی حادثہ کے۔ کسی کا کوئی EXCUSE نہیں چلے گا۔ ہم نیک کیلئے دن رات ایک کر دیں گے۔ اس کی تیاری کیلئے ہم اس میدان کے ماہر حضرات کو بلائیں گے۔ وہ آپ کو نیک کی ٹریننگ دیں گے۔ آج سے آپ لوگ تیار ہو جائیے۔ یہ سمجھ لیجئے ملک جنگ لڑنے جا رہا ہے۔ اور آپ کو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔ بڑے پیمانے پر اس مہم کو ہمیں سر کرنا ہے۔ مان لیجئے سونامی کا اعلان کر دیا گیا ہے اور اس کی آمد کے پہلے ہمیں ہر طرح کی تیاری کر لینا ہے۔'' اتنا کہہ کر پرنسپل نے کہا آپ لوگ جائیے یہاں دوسری میٹنگ نان ٹیچنگ اسٹاف کے ساتھ ہونی ہے۔

پروفیسروں نے ہال خالی کر دیا سبھی اپنے اپنے دوستوں سے باتیں کرتے ہوئے کاریڈور میں آ گئے۔ جاوید نے مولانا سے کہا مولانا صاحب جنگ اور سونامی دونوں کا سامنا کرنا ہے بلکہ مقابلہ کرنا ہے اب آگے کیا ہوگا۔ مولانا نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا آگے کیا ہوگا۔ اس بہانے اب یہ چھ مہینے تک پروفیسروں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہیگا، نیک تو ایک

بہانہ ہے۔ دیکھئے گا یہ اپنا بخار کس طرح نکالتا ہے۔ خدا محفوظ رکھے اس بلا سے۔

کالج مینجمنٹ کمیٹی نے پرنسپل کو پینتیس لاکھ روپے دیے تا کہ وہ نیک (NAAC) آنے کے پہلے کالج میں رینوویشن (RENOVATION) کرالے۔ روپے ملتے ہی لوکل ٹرسٹی جمعدار روزانہ صبح صبح آ کر کالج کا معائنہ کرنے لگا۔ ٹرسٹی کو دیکھ کر پرنسپل بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کالج گراؤنڈ مین گھومتے ہوئے ٹرسٹی اپنے ساتھ آئے ہوئے انجینیر اور آرکیٹیکٹ سے مختلف سوال کرتا رہا۔ ایک صبح ٹرسی کو کالج میں آئے ہوئے دو تین گھنٹے گذر چکے تھے۔ پرنسپل کا کہیں پتہ نہ تھا۔ معلوم ہوا وہ اپنی ٹر میں ہے یعنی پرنسپل لاج میں۔ کون جائے روز روز تیار ہو کر۔ پرنسپل نہیں آیا۔ ٹرسٹی نے کہا یہ پرنسپل کہاں ہے اسے بلاؤ۔ چپراسی رضوان پرنسپل کو بلا لایا۔

ٹرسٹی نے ڈانٹ لگائی۔ ''تم کئی دنوں سے مسلسل آرام کر رہے ہو۔ میں ادھر گھاس اکھاڑنے نہیں آتا۔ تمہارے کالج رینوویشن کیلئے آتا لیکن تم کو سونے سے فرصت ہی نہیں ہے۔ پرنسپل بننے کے بعد تمہارا دماغ ساتویں آسمان پر چلا گیا ہے۔ تو ہمیں نیچے اتارنا بھی آتا ہے۔ پرنسپل بن گیا تو کیا ہوا۔ پرنسپل کی طرح رہنے کا۔ اپن تمہارے باپ کا غلام نہیں جو سویرے سویرے تم کو سلام کرنے آتا ہے۔ صبح فلیٹ میں سے نکلا کرو۔ تمہاری صحت کیلئے اچھا رہے گا۔ تم کو ادھر رہنے کا فلیٹ دیا ہے کالج دیکھنے کے لئے۔ دن رات سونے کو نہیں۔ آیا تمہارے دماغ میں؟ کچھ آیا یا کچھ اور بولنا پڑے گا؟''

پرنسپل ہونٹ پھیلا کر اور گردن ہلا کر سنتا رہا۔ چند لمحوں کیلئے اسے بہت ناگوار گذرا۔ غصہ بھی آیا لیکن اس کی چمڑی سخت اور دبیز تھی۔ لفظوں کی چوٹ زیادہ دیر تک اس پر ٹھہر نہ سکی۔ اور جو تھوڑی بہت رہ گئی کچھ دیر بعد کسی معصوم پروفیسر پر ڈانٹ ڈپٹ کرا تار لی۔

نیک کی تیاری کیلئے دوڑ بھاگ شروع ہوگئی۔ مختلف امور کیلئے ۳۵ کمیٹی بنائی گئی۔ IQAC کے چیرمین پروفیسر عبدالقوی، کیٹرنگ کے چیرمین عبدالقوی، پبلک ریلیشن کمیٹی کے چیرمین پروفیسر عبدالقوی، ڈسپلین کمیٹی کے چیرمین پروفیسر عبدالقوی۔ جس کمیٹی

کو دیکھئے وہاں چیرمین عبدالقوی۔ پروفیسر عبدالقوی کالج میں مشہور ہوگئے۔ ہر پروفیسر کو کسی نہ کسی کمیٹی میں ممبر بنایا گیا اور بیشتر کمیٹی کے چیرمین پروفیسر عبدالقوی۔ جس کو دیکھو قوی کا نام لے رہا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ قوی صاحب میں آہستہ آہستہ تبدیلی ہونے لگی۔ اب ان کے انداز بدلے۔ تیوز بدلے اور خود کو پرنسپل ثانی سمجھنے لگے۔ جسے دیکھئے ڈانٹ رہے ہیں۔ نصیحت کر رہے ہیں۔ لکھا رہے ہیں۔ بتا رہے ہیں۔ اب پروفیسروں کی یہ حالت ہوئی کہ کسی کو پرنسپل اپنے چیمبر میں بلا رہا ہے اور کسی کو پروفیسر قوی۔ گویا ایک مصر میں دو فرعون۔

نیک کی تیاری کیلئے ایک ہفتے میں چار چار پانچ پانچ میٹنگ ہونے لگی۔ ایک دن میں دو میٹنگ بھی ہو جاتی۔ کبھی صدر شعبہ کی کبھی پروفیسروں کی، کبھی غیر تدریسی عملے کی۔ اسٹاف روم کے نوٹس بورڈ پر روزانہ تین چار نئے نوٹس لگی ہوتی۔ نیک کے نام پر کسی پروفیسر کو کسی بھی وقت کالج میں بلایا جانے لگا۔ جاوید دو تین بجے دوپہر میں فلیٹ پہنچا۔ ہاتھ منہ دھو کر جیسے ہی کھانا شروع کیا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا پرنسپل آفس کا کلرک ہے۔ کیا بات ہے بھئی؟ بتایا کہ فوراً کالج پہنچئے پرنسپل صاحب نے بلایا ہے نیک کی ضروری میٹنگ ہے۔ جیسے تیسے لقمہ زہر مار کیا۔ کپڑے تبدیل کئے اور جانے کو تیار۔ بیوی نے کہا اجی یہ کس طرح کی نوکری ہے صبح سات سے دو کے بعد گھر آئے اور تین بجے پھر واپسی۔ نوکری ہے یا غلامی اس نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔ جاوید نے سمجھایا بیگم پرنسپل کی زندگی کا یہ پہلا اور آخری نیک ہے۔ اسے دوبارہ یہ موقع نہیں ملے گا اس لیے پروفیسروں کی دم پکڑ کر ہلا تا رہتا ہے۔ جانا تو پڑے گا۔ شاید دس بجے رات میں واپسی ہوگی۔ گیارہ بجے رات میں گھر لوٹا۔

دوسرے دن کالج سے لوٹ کر فلیٹ کا دروازہ جیسے ہی کھولا مولانا کا فون آیا۔ کیا بات ہے؟ جاوید نے پوچھا۔ مولانا نے بتایا ابھی ابھی کالج سے فون آیا ہے کہ تمام پروفیسروں کو کالج پہنچنا ہے۔ نیک کے سلسلے میں ایک ضروری میٹنگ ہے۔ آپ کے اسکوٹر سے میں بھی کالج پہنچ جاؤں گا۔ آپ آیئے۔ میں راستے میں کھڑا آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔

''کس کا فون ہے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''اجی کس کا ہوگا وہی بارہ ماسہ کسٹمر پروفیسر مولانا کا۔ راستے میں کھڑے ہیں میرے اسکوٹر پر بیٹھ کر کالج جائیں گے۔''

''کیا کیجئے گا ایک ہی جگہ جانا ہے لیتے جایئے۔ اتنی دھوپ میں دوبارہ کالج جانا یہ اپورا جا آپ لوگوں کا پسینہ نکال کر ہی چھوڑے گا۔'' بیوی نے کہا۔

جاوید نے راستے سے مولانا کو لیا اور کالج پہنچا۔ دیکھا ایک ایک کر کے تھکے ماندے پروفیسر پہنچ رہے ہیں۔ آخر کار سب آ گئے۔ ایک چپراسی نے بتایا آپ سب کو تھرڈ فلور پر زولوجی لیب میں بلایا گیا ہے۔ لیباریٹری میں ایک کنارے مختلف شیشوں اور بوتلوں میں کیڑے مکوڑے رکھے ہوئے تھے۔ بڑے ہال میں میز اور ڈیسکس پھیلے تھے۔ یہاں کے صدر شعبہ پروفیسر قوی تھے۔ اس لیے یہ میٹنگ اتنی اونچائی پر بلائی گئی تھی۔ ندرت اللہ آ گئے اور پروفیسروں کو بتایا کہ آپ کو نیک کے متعلق اہم جانکاری پروفیسر قوی دیں گے۔

پروفیسر قوی کھڑے ہو گئے اور بتایا کہ '' نیک کیلئے سب سے ضروری ہے فائل بنانا۔ آپ لوگوں کو اپنے اپنے شعبے میں زیادہ سے زیادہ فائل بنانا ہے۔ جو فائل شعبے کیلئے بنایئے اس کی ایک نقل فائل اپنے گھر پر بھی رکھئے تمام فائل کے ساتھ ساتھ بوکس (BOX) فائل بھی بنایئے۔ میں نے کالج مینجمنٹ سے بات کی تھی انھوں نے وعدہ کیا کہ کالج کو ایک ہزار فائل دی جائے گی۔ پروفیسر قوی اپنی ہر گفتگو میں مینجمنٹ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ میں نے مینجمنٹ کو یہ بتایا انھوں نے کہا ٹھیک ہے آپ اس کام کو کیجئے۔ بغیر مینجمنٹ کے ان کا لقمہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ ان کی ملاقات واقعی مینجمنٹ سے ہوتی تھی یا من گھڑت داستان سناتے تھے۔ خدا معلوم۔ انھوں نے کہا کہ آپ سب کو تین دن بعد فائل مل جائیگی۔ اس سے پہلے آپ اپنے شعبے میں تمام ضروری کاغذات کو ترتیب دے لیں۔'' اتنی تقریر پر میٹنگ ختم ہو گئی۔

''مولانا کیسی لگی پروفیسر قوی کی نصیحت؟'' جاوید نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ بہت بڑا گدھا ہے بلکہ اس سے بڑا گدھا جانور راجو رلجہ ہے۔ اتنی سی بات کہنے کے لیے تمام پروفیسروں کو ان کے گھر سے دوبارہ اتنی سخت

دھوپ میں بلانا یہ کون سی شرافت ہے۔ محض یہ جتانے کے لیے کہ ہم نیک (NAAC) کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں۔ یہ اطلاع کل بھی دے سکتے تھے۔ خدا خیر کرے ابھی تو آغاز ہے، انجام تو باقی ہے۔'' مولانا نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

''تو کل شعبے میں کاغذات کی چھان پھٹک کرلیں؟'' جاوید نے کہا۔

''ہاں کرنا تو پڑے گا۔ چلئے فلیٹ لوٹتے ہیں۔'' مولانا نے کہا۔

دونوں اسکوٹر سے ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن پھر میٹنگ ہوئی۔ تمام پروفیسروں کو لسٹ آف فائلس دی گئی جس میں ۶۰ طرح کی فائلوں کے نام تھے۔ طلباء کے الگ اور پروفیسروں کے الگ۔ طلباء کی ہر شعبے میں تعداد، کامیاب، ناکام، نصابی اور غیر نصابی تمام امور کی فائلس۔ اسی طرح پروفیسروں کی نصابی اور غیر نصابی کارکردگی کی فائلس، سیمینار، تحقیقی مقالے اور کتابیں ریسرچ پروجیکٹ سب کی فائلس۔ ان کے علاوہ ریاستی حکومت، شعبۂ تعلیم، یو جی سی اور حکومت ہند کے تعلیمی امور سے متعلق فائلس۔ کہا گیا کہ ساٹھ فائلوں کے متعلق جو بھی کاغذات ہر شعبے میں موجود ہیں ان کی سارٹنگ کرلیں۔ کل فائل کے ملتے ہی انہیں فائل میں لگا دیں اور شعبے میں جو غیر ضروری کاغذات ہیں انہیں فوراً نکال باہر کر دیں۔ بے مقصد چھوٹا سا پرزہ بھی نہیں رہنا چاہیے۔ میٹنگ ختم ہوگئی۔

دوسرے دن پروفیسر شعبے کی صفائی میں لگ گئے۔ جس شعبے میں جایئے فرش پر کاغذ ہی کاغذ نظر آتا۔ کوئی میز کی دراز صاف کر رہا ہے کوئی الماری اور کوئی بک شیلف۔ اسٹاف روم میں روز ایک نئی نوٹس لگتی تھی۔ آج نئی نوٹس یہ تھی کہ تمام پروفیسر کمپیوٹر بلڈنگ کے لکچر ہال میں فوراً جمع ہو جائیں۔ نیک (NAAC) کی ضروری میٹنگ ہے۔ ندرت اللہ کالج کی تینوں بلڈنگ میں میٹنگ لیتے۔ آج مین بلڈنگ، کل ہوسٹل بلڈنگ، پرسوں کمپیوٹر بلڈنگ۔ کیا راز تھا معلوم نہیں۔ انہیں شاید گھوم گھوم کر میٹنگ لینے میں لطف آتا تھا۔ خیر کمپیوٹر بلڈنگ میں میٹنگ شروع ہوئی۔ بتایا گیا کہ آپ لوگوں نے شعبے سے غیر ضروری کاغذات کو

صاف کر دیا ہوگا۔ سارٹنگ بھی کر لی ہوگی۔ اس میٹنگ کے بعد پروفیسر قوی کے چیمبر سے آپ تمام اپنے اپنے شعبے کے لیے ساٹھ فائلس لے لیجئے۔ فائل پر قلم سے کچھ نہیں لکھئے کمپیوٹر سے بنا اسٹیکر لگائیے۔ یہ اسٹیکر اوپری حصہ پر لگائیے۔ اس کے کنارے فائل کا نمبر پرانے کیلنڈر سے نمبر کاٹ کر لگا دیجئے۔ کل آپ کو اتنا کام کرنا ہے۔

اگلے روز سبھوں کو فائل مل گئیں اور حسب ہدایت سب نے اس پر نام اسٹیکر اور نمبر لگا دیا۔ ضروری کاغذات بھی اس میں لگا دیئے۔ اگلی میٹنگ ہوسٹل بلڈنگ میں ہوئی۔ بتایا گیا لسٹ آف فائلس کو الماری پر بھی لگائیے تاکہ نیک ممبران پہلے فائل کا نام اور سیریل نمبر پڑھ لیں تب الماری کو کھولیں۔ کسی نے کہا اس کے شعبے میں الماری نہیں ہے۔ بتایا گیا کہ آپ اپنی فائلس کو میز پر ڈسپلے کیجئے۔ آخر کمیٹی کو دکھانا ہی مقصود ہے۔ میز پر اس طرح رکھئے کہ ایک فائل دوسرے فائل پر چڑھی ہو لیکن اس کا نام دکھائی دے۔ فائل کو اس ترتیب میں الیکٹرانکس ڈپارٹمنٹ والے نے رکھا ہے۔ آپ لوگ وہاں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ جس طرح میز پر فائل ڈسپلے کرنا ہے اسی طرح اپنی کتاب اور رسالے بھی رکھئے تاکہ کمیٹی ایک نظر میں سب کچھ دیکھ لے۔ نان ٹیچنگ اسٹاف کو بھی نصیحت دی گئی کہ وہ اپنی فائلس درست کر لیں اور لسٹ آف فائلس کو ہر الماری پر چپکا دیں تاکہ کمیٹی والے جب کوئی فائل دیکھنا چاہیں تو سیریل نمبر دیکھ کر اس فائل کو فوراً الماری سے نکال سکیں۔ پروفیسروں کو بتایا گیا کہ شعبے میں اپنی میز پر اپنے نام اور عہدہ کا بورڈ بھی رکھئے۔ شعبے کی در و دیوار کو خوشبو سے اسپرے کیجئے۔ شعبے کے انٹری پوائنٹ پر شعبہ کا نیم پلیٹ ہونا چاہئے، اس کے نیچے صدر شعبہ کا نام بھی ڈگری اور عہدہ کے ساتھ لگائیے۔

ایک ہفتہ میں پورے کالج میں نیک (NAAC) کے ڈر سے شعبہ اور ہیڈ شعبہ کا بورڈ مناسب جگہ پر لگ گیا۔ صبح دوپہر شام متواتر میٹنگ ہوتی رہی۔ لکچر بند ہو گئے۔ چھٹی رد کر دی گئی۔ ریفریشر اور سیمینار کی شرکت روک دی گئی۔ دوسری طرف کالج کا RENOVATION مقامی ٹرسٹی کراتے رہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے کالج کو ۳۵ لاکھ

روپئے دیے گئے تھے اسے خرچ تو کرنا تھا۔ واقعی پینتیس لاکھ خرچ ہوئے یا نہیں کس سے کون پوچھ سکتا تھا۔ آخر وہ مقامی ٹرسٹی تھے۔ ٹرسٹی جس کا اپنا الگ سے ایک کالج تھا جس کی نیکنگ (NAACING) دو مہینے پہلے ہوئی تھی۔ ان کے کالج کو کوئی گریڈ نہیں ملا تھا۔ نیک کے دن تمام پروفیسر یونیفارم میں تھے اور ہر طالب نئے لباس میں۔ کمیٹی ممبر نے کیمپس گشت کے دوران ایک طالب علم سے عام آدمی کی طرح تنہائی میں یہ پوچھا کہ آج کیا بات ہے، سب پروفیسر یونیفارم میں اور طالب علم نئے لباس میں ہیں۔ طالب علم نے کہا یہ سب کچھ آج کے لیے ہے۔ کل سے آپ کو گندا میلا نظر آئے گا۔ کالج کی مینجمنٹ کمیٹی کے صدر نے ٹیچنگ اسٹاف اور طالب علم کو تاکید کی تھی کہ آج سب یونیفارم اور اچھے لباس میں آئیں گے اس لیے سب ایسے نظر آرہے ہیں۔ آپ کو حقیقت دیکھنا ہو تو کل آیئے۔ کمیٹی ممبر نے پوچھا یہاں کی اور کوئی خاص بات۔ طالب علم نے بتایا کہ یہاں ایک ایک ایڈمیشن کے لیے لاکھوں روپیہ لیا جاتا ہے اور پروفیسروں کو آدھی تنخواہ دی جاتی ہے۔ وہ ممبر کل آیا کہ نہیں یہ تو نہیں معلوم۔ کسی نے کہا سول ڈریس میں آیا تھا۔ لیکن کالج کو کوئی گریڈ نہیں ملا۔

میٹنگ کا سلسلہ چلتا رہا۔ حالت یہ ہوئی کہ پروفیسر جب کالج کیمپس میں داخل ہوتا تو چپراسی سے پہلا سوال یہی کرتا کہ ابھی نیک (NAAC) کی میٹنگ کس بلڈنگ میں ہو رہی ہے۔ معلوم ہونے پر اس طرف بھاگنے لگتا۔ جس دن لیٹر آیا کہ کمیٹی فلاں تاریخ کو دو دن کے لیے آرہی ہے اسی دن ارجنٹ میٹنگ بلائی گئی۔ یہ میٹنگ مین بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور والے لکچر ہال میں ہوئی۔ اسی ہال میں پرنسپل کا عارضی چیمبر بنایا گیا تھا۔ پرنسپل کے مستقل چیمبر کو RENOVATE کیا جا رہا تھا اس لیے عارضی طور پر چیمبر کو لکچر ہال میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

ایک میٹنگ میں یہ بتایا گیا کہ فائل کی تیاری کے سلسلے میں تمام دستاویزات، فارم، اور انفارمیشن کمپیوٹر سائنس کے لیباریٹری کے کمپیوٹرس میں رکھ دیا گیا ہے۔ پروفیسر وہاں جائیں اور اپنے اپنے شعبے کا ضروری مواد پرنٹ آوٹ کی شکل میں حاصل کرلیں۔ اتنا

سنتے ہی پروفیسر کمپیوٹر سائنس بلڈنگ کی طرف بھاگے تاکہ سب سے پہلے انفارمیشن انہیں مل جائے۔ لیکن وہاں پہنچنے پر کچھ اور ہی عالم تھا۔ پتہ نہیں کدھر سے اور کہاں سے وہاں کے لیب میں تیس پروفیسر پہنچ چکے تھے اور ہر کمپیوٹر کے سامنے ایک پروفیسر اس کے بٹن سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ دونوں لیب میں سو کمپیوٹر تھے۔ وہاں پچیس تا تیس پروفیسر ایک ہال کے فرش پر بیٹھ کر پرنٹ آؤٹس کو پڑھ پڑھ کر ترتیب دے رہے تھے۔ فائل میں لگا رہے تھے۔ ہال سے لگ کر ایک کمرہ تھا جس میں پروفیسر قوی تنہاء کاغذات کو فائل میں پرو رہے تھے۔ وہ ایک دو بار گھنٹے دو گھنٹے میں بڑے ہال میں آتے اور ایک نظر پروفیسروں پر ڈال کر حجرے میں لوٹ جاتے۔ ایک دو بار ہال کے فرش پر بیٹھ کر دس پندرہ منٹ پروفیسروں کے ساتھ بھی رہے۔ عین اسی وقت ان کا فوٹو اتار لیا گیا جس میں فرش پر بیٹھ کر سر جھکائے فائل میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس تصویر کو پرنسپل نے کئی بار میٹنگ میں تمام پروفیسروں کو دکھایا کہ آپ لوگ اس تصویر کو دیکھئے۔ دیکھئے ہمارے اتنے سینئر پروفیسر کس طرح فرش پر بیٹھ کر NAAC کے کام میں مصروف ہیں۔ یہی لوگ تو اس کالج کی شان ہیں۔ دیکھئے کس طرح یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نیک کے کام میں منہمک ہیں۔ پروفیسر قوی نے کمپیوٹر لیب سے منسلک ایک کمرہ اپنے لئے لے رکھا تھا۔ اس میں کسی پروفیسر کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے لیے کھانا، کولڈ ڈرنک سب کچھ اسی کمرے میں آتا۔ یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ بقیہ پروفیسر ہال میں بے حال ہوتے رہے۔ انہیں کوئی چائے دینے والا بھی نہیں تھا اور بغل کے کمرے میں بریانی اور نمکین میٹھا اور چائے کافی جاتی رہتی۔ پروفیسر حسرت سے دیکھا کرتے۔ مولانا نے ایک دو بار پیون سے کہا کہ ہمیں بھی بریانی دو تو اس نے کہا یہ صرف پروفیسر قوی کے لئے ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پروفیسر قوی کی بریانی کا بل دو لاکھ روپے ہوا جسے نیک کے اخراجات میں ضم کر دیا گیا۔ یعنی دو لاکھ کی بریانی تمام پروفیسروں نے نیک (NAAC) کی تیاری کرتے ہوئے کھائی۔ پروفیسر عبدالقوی اپنی قسمت اپنے ہاتھ سے لکھوا کے لائے تھے۔ اس لیے کہ وہ جہاں جاتے تھے انہیں بریانی اور خدمتگار مل ہی جاتے تھے۔ جاوید ایک

بارعلی گڑھ سے پونہ آتے ہوئے جب آگرہ میں ٹرین میں چڑھا تو دیکھا کہ نیچے کی برتھ پر پروفیسر قوی لیٹے ہوئے ہیں۔ کرتا پائجامہ میں دو مولانا ڈبے میں داخل ہوئے۔ عبدالقوی کے پاس آئے۔ ایک نے اپنے ہاتھ کا چھوٹا سا پیکٹ کھولا اور عبدالقوی کو پیش کیا لیجیے، حضرت زبانِ مبارک لگا دیجیے۔ بڑی خاکساری، سعادت مندی سے پورے پیکٹ کی مٹھائی کھلا دی۔ دوسرے نے اپنے ہاتھ کی شیشی کھولی اور تیل نکال کر قوی صاحب کی چمپی کرنے لگے۔ پہلے نے پاؤں دبایا۔ اپنی اپنی خدمات انجام دے کر دونوں ٹرین سے اتر گئے۔ ٹرین چل پڑی۔ پھر کسی بڑے اسٹیشن پر رکی۔ تین مولانا ٹرین میں داخل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں گرم سموسے کا دونا دوسرے کے ہاتھ میں گرم پوریاں تیسرے کے ہاتھ میں پانی کی بوتل۔ دونے اپنی اپنی سوغات بڑی نیک شعاری سے حضور کو کھلا دیئے۔ تیسرے نے بوتل کا پانی نہایت انکساری سے پلایا اور اتر گئے۔ ٹرین چل پڑی۔ پھر کوئی بڑا اسٹیشن آیا۔ تین مولانا چڑھے۔ عبدالقوی کے پاس آئے سلام کیا اور تھیلے میں سے بریانی اور شوربہ دار گوشت کا سالن نکالا۔ حضور کو پیش کیا۔ بڑی خوشامد سے کھلایا۔ درخواست کی کچھ اور لاؤں۔ یہ خدمتگار مولانا بالکل نوجوان لڑکے ہوتے تھے اور ٹھیک گاڑی کے پلیٹ فارم پر رکتے ہی ڈبے میں داخل ہو جاتے اور حضور کی خدمت کر کے اتر جاتے۔ کم وقت میں پورا کھلا کر اتر جاتے تھے۔ واہ کیا کہنا۔ پانچ سات نوجوان ان کے ساتھ پونے تک رہے جو اندھیرے اجالے میں ان کی خدمت کرتے نظر آتے رہے۔ اوپر کی برتھ سے جب بھی جاوید اس طرف دیکھتا دولڑکے قوی صاحب کی انگلی، ہاتھ، پاؤں، کمر اور بال میں لگے رہتے۔ قوی صاحب نے مٹھائی کھاتے وقت آگرہ میں جاوید کو اوپر کی برتھ پر دیکھا تو چونکے مٹھائی کے لیے اشارہ کیا، جاوید نے نہیں لیا۔ اس کے بعد پورے سفر میں حضور نے جاوید سے کوئی بات نہیں کی۔ سفر کی بریانی جب ان سے دامن نہ بچا سکی تو NACC کی بریانی کا کیا کہنا وہ تو اپنے گھر کی لونڈی تھی کسی کو لب کیا ہاتھ تک نہ لگانے دیا، خود ہی لذت یاب ہوتے رہے۔ ایسی چٹ پٹی لذت کے لیے دو لاکھ کی کیا وقعت۔

ایک دن اعلان کیا گیا کہ MOCK NAAC کیا جائے گا۔ موک کمیٹی بنائی گئی۔ پرنسپل، مقامی ٹرسٹی اور پرنسپل کے دوست (جو اورنگ آباد کے کالج میں صدر شعبہ تھے) اور کالج کے رجسٹرار اس کمیٹی کے ممبر قرار پائے۔ پرنسپل چیمبر میں یہ کمیٹی بیٹھ گئی۔ ایک ایک صدر شعبہ اور سینئر پروفیسر کو چیمبر میں بلایا جاتا اور ان سے سوالات کیے جاتے۔ شعبہ کی کیا کارکردگی ہے۔ اسٹوڈنٹ اور ٹیچر کے پرفارمنس اور مستقبل کا پلان وغیرہ۔ جاوید کو بھی بلایا گیا۔ اس کے ساتھ پروفیسر مولانا تھے۔ جتنا پوچھا گیا سب کا جواب جاوید نے دیا۔ مقامی ٹرسٹی نے پوچھا آپ کے شعبہ میں اگر کسی چیز کی کمی ہو تو بتاؤ۔ جاوید نے کہا ہمارے شعبہ میں بک شیلف کا گلاس ٹوٹا ہوا ہے۔ کوئی اچھی سی میز بھی نہیں ہے۔ جاوید اپنی سنا کر باہر آیا تو دوسرا اندر گیا۔ ایک گھنٹہ بعد صدر شعبہ کا موک انٹرویو ختم ہو گیا۔ جاوید اپنے کلیگ کے ساتھ شعبہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ پرنسپل ندرت اللہ آئے خالی کرسی پر بیٹھ گئے اور کہا جاوید صاحب آپ نے ٹرسٹی سے بک شیلف کے ٹوٹنے کی شکایت کیوں کی؟ مجھ سے کہا ہوتا تو میں اس کی مرمت کرا دیتا۔ جاوید نے کہا کہ سر انہوں نے پوچھا کہ شعبے میں کون سی کمی ہے اس لیے میں نے ایسا کہا۔ ندرت اللہ نے کہا نہیں ایسے نہیں بتاتے ہیں۔ یہ تو میری شکایت ہو گئی۔ جاوید نے کہا لیکن میں نے تو شعبے کی کمی بتائی تھی شکایت نہیں۔ یہ سن کر منہ پچکارتے ہوئے پرنسپل چلے گئے۔ انہوں نے دوسرے دن پروفیسروں کو بتایا کہ اورنگ آباد سے میرے جو دوست آئے تھے اور انہوں نے صدور شعبہ کا جو انٹرویو لیا تو انہوں نے جاتے ہوئے بتایا کہ یار تمہارے کالج کے پروفیسر تو بڑے ڈھیلے ہیں یار ان کو ایکٹیو کرنے کا کچھ کرو۔ جاوید یہ سن کر مولانا سے کہا جناب مجھے تو وہ اورنگ آبادی خود ہی ڈھیلے پیلے نظر آرہے تھے۔ ان کی تو آواز بھی صاف نہیں نکل رہی تھی۔ ان کا سوال ہی پروفیسروں نے ٹھیک سے نہیں سمجھا ہوگا تو جواب دیں گے خاک۔

ڈپارٹمنٹ کی ماک وزٹ (MOCK VISIT) کی گئی۔ اس کے لیے پرنسپل نے اپنے چھوٹے بھائی کو حیدر آباد سے بلایا۔ وہ ایم بی اے تھے۔ کوآپریٹیو سوسائٹی میں

اسسٹنٹ رجسٹرار رہ چکے تھے۔ انہوں نے ہر ڈپارٹمنٹ میں ایسے وزٹ کیا جیسے وہی اصل نیک کمیٹی کے صدر ہیں۔ ہر ڈپارٹمنٹ کو مشورے دیئے۔ آپ کو ایسے جواب دینا ہے۔ اتنا کہنا ہے اور زیادہ نہیں کہنا ہے۔ یہ وہی حبیب صاحب تھے جو اورنگ آباد یونیورسٹی میں ایم کام کرتے ہوئے ایک لڑکی کو لے کر پونہ چلے گئے تھے۔ اور وہاں پورے شہر میں لوگ ان کی خاطر کرنے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لوٹ کر حبیب صاحب نے معافی مانگی اور آئندہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنے کے لیے کان پکڑے ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑتا یا جیل جاتے۔ سارا الزام لڑکی پر عائد کر دیا کہ یہی مجھے پونہ لے گئی تھی ورنہ شادی کرنی پڑتی۔ اس طرح کی کئی حرکتیں حبیب صاحب کر چکے تھے۔ وہی صاحب نے کالج میں ماک کمیٹی کا ریہرسل پروفیسروں کو کرایا۔ سچ ہے خدا جب کسی کو دیتا ہے تو کہاں کہاں سے دیتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ گدھے کے دن بھی آتے ہیں۔ ریہرسل کے بعد کانفرنس ہال میں میٹنگ کی گئی جس میں جناب حبیب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ بھائی نے بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ حبیب صاحب نے اپنا دو صفحے کا (چھوٹے سائز کا) وزیٹنگ کارڈ ایک ایک پروفیسر کو دیا۔ انہوں نے بتایا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ قائم کر کے وہ ایم بی اے کے موضوعات پر پورے ہندوستان میں لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ آپ لوگوں کو کبھی ایسی ضرورت ہو تو مجھے بلائیے میں آجاؤں گا۔ اگلے دن میٹنگ ہوئی پرنسپل ندرت اللہ نے کہا ہم سب کے لیے خوشی کی بات ہے کہ NAAC کمیٹی فلاں تاریخ کو اس شہر میں پہنچ رہی ہے۔ ان کا جہاز آج شام میں لینڈ کرے گا اور وہ شہر کے اروڑاتا ور ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ کل پانچ افراد ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پروفیسر ٹن والا اور پروفیسر کارٹن والا اپنی اپنی کار لے کر ایئرپورٹ پر معینہ وقت پر موجود رہیں۔ ان کے ساتھ میں تین پروفیسر اور بھی رہیں۔ جیسے ہی یہ لوگ جہاز سے اتر کر ویٹنگ ہال میں داخل ہوں اپنے پانچوں پروفیسر ایک ایک مالا ممبروں کے گلے میں ڈال دیں۔ تعارف کے بعد اپنی کاروں میں انہیں متعینہ ہوٹل تک پہنچا دیں۔ وہاں یہ معلوم کر لیجئے کہ ان کے کھانے پینے وغیرہ کا کیا انتظام ہے۔ وہاں ان کے بہترین کھانے پینے کا آرڈر دے دیجئے۔

پروفیسر ٹن اور کارٹن والا اس کام کے لیے تیار ہو گئے۔ ندرت اللہ نے کہا کل صبح کی ذمہ داری پروفیسر جلیل احمد اور پروفیسر پونا والا کو دی جاتی ہے۔ آپ دونوں کل نو بجے سے ممبران کی خدمت میں رہیے۔ ان کے ناشتے پانی کا انتظام آپ کے ذمے ہوگا۔ بارہ بجے وہ لوگ کالج پہنچیں گے۔ آپ دونوں ہمیں فون پر بتاتے رہیے کہ آپ کی کار ساڑھے گیارہ بجے ان کو لے کر کس راستے سے کالج تک پہنچ رہی ہے اور ٹھیک کتنے بجے کار مین گیٹ کو ٹچ کرے گی۔ پروفیسروں نے حامی بھری اور کہا کہ ہم دونوں آپ کو ہر دس منٹ پر راستے کی رپورٹ کرتے رہیں گے۔

نیک کے دن کالج کے مین گیٹ تا گراؤنڈ پلیٹ فارم اور پلیٹ فارم تا پرنسپل چیمبر قالین بچھایا گیا۔ پانچ استاد مین گیٹ کے پاس گلہائے عقیدت کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہاں سے گراؤنڈ پلیٹ فارم تک جو پچاس میٹر کی دوری پر تھا قالین کے کنارے یوگانڈا، نائیجیریا، سعودی عرب، عمان اور بحرین کے طلباء و طالبات ہاتھ میں پھول لئے کھڑے تھے۔ گراؤنڈ پلیٹ فارم جو لمبائی میں شمال جنوب دس میٹر کا تھا اس سے لگ کر اور اس سے پرے صدور شعبہ کھڑے تھے اور پلیٹ فارم تا پرنسپل چیمبر ہندوستانی طلباء و طالبات کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں پھول تھے۔ یہ استقبال کرنے والے پروفیسر اور طلباء مین گیٹ سے دیکھنے پر الٹا یو (U) کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ مین گیٹ پر ہی بینڈ باجہ والے کھڑے تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جیسے ہی کار ان کے پاس پہنچے اور ممبران کار سے اتریں بینڈ بجایا جائے۔ بارہ بجے قافلہ مین گیٹ پر پہنچا۔ ندرت اللہ چند سینئر پروفیسروں کے ساتھ وہیں پر کھڑے تھے۔ ممبران کار سے اترے ان سے پرنسپل کا تعارف ایک پروفیسر نے کرایا۔ پرنسپل نے سبھوں کا استقبال کیا۔ بینڈ بجنے لگا پرنسپل ممبران کو لے کر یو شیپ (U SHAPE) استقبال کنندگان سے ملوانے کو چل پڑے۔ آہستہ آہستہ یہ قافلہ پرنسپل چیمبر میں داخل ہو گیا اور وہاں ناشتہ کے بعد پرنسپل نے ایل سی ڈی پروجیکٹر پر ممبران کو کالج رپورٹ پیش کی۔ اس پیشکش کی پریکٹس اور ریہرسل کئی بار پہلے پروفیسروں کے

سامنے کی تھی۔

پیشکش کے بعد ڈپارٹمنٹ وزٹ کا موقع آیا۔ تمام ڈپارٹمنٹ کی میز اور کرسیاں آثار قدیمہ کی نمائندگی کرتی تھیں۔ سات اچھی کرسیاں، پہلا ڈپارٹمنٹ جہاں وزٹ کرنا تھا وہاں لگادی گئیں۔ ASSESSMENT کے بعد جیسے ہی پانچوں ممبران کرسیوں سے اٹھے کالج کوآرڈینیٹر انہیں اگلے ڈپارٹمنٹ کی طرف لے جانے لگے۔ کوآرڈینٹر نے جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کیا تا کہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ سات کرسیاں مجوزہ شعبہ میں پہنچ جائیں۔ سات چپراسی دو دنوں تک تیز رفتاری سے یہ کام کرتے رہے۔ پانچ بجے شام میں کمیٹی ہوٹل لوٹ گئی۔ پروفیسروں نے اپنی اپنی کار سے انہیں ہوٹل تک چھوڑا۔ رات کی فلائٹ سے وہ اپنی اپنی منزلوں کو لوٹ گئے۔

پھر میٹنگ ہوئی۔ پرنسپل نے فرمایا دیکھئے اس کالج کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ آپ لوگ دعا کرتے رہئے۔ آپ سب لوگ اپنی اپنی رائے دیجئے کہ گریڈ کے لیے کتنا نمبر ملے گا اور گریڈ کیا ہوگا۔ آپ لوگ اپنی رائے رائے بکس میں ڈال دیجئے۔ جس کے تخمینہ کا نمبر گریڈ کے واقعی نمبر سے میل کھائے گا اسے دو ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ تمام پروفیسروں نے اپنی اپنی رائے فارم میں لکھ کر بکس میں ڈال دی۔ پروفیسر شارق امام کا تخمینہ صحیح نکلا۔ انہیں انعام دیا گیا۔

مہینوں بعد NAAC کا لیٹر آیا۔ کالج کو اے گریڈ دیا گیا تھا۔ اسی دن کالج کے اندر بڑے زور و شور سے بینڈ بجایا گیا۔ کوئی لیکچر نہ ہوا۔ ریڈیو والے، ٹی وی والے، اخبار والے اُردو، ہندی، مراٹھی، انگریزی سبھی کو بلایا گیا۔ ندرت اللہ نے سبھوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے اخباروں میں کالج کے اے گریڈ کی خبر شائع کریں جس میں پرنسپل کی تصویریں بھی ہو۔

چند روز بعد کالج گراؤنڈ کے درمیان بنے ہوئے پلیٹ فارم پر ایک دیوار کھڑی کی گئی اور اس پر جلی حروف انگریزی میں ایک ایک حرف دو فیٹ کا سنہرے رنگ کا بنوا کر ٹانگا گیا اور ان کے ساتھ سات ستارے بھی لٹکائے گئے اس کے نیچے گریڈ بائی نیک کمیٹی پرنسپل

ندرت اللہ ۔اسی طرح کالج کے مین گیٹ پر فوراً اے گریڈ لکھوا گیا۔ لیٹر ہیڈ پر، پرنسپل چیمبر میں، کالج آفس میں وائس پرنسپل چیمبر میں غرضیکہ جہاں بھی جگہ ملی اے گریڈ لٹکا دیا۔ انہیں دنوں ٹریفک ڈپارٹمنٹ نے شہر کے ہر چوراہے پر لوکلیٹی بورڈ LOCALITY (BOARD) لگایا جس پر لکھا تھا چوک سے آگے کون سا علاقہ ہے اور چوک سے دائیں بائیں کون سے علاقے ہیں۔ بحرالاسلام کالج سے قریبی چوک پر اوور ہیڈ بورڈ لگایا گیا اس پر بحرالاسلام کالج کا نام بھی تھا۔ پرنسپل نے میٹنگ میں کہا کہ یہ اے گریڈ کا نتیجہ ہے کہ اپنے کالج کا نام قریبی چوک کے اوور ہیڈ بورڈ پر آ گیا ہے۔ جبکہ شہر کے مختلف علاقوں میں کالج کے قریبی چوک پر اوور ہیڈ بورڈ پر کالجوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

اب تو روزانہ کسی نہ کسی اخبار میں کالج کا نام اور اے گریڈ کا ذکر ہوتا۔ پرنسپل تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جو بھی کالج میں ان سے ملنے آتا NAAC کا لیٹر دکھاتے اور اس سے بات کرتے ہوئے گراؤنڈ کی دیوار قہقہہ تک لے جاتے جس پر اے گریڈ لکھا تھا۔ اسے دکھاتے اور کہتے دیکھئے ہماری کوشش اور مجھ سے پہلے کے زمانہ پر غور کیجئے جب یہاں کوئی اور پرنسپل تھا۔ اسی گراؤنڈ میں خاک اڑتی تھی۔ کتنی اداسی تھی اور آج دیکھئے کیسی چہل پہل ہے۔ لوگ صبح اور شام میں اس کیمپس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ وزیٹر کہتا ہاں واقعی آپ نے کالج کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ دیوار پر اے گریڈ دیکھ کر پرنسپل کا کلیجہ بڑا ہو جاتا تھا۔ ان کی خواہش رہی ہوگی کہ وہ اپنے ذاتی مکان کی دیوار پر بھی اے گریڈ لٹکا دیتے۔ شاید لوگوں کے اعتراض کے خوف سے نہیں لگایا لیکن جب نیک کے پیسے کا فرش، اینٹ، بجلی کا تار، لکڑی کا تختہ سب اپنے ذاتی گھر میں لگا لیا تو نیک کا بورڈ لگانے میں کیا قباحت تھی۔ اتنا بڑا کام ہوا اور کہیں سے کوئی انعام نہیں ملا۔ آخر کار دلی کی کسی تنظیم سے اسٹار آف انڈیا کا انعام حاصل کیا۔ کسی نے بتایا یہ انعام ہر سال کوئی شخص لے سکتا ہے اگر وہ پچیس ہزار روپیہ پیشگی ادا کرے تو۔ کسی نے سنا تو کہا یہ اسٹار آف انڈیا انعام نہیں بلکہ جیول تھیف آف انڈیا ایوارڈ ہے۔

یونیورسٹی سے جب وہ کالج میں لیکچرر کی ملازمت جوائن کرنے جارہا تھا تو یہی سوچ رہا تھا کہ کالج میں رہنا ہی کتنے دن ہے۔ چھ مہینے ایک سال زیادہ سے زیادہ اس کے بعد لوٹ ہی آنا ہے۔ ہمارے اتنے بڑے بڑے اساتذہ ہیں وہ ہمیں کہیں نہ کہیں کسی یونیورسٹی میں ایڈجسٹ کراہی دیں گے اور جس شعبے میں یہ حضرات ہیں وہاں جنہوں نے پھٹی شرٹ، پرانی پتلون اور پھٹی چپل میں لکچرر کا انٹرویو دیا تھا تاکہ کمیٹی کے سامنے مفلس اور محتاج نظر آئیں آج وہ پروفیسر ہو چکے ہیں اور پورے ہندوستان میں دندناتے پھرتے ہیں۔ یہی نہیں اس شعبے میں ریڈیو والے، ٹی وی والے، اور بچوں کو اُردو سکھانے والے بھی لکچرر ہو کے پروفیسر ہو گئے۔ میں تو الحمداللہ ٹاپر رہا ہوں تھوڑی بہت شد بد بھی ہے۔ مجھے بھی ایسے شعبے میں امید رکھنے کا حق بنتا ہے۔ کالج کی ملازمت کو سالوں سال ہو گئے مگر اب بھی اس کے ذہن میں یہ خیالات گونجتے رہتے۔ یہی سوچ کر وہ اس شہر میں مکمل طور پر اپنے آپ کو سٹل بھی نہ کرسکا۔ کیا مکان اور کیا فلیٹ اور کیا پلاٹ۔ اس کے ذہن میں تو اپنی یونیورسٹی کیمپس کے مکان اور کیمپس کے باہر کے رہائشی مکانات نظر آتے رہتے کہ ایک دن اسے بھی انھیں مکانوں کے درمیان کہیں مکان بنوا کر رہنا ہے اس لیے کالج کے شہر میں رہائش کے پہلو پر کبھی اس نے سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔ کالج کے پروفیسروں نے، زمین اور مکان کے ایجنٹوں نے بارہا سمجھایا کہ زمین یا فلیٹ خرید لیجئے جب جانا ہوگا فروخت کردیجئے گا۔ پیسے بھی زیادہ ملیں گے۔ مگر وہ سوچتا کہ خواہ مخواہ کی جھنجھٹ کیوں مول لے۔ پہلے خریدو پھر بیچو۔ یہاں رہنا ہی کتنے دن ہے۔ کتنے دن کتنے میں دسیوں سال نکل گئے۔ امپلائمنٹ نیوز اور دوسرے قومی سطح کے انگریزی اخبار پہلے بھی پڑھتا تھا لیکن اب اس نے ایسے سارے اخبار پابندی سے خریدنے شروع کردیے۔ جیسے ہی کہیں کوئی اسامی نظر آتی فوراً درخواست بھیجتا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جہاں درخواست دے گا اور وہ جب انٹرویو دینے جائے گا تو اس کا انتخاب ضرور ہوگا کیونکہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اب وہ کالج میں لکچرر بھی ہے اور اس کے پاس کئی سالوں کا تعلیمی تجربہ بھی ہے بھلا اس کا نہیں ہوگا تو کس کا

ہوگا۔ لیکن یہ خیال بھی خیال محبوب ہی رہا۔ وہ بار ہا انٹر ویو دینے جاتا رہا درخواست بھیجتا رہا مگر کہیں بھی اس کا سلیکشن نہ ہوا۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ہاں اپنے اساتذہ پر جو بھروسہ تھا وہ کمزور پڑنے لگا۔ اب اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ وہ محض تسلی اور ہمدردی کی باتیں تھیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک ایک کر کے ایسی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ جہاں اس نے زندگی کے سات سال اعلی تعلیم کے دوران بزرگوں کی خدمت میں گذارے تھے۔ وہ تمام بزرگ ایک ایک کر کے صدر شعبہ ہوتے رہے بدلتے رہے ترقی کرتے رہے مگر کسی نے ایک بار بھی یہ نہ کہا کہ اسامی آئی ہے تم بھی درخواست دے دو۔ بھولے سے بھی ایسا نہیں کہا۔ یہی نہیں اسامی اور درخواست تو اپنی جگہ سترہ سال میں کسی استاد نے یہ بھی نہ کہا کہ ہمارے یہاں کے سیمینار میں بطور شریک کار آجاؤ۔ ایک بار ایک استاد کو یہ لکھا کہ سر اس شہر میں میرے بن باس کو چودہ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں تو انھوں نے سمجھایا کہ اس طرح اپنے حالات مت لکھا کرو ہمیں دکھ ہوتا ہے۔ اب جاوید نے اپنے ذہن سے بزرگوں کی ہمدردی کے ایسے سارے الفاظ نکال پھینکے اور فیصلہ کیا کہ جو کچھ کرنا ہے اپنے بل بوتے پر اپنے مطالعہ اور اپنے ریسرچ ورک پر۔ اب تک کی اسٹرگل بھی وہ اپنی محنت اور عزم وارادے پر ہی کرتا رہا تھا۔ لیکن لاشعور میں استادوں کے چہرے مرتسم تھے جسے اس نے مٹا دیا۔ استاد کی شخصیت شاگرد کے ذہن پر کندہ ہو جاتی ہے یہ تو انسانی فطرت ہے۔ جاوید نے یونیورسٹی میں دیکھا تھا کہ طالب علم جس کی نگرانی میں ریسرچ کرتا وہ اسے کہیں نہ کہیں تقرر ضرور کرا دیتے۔ جاوید کے دسیوں سال اسی ہوائی امید میں گذر گئے۔ اب اسے ماننا پڑا کہ جو ایک بار یونیورسٹی کی سرحد سے باہر نکل گیا اس کی دوبارہ واپسی ممکن نہیں۔ یہاں سے چلے جانے کے بعد استاد شاگرد کو ایسے بھلا دیتے ہیں جیسے انسان بھیانک خواب کو فراموش کر دیتا ہے۔

بہر حال جاوید نے ایسے تمام دوستوں، ہمدردوں، بزرگوں اور استادوں کی تمام تصویریں اپنے ذہنی فریم سے ہٹا دیں اور وہاں پر اپنی محنت، مطالعہ، تحریر اور تخلیق کے نقش

لگا دیے۔ وہ درخواستیں دیتا رہا انٹرویو کا سامنا کرتا رہا گویا درخواست کرنا اور انٹرویو اب اس کی زندگی کا ایک مستقل مشغلہ اور عشق بن گیا۔ بار بار انٹرویو میں اترنے سے اسے دلچسپ تجربے حاصل ہوئے۔ یہ تجربے دلچسپ ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بھی تھے۔

مسلسل درخواست دینے اور اس پر پرنسپل سے دستخط لینے اور تجربے کی سٹوفکیٹ بنوانے سے پرنسپل نے بھی جان لیا تھا کہ یہ تو چند مہینوں کا مہمان ہے اس کا جہاں انتخاب ہوگا یہ چلا جائے گا۔ پرنسپل اور وائس پرنسپل نو آبجیکشن دیتے دیتے تھک گئے مگر کہیں بھی جاوید کا سلیکشن نہ ہو سکا۔ اب تو پرنسپل اس کی درخواست کو دیکھ کر مسکرانے لگتا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا کہ وہ سوچ رہا ہے میاں تمہارا کہیں تو ہوتا نہیں ہے خواہ مخواہ مغز ماری کیوں کر رہے ہو۔ ایک بار وائس پرنسپل نے صاف صاف کہا کہ اس طرح درخواست دینے سے کچھ نہیں ہوگا تم لے دے کر کیوں نہیں کرواتے۔ اس کے بغیر تمہارا ہوگا نہیں۔ جاوید نے سوچا اگر یہی لے دے کر ہی کرنا ہوتا تو جس یونیورسٹی سے آیا وہیں پروفیسروں کی سبزیاں ڈھوتا۔ ان کے بچوں کو اسکول لیجاتا۔ ان کے گھر کی رکھوالی کر لیا ہوتا تو کب کا لیکچرر ہو گیا ہوتا۔ اب کالج میں آکر ناشناس پروفیسروں کی جوتیاں کیسے اٹھائیں؟ یہ تو اب بھی نہیں ہوگا۔ تو پھر جھیلتے رہو۔ تمہارے جیسے عقلمند امیدوار ہندوستان میں لاکھوں ہیں۔ درخواست دیتے دیتے انٹرویو دیتے دیتے کہیں عمر نہ نکل جائے۔

ایک انٹرویو کیلئے مرکزی یونیورسٹی میں گیا۔ لیکچرر کی ایک جگہ تھی۔ ۷۵ امیدوار آئے تھے۔ جاوید کا خصوصی مطالعہ فکشن تھا۔ سلیکشن کمیٹی نے سوال کیا ''آپ تو کالج میں لیکچرر ہیں تو پھر یہاں لیکچرر کیوں ہونا چاہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ یہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں اعلی تعلیم اور ریسرچ کا بہتر ماحول ہوتا ہے۔''

''ارے یہ دلی دیکھنے آئے ہونگے تو سوچا ہوگا چلو انٹرویو بھی دے لیں۔'' ایک ممبر نے تفریحاً کہا۔

''نہیں سر میں سنجیدگی سے انٹرویو دینے آیا ہوں اگر آپ بھی سنجیدگی سے۔۔۔''

''اچھا اچھا اس شعر کا مطلب بتائیے'' ایک ممبر نے کہا۔

خصوصی مطالعہ فکشن، سوال پوچھا جاتا ہے شعر پر۔ظاہر ہے ممبران اپنی فارمیلیٹی پوری کر رہے تھے۔

اس انٹرویو کی تیاری کیلئے مہینوں فکشن کا مطالعہ کیا تھا کہ پتہ نہیں کہاں سے سوال پوچھ دے۔آخر جواب نہ دیا تو کہیں گے آپ کی تخصیص فکشن ہے اور آپ ادنیٰ فکشن کا یہ سوال بھی نہیں جانتے۔لیکن انھوں نے فکشن کا ادنیٰ سوال بھی نہیں کیا۔جاوید نے شعر کے معنی کھینچ تان کر بتایا۔ممبران نے کہا ہاں ٹھیک ہے اچھا اب جائیے۔اس نے سوچا یہ جائیے کیا ہے۔لکچرر کا انٹرویو اور صرف ایک سوال۔معلوم ہوا ۷۵ امیدوار سے اگر پانچ پانچ سوال اور آدھا آدھا گھنٹے انٹرویو لیا جائے گا تو تین دن لگیں گے۔ممبران ایک دن کیلئے آئے ہونگے۔یونیورسٹی انھیں تین دن نہیں ٹھہرائے گی۔اب ۷۵ سے ملاقات ایک شعر پر ہی تو کی جائے گی۔اور یہی ہوتا رہا۔بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اٹھنے کا اشارہ۔سب سے آخر میں جس امیدوار نے انٹرویو دیا وہی منتخب ہوا۔وہ وہیں شعبے میں عارضی طور پر لکچرر تھا۔جاوید نے کالج میں دوستوں کو روداد سنائی۔انھوں نے سن کر کہا کوئی بات نہیں درخواست دیتے رہو۔آج نہیں تو کل تمہارا ضرور ہوگا۔

ریاستی کالج سروس کمیشن کے انٹرویو میں ریاست کی راجدھانی پٹنہ پہنچا۔انٹرویو کے کمرے میں دیکھا کہ تین ماہرین میں ایک اس کی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔جاوید کی ہمت بندھی۔بلکہ اسے نصف یقین ہوگیا کہ یہاں تو اس کا انتخاب ضرور ہوگا۔دو ماہرین نے پی ایچ ڈی کے مقالے پر سوالات کئے۔استاد نے کہا ''ارے تم تو ایک جگہ کالج میں ہو ہی یہاں کس لیے چلے آئے۔کیا وہاں کوئی دقت ہے؟''

''نہیں سر یہ جگہ ہمارے وطن سے قریب بھی ہے اور یہاں آس پاس کئی یونیورسٹیاں ہیں جہاں اردو کے شعبے ہیں مستقبل میں کوشش کرتے رہیں گے۔'' جاوید نے

جواب دیا۔

''ارے وہاں تم برسوں سے رہ رہے ہو۔ یہاں نئی جگہ میں دوبارہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔'' استاد نے سمجھایا۔

اس کا کوئی جواب دیتا کہ ایک پروفیسر نے کہا اچھا ٹھیک ہے آپ جایئے۔

جس استاد پروفیسر نے کہا تھا کہ تم یہاں خواہ مخواہ آنا چاہتے ہو اس کی اپنے شعبے کے جس پروفیسر سے پرانی دشمنی تھی اس سے جاوید کے مراسم تھے، انٹرویو کے ماہر پروفیسر کو اس کی خبر تھی۔ یونیورسٹی میں تو یہ حالت تھی کہ ایک کے ریسرچ اسٹوڈنٹ کو دوسرا دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا اور یہاں کالج کمیشن کے انٹرویو میں تو ان کی حیثیت تین ماہرین میں سے سینئر ماہر کی تھی۔ تو انھوں نے اپنی ماہریت دوران انٹرویو ہی دکھا دی۔ بجائے سوال کرنے کے نصیحت پر نصیحت کرتے رہے۔ دراصل ان میں مقالے کے موضوع پر سوال کرنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ وہ تو خود ارباب حل وعقد کا حقہ پانی کر کے پروفیسر ہوئے تھے۔ بنا خوشیا برادری کے بھلا وہ کسی اور کا انتخاب کیوں کرتے۔ جو خوشامد کر کے آتا ہے۔ خوشامد کرنے والے کو لاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں بھی جاوید کا انتخاب نہ ہوا۔ ایسے موقع پر اس کی عجیب حالت ہو جاتی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ کہیں اور کسی بھی یونیورسٹی میں اس کا تقرر ہو جائے تا کہ اس شہر سنگ سے وہ نکل جائے مگر انٹرویو کا نتیجہ اسے پھر اسی شہر میں کھینچ لاتا۔ دیوار پھر سے موٹی ہو جاتی۔ اس کے دل کا بوجھ دل پر ہی رہ جاتا اور اس بوجھ کو لئے لئے وہ اگلے انٹرویو کا انتظار کرتا رہتا۔

دکن کی مرکزی یونیورسٹی میں ریڈر کے انٹرویو کیلئے گیا۔ ایک دن پہلے پہنچا تھا۔ شہر سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر یونیورسٹی تھی انٹرویو کے دن پوچھ پوچھ کر جانا پڑے گا اس لیے بہتر ہے کہ ایک دن پہلے جا کر یونیورسٹی کو دیکھ لیا جائے۔ وہ یونیورسٹی میں پہنچا۔ معلوم ہوا گیسٹ ہاؤس میں انٹرویو ہوگا۔ وہ جب گیسٹ ہاؤس کے کلرک سے بات کر رہا تھا تو اس کی نظر سامنے کے دوسرے گیسٹ ہاؤس پر پڑی۔ دیکھا کہ ایک

پروفیسر صاحب گیسٹ ہاؤس کے لان کی طرف جارہے ہیں۔ پروفیسر صاحب پونے کے ایک تحقیقی ادارے میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ جاوید نے سلام کیا۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ پوچھا یہاں کیسے؟

''انٹرویو کیلئے آیا ہوں۔''

''وہ تو کل ہے۔''

''جی ہاں ذرا میں جائے وقوع دیکھنے آ گیا۔''

اچھا اچھا یہ کہتے ہوئے پروفیسر آگے بڑھ گئے۔ جاوید کو کچھ اور بھی پوچھنا تھا مگر وہ چلتے ہی گئے اور مزید کچھ کہے بغیر سامنے کے کمرے میں سٹک گئے۔ دوسرے دن انٹرویو میں پھر سامنا ہوا۔ وہاں دوسرے ماہر سبجیکٹ بھی جانے پہچانے نکلے۔ وہ جاوید کی یونیورسٹی میں کئی بار آئے تھے۔ سیمینار اور ریفریشر کورس میں بحیثیت رسورس پرسن کے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ آج کا ماحول خوشگوار ہے۔ ایک اکسپرٹ ہندی کے تھے معلوم نہیں انھیں کیوں بلایا گیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ آبزرور کی حیثیت سے آئے ہوں۔ تیسرے ماہر کون تھے پتہ نہیں۔ وائس چانسلر کے تعارفی سوالات کے بعد ہندی کے اکسپرٹ نے کہا کہ'' آپ کا وطن کہیں ہے نوکری کہیں ہے اور اب آپ پھر ہندوستان کے تیسرے کونے میں آنا چاہتے ہیں؟''

''جی سر ایک بار وطن سے باہر نکل گئے تو جگہ کی کیا قید کہیں بھی جا سکتے ہیں۔'' جاوید نے جواب دیا۔

ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر پروفیسر اکسپرٹ سے جاوید کو بڑی امیدیں تھیں۔ کیونکہ ان کے ساتھ اس نے کئی پروگرام کئے تھے۔ ان کے سیمینار میں مقالہ پیش کیا تھا۔ ان کے ادارے میں اکثر ان سے ملنے جاتا تھا۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ جاوید کی فیلڈ کیا ہے پی ایچ ڈی کس موضوع پر ہے۔ یہ تو خیر درخواست میں بھی مرقوم تھا۔ لیکن جب انھوں نے سوال کئے تو جاوید کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ خصوصی مطالعے پر کئے گئے سوال کے جواب جاوید دیتا رہا اور پروفیسر صاحب ہر جواب کی تردید کرتے رہے۔ جاوید اپنے جواب

اور ریفرینس پر قائم رہا۔ انھوں نے دیکھا کہ خصوصی مطالعے میں یہ اپنے ریفرینس سے ہٹنے کو تیار نہیں تو انھوں نے پینترا بدلا اور چلے گئے دکنی ادب کے دورِ قدیم کی شاعری میں اور پوچھنے لگے فلاں صنف کی پہلی کتاب بتایئے اندازاً جاوید نے بتایا جو کہ غلط تھا۔ دوسرے ماہر جو سیمینار اور ریفریشر کورس کے شناسا تھے جیسے ہی خصوصی مطالعہ اور پی ایچ ڈی گائیڈ کے حوالے سے ایک سوال کرنے لگے مگر اس سے پہلے کہ وہ سوال مکمل کرتے ڈائریکٹر پروفیسر ماہر نے انھیں لپک لیا اور کہا اچھا اچھا ٹھیک ہے آپ جایئے۔

''سر ان کا سوال تو سن لینے دیجئے۔'' جاوید نے درخواست کی۔

''نہیں کوئی بات نہیں آپ جایئے۔'' ڈائریکٹر پروفیسر ماہر نے کہا۔

دوسرے ماہر جو سوال کر رہے تھے اس کا جواب جاوید کے پاس بھرپور تھا اور بڑے اطمینان سے وہ اس کا جواب دیتا۔ شاید اس کا اندازہ ڈائریکٹر ماہر کو ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے انھیں سوال بھی پورا کرنے نہیں دیا اور جاوید سے ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہہ کر جانے کو کہا۔

جاوید کو بھی ماہر جی کے ٹھیک ہے ٹھیک ہے کا راز سمجھ میں آ گیا مگر انٹرویو کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ پڑا اور اپنی کتابوں اور رسالوں کو ہاتھوں میں سمیٹ کر باہر آ گیا۔ دوسرے امیدوار کا نام پکارا گیا۔ ایک لمبا سا قوی ہیکل شخص اس کلرک سے تھوڑی دوری پر کھڑا مسکرا رہا تھا جو امیدواروں کا نام پکارتا تھا۔ نیا امیدوار انٹرویو روم میں داخل ہو چکا تو قوی ہیکل امیدوار نے جاوید اور آس پاس کے تمام امیدواروں کو سناتے ہوا کہا بھئی سب کچھ SET ہے۔ کس کا ہو گا طے ہے۔ میں تو بس یونہی آ گیا ہوں۔ میرا تو ہونا ہے نہیں۔ آپ لوگ قسمت آزما لیجئے۔ انٹرویو دے کر جاوید پونے واپس آ گیا۔ جاوید کالج جا رہا تھا۔ ایک دن وہی ڈائریکٹر پروفیسر ماہر اپنے تحقیقی ادارے کی طرف جاتے ہوئے اس کو نظر آئے۔ اسے اب بھی امید تھی کہ اس کا نام بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے بڑی خاکساری سے پوچھا۔

''سر کس کا ہوا آپ تو جانتے ہونگے؟''

''نہیں بھئی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھ سے تحریری طور پر قسم لی گئی ہے کہ ایک مہینہ کے پہلے اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔''

''سر کچھ اشارہ تو دیجئے لوکل کا ہوا یا باہر والوں کا۔''

''کہا نہ قسم لی گئی ہے۔''

آخر کار انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا'' جاوید نے ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں دیکھا جس سے اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ہوتی۔ لیکن ڈائرکٹر کے پرانے دن آج اسے یاد آ گئے۔ ڈائرکٹر شپ جوائن کرنے کے بعد انھیں ایسا لگا جیسے وہ واقعی باضابطہ ڈائرکٹر ہوں جبکہ انھیں ایک متعینہ رقم پہ متعین کیا گیا تھا۔ جوائن کرتے ہی اپنا تام جھام دکھانے لگے۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دراصل لائبریری میں کھولا گیا تھا۔ وہاں الگ سے کوئی ڈائرکٹر کا کیبن اور چپراسی وغیرہ نہیں تھا۔ لائبریری کے کمرے تھے اور اسکے چپراسی۔ میاں ڈائرکٹر انہیں ہی استعمال کرنے لگے۔ لیکن ابتک وہ کیمپس کے گیسٹ ہاؤس میں قیام فرماتے تھے۔ ہفتے میں دو دن کے لئے بمبئی سے آتے تھے اور گیسٹ ہاؤس میں آرام کرکے ضروری کاغذات پر دستخط وغیرہ کے بعد پھر بمبئی لوٹ جاتے تھے۔ کیمپس کے صدر کو جب انکی عیش پرستی کا علم ہوا تو انہوں نے کیمپس کے کلرک سے کہہ دیا کہ اب جب ڈائرکٹر گیسٹ ہاؤس مانگے تو بالکل مت دینا۔ کہنا اسٹوڈنٹ کے ہوسٹل میں جہاں جگہ خالی ہو ٹھہر جائے۔ اور کوئی بھی کلرک اسکا کوئی کام نہ کرے۔ ایک دن کسی کام سے جاوید آدم کیمپس کے دفتر میں گیا تو دیکھا ڈائرکٹر صاحب دفتر کے باہر پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں۔

''کیا سر کیا ہوا؟ یہاں پر کیوں کھڑے ہیں؟

''ارے بھئی میں بمبئی سے آ رہا ہوں۔ کہاں ٹھہروں۔ یہ لوگ کچھ بتا نہیں رہے ہیں؟

''دفتر میں پوچھئے۔''

''پوچھا تو کہتے ہیں ہوسٹل میں کوئی کمرا دیکھئے۔''

''یہ تو غلط بات ہے۔ آپ ڈائرکٹر ہیں۔ آپ کو تو وی آئی پی گیسٹ ہاؤس میں

ٹھہرنا چاہئے۔''

''ہاں پہلے وہیں ٹھہرتا تھا اب کہتے ہیں ہوسٹل میں رکئے۔''

جاوید کی کلاس تھی۔اس نے کہا میں اپنے کالج جار ہا ہوں۔ایک کام سے آیا تھا۔

''ارے رکئے رکئے۔آپ سے ملاقات ہی کہاں ہوتی ہے۔''

جاوید نے دیکھا کہ یہاں پر کوئی انہیں لفٹ نہیں دے رہا ہے۔حتی کہ کلکرک تک اور جو کلرک چابی دیگا ابھی موجود نہیں ہے۔اسلئے وقت گزاری کے لئے مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد کلرک آیا اور انھیں ہوسٹل روم کی چابی دی گئی۔

جب تک وہ ڈائرکٹر رہے غالباً تین چار سال ان کی نگرانی میں مختلف سیمینار اور پروگرام ہوتے رہے۔جاوید سے بارہا انہوں نے کہا کہ پیپر پیش کرے اور ان پروگراموں میں حصہ لے۔سیمینار کے بعد بارہا ایک ساتھ لنچ بھی کیا۔اور تبادلہ خیال بھی۔مگر آج انہوں نے چپ رہنے کا روزہ رکھ لیا۔حیدرآباد میں قسم کھالی۔انجان بن گئے۔ایسا لگا جیسے جاوید سے آج وہ پہلی بار مل رہے ہوں۔ایک بار پھر انٹرویو نے اس کو دے پٹخا تھا۔اس نے پھر اخباروں میں اشتہار ڈھونڈنا شروع کردیا۔

انٹرویو دیتے دیتے اپنے کالج میں وہ مشہور ہو گیا تھا۔اس کی شکل بھی انٹرویو کی ہوگئی تھی۔ساتھی اسے دیکھ کر آپس میں گفتگو کرتے وہ دیکھو انٹرویو والا پروفیسر آرہا ہے۔ایسے لگا ہوا ہے جیسے یونیورسٹی میں پروفیسر بن کے رہے گا۔جاوید کو احساس ہو جاتا کہ یہ لوگ کس کا ذکر کررہے ہیں۔اس کالج میں اب وہ مذاق کی چیز بن گیا تھا۔کالج کے کئی پروفیسر جان بوجھ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔اس پر طنز کرتے۔کوئی کہتا ارے اس کو آتا جاتا کچھ ہے نہیں خواہ مخواہ اپلائی کرتا ہے اور انٹرویو میں جاتا رہتا ہے۔

''ہاں یار یہ بے مطلب اپنے پیسے برباد کررہا ہے۔''

''ارے اس کو اگر کچھ آتا ہوتا تو اس کا اسی یونیورسٹی میں نہ ہو گیا ہوتا جہاں سے آیا ہے۔''

''ہاں تم برابر بولے۔''

''ہاں کسی نے وہاں پوچھا نہیں منہ نہیں لگایا تو یہاں آ کر پناہ ملی۔''

''ہاں اوپر سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے کہ بہت بڑا انٹلیکچول ہے اور بہت بڑا رئیس ہے۔''

''ارے کچھ نہیں ہے خالی پیلی بوم مارتا ہے آیئے جایئے آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ جیسے لگتا ہے واجد علی شاہ کا پوتا ہے۔''

''ہاں لکھنو سے سیدھے ادھر آیا ہے پہلے آپ پہلے آپ۔''

''ہاہاہاہی ہی ہی ہاہاہا۔''

اس قسم کے طعنے تشنے اور جملے سن کر اس کا دل پاش پاش ہونے لگتا۔ یہ لوگ غلط کہاں کہہ رہے ہیں۔ اگر مجھے کچھ آتا تو کسی انٹرویو میں اب تک ضرور سلیکٹ ہو گیا ہوتا۔ شاید واقعی مجھے کچھ نہیں آتا۔ ایسے وقت پر اس کو اپنے علم پر جہالت اور اپنے یقین پر شک ہونے لگتا۔ وہ کمزور پڑ جاتا۔ چھوڑو بھی کچھ ہوتا تو ہے نہیں۔ اب اپلائی ہی نہیں کریں گے۔ لیکن نہ جانے کہاں سے اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آتی ایسا نہیں ہے تم ہمت مت ہارو، کوشش کرتے رہو انشا اللہ ایک نہ ایک دن ضرور کچھ ہوگا۔ خدا پر بھروسہ رکھو جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔

ایک رات وہ اپنے بے بسی، تنہائی، بے یاری اور بے قدری پر رونے لگا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر خود سے کہنے لگا۔ اے اتنی بڑی کائنات کے مالک تو کہاں ہے ارے تم اتنی بڑی دنیا کے مالک ہو کسی ایک شخص کو تو میرا ہمدرد بنایا ہوتا۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک کوئی ایک بھی میرا نہیں ہے۔ تم خود کو اتنا عظیم اور اکبر بتاتے ہو پھر مجھے تنہا کیوں رکھا۔ اتنی وسیع کائنات میں میرا ایک بھی غم خوار نہیں ہے۔ یوں تو سب سے بڑا غم خوار تو ہے پھر بھی دنیا میں آدمی آدمی کا سہارا تو ہوتا ہی ہے ایک ہمدرد تو دیا ہوتا۔ پروردگار تو کہاں ہے کس آسمان پر بیٹھا ہے۔ اے مشکل کشا مجھے میری کوششوں میں کامیاب کر دے۔ میرا کوئی نہیں ہے مالک میرا کوئی نہیں ہے۔ خود روتا خود ہی اپنے آپ کو تسلی دیتا۔ اپنے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے

خود ہی پونچھتا اور بار بار بے سہارا کی طرح آسمان کی طرف نظریں اٹھاتا۔ جتنی بار نظریں اوپر اٹھاتا اس کی آنکھیں بھر آتیں پھر ہاتھوں سے پونچھتا۔ ہچکیاں آنے لگیں۔ اس نے آس پاس دیکھا کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اپنے دل پر اپنا ہاتھ ہمدردی کیلئے رکھا۔ خود کو خود ہی سہارا دیا۔ کیوں روتے ہو۔ کیا ہوگا رونے سے۔ شاید تمہاری قسمت میں ناکامی ہی لکھی ہے۔ تم کوشش ہی کر سکتے ہو قسمت تو نہیں بدل سکتے۔ خود کو سمجھاتے ہوئے وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

کالج والے میرا مذاق اس لئے اڑاتے ہیں کہ انھیں میری درخواست کرنے اور انٹرویو کا نتیجہ معلوم ہو جاتا ہے۔ آئندہ سے اب کسی کو درخواست کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔ کہیں تقرر ہوتا نہیں اور دھوم سارے شہر میں۔ نہیں بتانے سے کم از کم یہ تو ہوگا کہ ناکامی کی اطلاع اپنے تک ہی رہے گی۔ اس نے طے کیا کہ اگلی درخواست خاموشی سے کرے گا۔ پہلے بھی درخواست خاموشی سے ہی دی تھی لیکن دفتر سے خبر باہر پھیل جاتی تھی۔

ایک دن اپنے گھر پر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کا ٹرانسفر پونے کے اسکول میں ہو گیا تھا۔ اب دونوں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ بیوی نے کہا اگر تمہارا کسی یونیورسٹی میں ہو جاتا ہے تنخواہ میں کتنا فرق پڑے گا۔

''یہی کوئی ڈیڑھ دو ہزار۔'' جاوید نے کہا۔

''بس اسی کیلئے تم مہینے دو مہینے میں سینکڑوں ژیراکس کیا کرتے ہو۔ ارے چھوڑو ایسے انٹرویو کو اور آرام سے رہو اپنے گھر۔ ڈیڑھ دو ہزار نہ ملنے سے ہم بھوکے نہیں مریں گے۔ مگر انٹرویو اور اس کے فالتو نتیجہ سے تم بیمار ضرور پڑ جاؤ گے۔''

یہ ایک اور مسئلہ ہو گیا۔ کالج میں بدنام تو تھے ہی گھر میں بھی مشہور ہو گئے۔ بہتر یہی ہوگا کہ درخواست کی اطلاع نہ کالج میں نہ ہی گھر میں۔ اس کام کو نہایت خاموشی سے انجام دینا ہوگا۔ اتفاقاً گھر والے دیکھ لیں تو دیکھ لیں مگر پوشیدگی اب ہر قیمت پر لازم ہے۔ اس کے بعد جاوید اخبار کا مطالعہ کرتا اسامی کا اشتہار نظر بھی آتا تو بیگم سے ذکر نہیں کرتا۔ وہ

اخبار میں موٹی موٹی خبریں پڑھ لیا کرتی تھی۔ اشتہار وغیرہ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آخر کار ایک دن یونیوسٹی کی اسامی اخبار میں نظر آئی۔ پروفیسر کیلئے درخواست طلب کی گئی تھی۔ جاوید نے نہایت خاموشی سے درخواست تیار کی اور فی نفسہٖ چھ گھنٹے بس کا سفر کر کے درخواست اس یونیورسٹی میں جمع کرآیا۔ اسی دن وہاں امتحان کا پیپر بھی سیٹ کر دیا۔ اس بار اس نے فارم بالکل خاموشی سے بھرا۔ کالج والوں نے یوں بھی اس کا تماشا بنا رکھا تھا اس لیے اس نے فیصلہ کرلیا کہ کسی کو بھی درخواست دہانی کے متعلق نہیں بتائے گا۔ حتٰی کہ اس نے اپنے گھر میں بھی بیگم اور بھائی کو نہیں بتایا۔ درخواست پوسٹ سے نہیں بھیجا۔ ڈاک والے بھی ڈیلیوری میں دیر کر دیتے ہیں۔ ایک دن بھی تاخیر ہونے سے فارم رد کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کسی قسم کا رسک لیے بغیر وہ فارم کو بذات خود اورنگ آباد جا کر اس یونیورسٹی کے رسیونگ کلرک کے ہاتھ میں دیا۔ اس سے رسیونگ رسید لے لیا تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔

وہ کال لیٹر کا انتظار کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ بھول گیا۔ چھ مہینے بعد اسے کال لیٹر ملا۔ ایک دن کالج سے دو بجے دن میں تھکا ماندہ اپنے فلیٹ پہنچا۔ جیسے ہی جوتے کا تسمہ کھولنے بیٹھا اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا اگر آپ مجھے کچھ دیں گے تو میں آپ کو ایک خوشخبری سناؤں گی۔ اس نے سوچا خوشخبری کیا ہو سکتی ہے۔ کہیں سے کسی نے کسی کی شادی وغیرہ کی خبر دی ہوگی۔

"ہاں بھئی دے دیں گے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟" جاوید نے کہا۔

"آپ کا انٹرویو لیٹر آیا ہے۔" بیوی نے بتایا۔

وہ سوچنے لگا کہاں سے ہو سکتا ہے کہاں کہاں درخواست دی تھی کہیں دور دراز کی یونیورسٹی کا ہوگا۔

"کہاں کا ہے؟"

"اورنگ آباد کا ہے۔"

وہ چونکا۔ اسے اورنگ آباد بالکل یاد نہیں تھا۔ پھر یاد آیا ہاں۔ وہاں بھی تو

درخواست دی تھی۔ لیکن یہاں کیا ہوگا۔ جب بڑی بڑی یونیورسٹی کے انٹرویو میں کچھ نہیں ہوا تو یہاں کیا امید ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کال لیٹر پروفیسر کا ہے۔ پلس پوائنٹ یہی ہے۔ اب تک زیادہ سے زیادہ ریڈر کا انٹرویو دیا ہے۔ پروفیسر کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ سنہرا موقع ہے۔ کہیں یہ نہ کھو جائے اور اگر کامیابی ملی تو ماضی کی تمام محنتیں راس آ جائینگی۔ اس لیے اس انٹرویو کیلئے پوری تیاری کرنی چاہیے۔ اس نے اسی وقت ذہن میں خاکہ بنایا کہ مطالعہ کہاں سے اور کس کس موضوع کا کرنا چاہیے۔ متعلقہ موضوع کی جو جو کتاب شیلف میں نظر آئی اسے نکال کر بستر پر رکھتا گیا۔ روز کوئی نہ کوئی کتاب دکھائی دے جاتی اور اسے بستر پر ڈال دیتا۔ اس کا بستر اسٹڈی ٹیبل تھا۔ بستر پر لیٹ کر پڑھنے کی عادت تھی۔ پورے ایک مہینہ دن رات اس نے انٹرویو کی تیاری کی۔ وہاں سے رات کے دس بجے ایک ٹرین اورنگ آباد جاتی تھی۔ دو بیگ میں کتابیں بھریں تیسرے میں کپڑے رکھے۔ ریزرویشن نہیں ملا۔ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اسٹیشن پہنچا۔ جنرل بوگی کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ میں کسی طرح کھڑا ہو گیا۔ بیگ کو ادھر ادھر رکھا۔ بھائی پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اس نے سوچا کہ پوری رات یونہی کھڑے کھڑے اورنگ آباد جانا پڑے گا۔ ٹرین اسٹارٹ ہوئی۔ بھائی نے گڈ لک کہا۔ آہستہ آہستہ ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔

آسمان پر چاند روشن تھا۔ دور دور کھیتوں، پہاڑوں اور مکانوں کا سلسلہ تھا۔ آسمان کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا۔ وہ جسے خدا کہتے ہیں وہ انھیں آسمانوں میں کہیں رہتا ہے۔ اس بار پتہ نہیں کیا ہوگا۔ اتنی بڑی دنیا میں اپنا تو کوئی ہے نہیں۔ وہ جسے خدا کہتے ہیں بے سہاروں کا سہارا اور محتاجوں کا مددگار ملجا اور ماوی کہلاتا ہے مجھے کوئی ہمدرد، دوست، غم خوار اور مہربان نہیں دیا۔ مجھے تو کوئی جانتا بھی نہیں۔ کون اکسپرٹ ہوگا۔ سلیکشن کمیٹی میں اور کون لوگ ہوں گے۔ خدا ہی جانتا ہے۔ اس طرح کب تک انٹرویو دیتے رہیں گے۔ جب تک کوئی اکسپرٹ شناسا نہیں ہوگا میرا تقرر نہیں ہو پائے گا۔ لیکن اکسپرٹ سے میری جان پہچان کیسے ہو پائے گی۔ اور یہ انٹرویو تو پرسوں ہے بھلا اس مختصر مدت میں کس سے کیسے جان

پہچان ہو پائیگی ۔اور کوئی اکسپرٹ میرا ہمدرد ہو جائے گا اس کا کیا گارینٹی ہے۔پھر کیا کریں۔کرنا کیا ہے وہ جو آسمانوں میں بیٹھا ہے اسی کی امید پر چلتے ہیں۔شاید اس بار اسکی رحمت ہم پر نازل ہو جائے۔اے بے سہاروں کا سہارا اے یتیموں کا نگہبان، پاسبان اور محافظ ہم جیسے کیڑے مکوڑوں پر رحم کر رب العالمین۔ہم جیسے بے یار و مددگار کہاں جائیں گے پروردگار! ہم سوائے اپنی ٹوٹی پھوٹی کوشش کے اور کیا کر سکتے ہیں اے قادر مطلق۔ ہمارا کوئی نہیں اے رب العزت۔ مجھے کامیاب کر دے اے کمزوروں نامرادوں کے مالک ۔آسمان کو دیکھ کر وہ اپنے دل میں دعا کرتا رہا۔ایسا لگا کہ اسے ہچکیاں لگ جائیں گی لیکن وہ ضبط کرتا رہا۔آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف جسم سے جسم لگا کر لوگ کھڑے تھے۔ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔رومال سے آنسو پونچھا اور باہر کے اندھیرے اجالے کو دیکھتا رہا۔ٹرین تیزی سے اپنی منزل کی طرف بھاگتی جا رہی تھی۔وہ اداس اداس انٹرویو کے بارے میں سوچتا رہا۔پتہ نہیں کیسا کیسا سوال پوچھا جائے گا۔اپنا تو کوئی ہے نہیں پھر کیا کر سکتے ہیں۔یہی کر سکتے ہیں کہ جو کچھ اچھا برا آتا ہے اسے اعتماد کے ساتھ کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے۔ظاہر ہے اپنا تو ہوگا نہیں۔وہیں لوکل کے امیدوار ہوں گے ۔ہوسکتا ہے ان لوگوں نے پہلے سے SET کر لیا ہو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔اس حالت میں اپنی کوشش یہی ہوگی کہ سوال کے جواب تشفی بخش اور فصاحت وقطعیت کے ساتھ دیے جائیں۔باقی خدا پر چھوڑ دیا جائے۔کوشش کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔دیکھتے ہیں اب کی بار قسمت میں کیا لکھا ہے۔وہ پھر سے ادب کی دنیا میں کھو گیا۔کھڑے کھڑے جب ٹانگیں درد کرنے لگیں تو وہیں پر بیٹھ گیا۔بیٹھے بیٹھے سو گیا۔پھر جاگ گیا۔بیگ کو دیکھتا رہا کہیں چوری نہ ہو جائے۔۔چور کو اردو کی کتابوں سے کیا ملے گا۔کسی نے کہا اورنگ آباد آنے والا ہے۔صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ٹرین اسٹیشن پر رک گئی۔اسٹیشن سے باہر آیا ۔آٹو رکشا سے اس ہوٹل میں پہنچا۔جس کے بارے میں کالج کے ایک کلرک نے اسے بتایا تھا۔ضروری خانہ پری کر کے وہ ہوٹل کے کمرے میں پہنچا۔رات کا تھکا ہوا تھا۔لباس تبدیل

کر کے فوراً سو گیا۔ بارہ بجے اُٹھا۔ مُنہ ہاتھ دھویا۔ غُسل کیا۔ کھانا کھایا اور پڑھنے کو بیٹھ گیا۔ شام تک پڑھتا رہا۔ نیچے گراؤنڈ فلور پر جا کر چائے پی۔ واپس آ کر پھر پڑھنے لگا۔ آٹھ بجے رات میں نیچے اترا۔ ایک کیلومیٹر پر ایک ہوٹل تھا۔ پیدل گیا، کھانا کھا کر آیا۔ پھر پڑھنے بیٹھ گیا۔ رات کے تین بجے تک پڑھتا رہا۔ سو گیا، سات بجے اٹھ گیا۔ نو بجے تک تیار ہو گیا۔ ناشتہ نہیں کیا سوچا انٹرویو کے بعد کریں گے۔ دس بجے یونیورسٹی رکشا سے پہنچ گیا ۔ بتایا گیا یونیورسٹی کے مہاتما پھلے ہال میں جایئے۔ جہاں سرٹیفکیٹس چیک ہونگی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا دو امیدوار پہلے سے موجود تھے۔ اور دونوں سے پہلے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ دونوں وہیں کے تھے اور دونوں کالج میں ملازم تھے۔ ایک مرد دوسری عورت۔ مرد میاں کافی تجربہ کار تھے جسے دیکھتے ہی یہ خیال آیا کہ ہونا تو اسی آدمی کا ہے۔ یہ پرانا بڈھا ہے ایکسپرٹ تو تمام اس کے جاننے والے ہی ہونگے اب اپنا پتا صاف ہے۔ اس کے رہتے ہوئے تو کوئی چانس نہیں۔ اب کیا کریں۔ پھر خیال آیا جب یہاں تک آ گئے ہیں تو انٹرویو تو دینا ہی ہے۔ چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ خدا کا نام لے کر دے دیں گے اور اپنی پیشکش کو زیادہ سے زیادہ CONVINCING اور اطمینان بخش بنائیں گے۔ انشاء اللہ۔ سوال کا جواب مکمل، حوالوں کے ساتھ اور پورے اعتماد کے ساتھ دیئے جائیں۔ یہی کر سکتے ہیں۔ اپنے پاس اللہ کے علاوہ اور کوئی حربہ ذریعہ اور سفارش نہیں ہے۔ بیٹھے بیٹھے وہ یہی سوچتا رہا۔ بقیہ چار امیدوار بھی اپنے اپنے بیگ کے ساتھ آس پاس ایک ہی بینچ پر بیٹھے تھے۔ سرٹیفکیٹس تو پہلے چیک ہو چکی تھیں۔ سب سے پہلے محترمہ کو بلایا گیا۔ وہ بڑی آن بان کے ساتھ کمیٹی روم میں گئیں اور دس منٹ میں واپس آ گئیں۔ دوسرے نمبر پر بڈھے بزرگ گئے، دس منٹ میں وہ بھی آ گئے۔ پھر جاوید کو بلایا گیا اور آخر میں چوتھے بزرگ، چوتھے بزرگ بھی دس منٹ میں آ گئے۔ جاوید کا انٹرویو چالیس منٹ تک ہوا۔ جاوید اپنے انٹرویو کے پہلے سوچ رہا تھا کہ ہوگا تو یہی بزرگ امیدوار کا۔ ان کے رہتے ہوئے میرا تو کوئی چانس نہیں ہے۔ اب جب یہاں تک آ گئے ہیں تو انٹرویو تو دے ہی لیں۔ پہلا امیدوار انٹرویو دے رہا تھا۔ بینچ پر جاوید

اور دونوں بزرگ امیدوار بھی بیٹھے تھے۔ کل تین۔ تینوں کے سامنے اپنے اپنے بیگ سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ ایک بزرگ امیدوار نے جاوید سے کہا آپ کا بیگ تو بھرا بھرا نظر آرہا ہے۔ ذرا ہمیں بھی دکھایئے کیا کیا لائے ہیں۔

جاوید نے کہا ایسا کچھ نہیں اس میں خرافات بھری ہیں، غیر ضروری اشیاء ہیں۔ چالیس منٹ کے بعد جاوید باہر آیا تو انھیں صاحب نے کہا ارے آپ کو آنے میں کافی دیر ہوگئی۔ جاوید نے بتایا ہاں بحث لمبی ہوگئی اس لیے۔ اب جب جاوید نے انٹرویو دے دیا تھا تو نہ جانے کیوں اسے اپنے بارے میں ذراسی امید ہونے لگی۔ یعنی پہلے جو مکمل ناامیدی تھی اب اس میں تخفیف ہونے لگی۔ کیونکہ انٹرویو کے بعد اس کا دل خوش تھا۔ چہرے پر اعتماد کے جلوے تھے اور ناامیدی کی جگہ امید لیتی جارہی تھی۔ چوتھے صاحب اندر گئے اور دس منٹ میں باہر آگئے۔ حواس باختہ اور ہونٹوں سے کچھ بدبداتے ہوئے۔ جاوید نے ان سے کہا کیسا رہا۔ کہا بس ہوگیا، دیکھئے جناب ایک ہی طرح کا سوال کرتے ہیں۔ یہ کوئی قائدہ ہے؟ جاوید نے پوچھا کیا پوچھا؟ ''ارے چھوڑئے کہنا فضول ہے۔''

جاوید نے دیکھا کہ انٹرویو ختم ہوگیا ہے۔ بہتر ہے ہوٹل چلتے ہیں۔ وہاں سے بس اسٹینڈ۔ چاروں امیدوار بات کرتے ہوئے فرسٹ فلور سے نیچے آئے۔ محترمہ نے کہا آپ لوگ کدھر جائیں گے۔ جاوید نے کہا مجھے تو ہوٹل جانا ہے۔ وہ بولیں آپ بھی کار میں آجایئے۔ آپ کو ہوٹل چھوڑتے ہوئے ہم لوگ آگے چلے جائیں گے۔ جاوید کار میں بیٹھ گیا۔ کار چلنے لگی۔ بزرگ امیدوار نے جاوید سے کہا۔

''آپ کے کالج کا نام کیا ہے۔''

''بحرالاسلام کالج۔''

''اچھا اچھا وہی مائناریٹی والا کالج میں جانتا ہوں۔ یونہی ہے۔'' انھوں نے بڑی حقارت سے کہا جیسے ادنیٰ سے کالج سے تمہاری تشریف آرہی ہے۔ اس لئے تم بھی کوئی خاص چیز نہیں ہو۔

''نہیں اب وہ تو ایک اچھا خاصا کالج بن گیا ہے۔ شہر میں نام ہے اس کا۔''
جاوید نے کہا۔

انھوں نے چہرے پر شکن لا کر کہا۔ ''ارے میاں چپ رہئے مجھے خوب معلوم ہے۔ آپ اور آپ کا کالج۔''

ان کے چہرے پر شکن گہری ہوگئی۔ وہ غصہ ہوگئے۔ جاوید کو ایسا لگا کہ اگر ان سے اس کالج کے موضوع پر مزید گفتگو ہوئی تو یہ آگ بگولہ ہو جائیں گے۔ یہی نہیں ان کو کالج سے چڑ ہے یا مجھ سے بغض اور یہ کوئی چڑ کا موقع ہے۔ سب انٹرویو دینے آئے ہیں۔ اپنے اپنے گھر کو لوٹ رہے ہیں تو انھیں غصہ کیوں آ گیا۔ چلئے وہ کالج یونہی ہے اس میں اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جاوید کا انٹرویو چالیس منٹ تک ہوا تھا۔ ان کا دس منٹ شاید وہاں کا بخار تو نہیں ہے۔ مصلحت یہی ہے کہ خاموش ہو لیا جائے۔ اور وہ بالکل چپ ہوگیا۔ اسے کالج کے ایک پروفیسر کی بات یاد آئی۔ ارے جاوید صاحب یہ کالج کیسے کیسے دور سے گذرا ہے آپ کو کیا معلوم۔ کیسے کیسے لوگ یہاں آئے اور چلے گئے۔ یہاں سے جو بھی لوٹ کر گیا اچھے عہدوں پر گیا۔ کوئی بمبئ فلم انڈسٹری میں گیا۔ کوئی یونیورسٹی میں ریڈر بنا۔ یہی نہیں بلکہ یہاں کا کلرک یونیورسٹی میں لکچرر ہوگیا۔

''وہ کون صاحب تھے۔'' جاوید نے پوچھا۔

''بھئی وہ حیدرآباد کے ایک صاحب تھے، ان کا نام حمید بیزار تھا۔''

کار میں بیٹھے ہوئے جاوید کو ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ کار چلتی رہی۔ ہوٹل آ گیا تھا۔ کار سے اتر کر جاوید نے تینوں کا شکریہ ادا کیا اور ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں چیک آوٹ کر کے آٹو رکشا سے بس اسٹینڈ پہنچا۔ بس کھڑی تھی۔ اندر جا کر سیٹ لی۔ پانچ منٹ بعد ہی بس روڈ پر بھاگنے لگی۔ اس وقت دن کے تین بجے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ کتنا بہتر ہوتا اگر اس کا تقرر یہاں ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کالج کے حبس زدہ ماحول سے نجات مل جاتی۔ وہ خواب کہ ''یونیورسٹی کا استاذ'' پورا ہو جاتا۔ یونیورسٹی میں کام

کرنے والے کہا کرتے تھے اچھا تو آپ کالج میں ہیں اور وہ بھی مائناریٹی کالج جیسے وہ ہم پر اظہار افسوس کر رہے ہوں۔ گویا کہاں بیل گاڑی اور کہاں موٹر گاڑی۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ بس شہر کے اسٹینڈ پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں سے آدھے گھنٹے میں وہ اپنے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ سفری بیگ سے کپڑے نکالے۔ تبدیل کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بیوی جو کہیں گئی تھی واپس آئی تو دیکھا میاں خاموش لیٹے ہوئے ہیں۔ اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبہ میں کہا۔

''اچھا آپ آگئے، کہئے کیسا رہا، سب خیریت تو ہے۔ پروفیسر بن رہے ہیں کہ نہیں؟''

''ارے بھئی میرا کام انٹرویو دینا تھا۔ وہ دے دیا، اب فیصلہ سلیکشن کمیٹی کے ہاتھ میں ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے پر آپ کو اندازہ تو ہوا ہوگا۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے، امید تو ہے۔ دیکھو خدا کو کیا منظور ہے۔''

''ارے میں کہتی ہوں نا آپ ہی کا ہوگا۔''

''اتنا یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''میں جانتی ہوں نا۔ میرا دل کہتا ہے اور آپ نے جیسا فون پر بتایا اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہی کا
ہوگا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو تمہارے منہ میں گھی شکر۔''

''اور اگر نہیں ہوا تو کیا غم ہے آپ کوئی بے روزگار تو ہیں نہیں۔ یہاں ریڈر اور ہیڈ تو ہیں ہی۔ پروفیسری میں ایک دو ہزار زیادہ مل جائیں گے اور کیا۔ وہ ایک دو ہزار کے بغیر بھی ہم جی سکتے ہیں۔ زیادہ سوچنا نہیں ہے۔ آرام کیجئے۔ کل سے کالج جایئے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہو جائے تو بہتر ہے اور نہ ہوگا تو کسی کے محتاج نہیں ہیں بفضلہٖ تعالیٰ۔ میں آپ کیلئے چائے بنا لاتی ہوں۔''

وہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ جاوید اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آئی دونوں نے مل کر چائے پی۔ اسی دوران وہ تین دنوں کی ایک ایک روداد بیوی کو سناتا رہا۔

اگلی صبح تیار ہو کر جاوید کالج پہنچا۔ سب کچھ ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسا تین دن پہلے تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایسا لگ رہا تھا کہ اس کالج سے شاید اب اپنا آب و دانہ اٹھنے والا ہے۔ اس کالج میں اب وہ کچھ ہفتوں کا مہمان ہے۔ وہ پھر ان خیالات کو جھٹک دیتا اور کلاس کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کالج میں ہر طرف ایک شادی کا ذکر تھا۔ جس سے ملو ایک ہی بات کرتا۔ آپ شادی میں جا رہے ہیں؟ کیا آپ کو دعوت ملی؟ آپ شادی میں کیا دے رہے ہیں؟ آپ کو شادی کا کیسا کارڈ ملا؟ خصوصی یا عمومی؟ کسی نے کہا وہ پوری فیملی کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے جا رہا ہے۔ کسی نے بتایا یہاں سے دس ریز روڈ گاڑیاں جائیں گی اور دوسرے دن واپس آنا ہوگا۔ گویا پورا کالج ہی شادی میں جا رہا ہے۔ ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ تمام۔ معلوم ہوا یہ سینکڑوں کا قافلہ پرنسپل ندرت اللہ کے بیٹے کی شادی میں بارات کی شکل میں وہاں جا رہا ہے جہاں سے جاوید انٹرویو دے کر لوٹا ہے۔ جاوید نہیں گیا۔ اسے خصوصی کارڈ نہیں دیا گیا تھا۔ کچھ پروفیسر تو محض پرنسپل کو خوش کرنے کے لئے تحفے تحائف اور بال بچوں کے ساتھ شرکت کرنے جا رہے تھے تاکہ آئندہ انہیں میمونہ ملے یا ڈانٹ نہ پڑے۔ قافلہ گیا۔ دوسرے دن لوٹ آیا۔ تیسرے دن کالج میں ایک خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ ''جاوید کا تقرر اورنگ آباد یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر ہو گیا۔'' اسی رات کالج گراؤنڈ میں پرنسپل نے بیٹے کا ولیمہ رکھا تھا۔ ہر کوئی جاوید کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ کوئی مسکرا کر کوئی دھیرے سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کوئی بانہیں کھول کر گلے لگا رہا ہے اور کوئی بالکل خاموشی کے ساتھ کنارے سے گذر رہا ہے۔ جاوید نے سبھوں سے یہی کہا کہ ''مجھے تو اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے نہ کوئی لیٹر ملا ہے میں مبارک باد کیسے لوں۔''

''کیسے نہیں لیں گے؟ لیٹر بھی مل جائے گا اور معلوم بھی ہو جائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''اجی جناب پرنسپل کے بیٹے کی بارات میں یہ خبر تمام باراتیوں اور شرکاء کو مل گئی۔''

''وہ کیسے؟''

''اجی میاں وہاں وہ آئے تھے جنھوں نے آپ کا تقرر کیا ہے۔''

''کون؟''

اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر انھوں نے بذات خود پرنسپل سے کہا کہ ''آپ ہی کے کالج کے ایک صاحب کا تقرر پروفیسر کی جگہ پر ہوا ہے۔''

یہ سننے کے بعد جاوید کے پاس کچھ کہنے اور کچھ پوچھنے کو نہیں رہ گیا۔ پھر بھی اس نے کہا جب تک مجھے لیٹر نہیں ملتا اسے تو محض خبر ہی سمجھیں گے۔ اس کے باوجود پروفیسر ان سے ملتے رہے اور مبارک باد دیتے رہے۔ حتیٰ کہ کالج کے پرنسپل نے بھی مبارک باد دی۔ گلے سے لگایا، ظاہراً ہی لیکن انہوں نے بھی مبارک باد دی۔ دیکھنے میں لگ رہا تھا کہ مسکرا رہے ہیں۔ ایک پروفیسر نے کہا ''ارے یار مان گئے آپ نے آخر جھنڈا گاڑ ہی دیا۔ جما دیا ثابت کر دیا۔''

ایک پروفیسر نے یہ سن کر کہا۔ ''ارے میں نے آپ سے پہلے ہی ان کے بارے میں کہا تھا کہ ان کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ کبھی بھی یہاں سے اڑ جائیں گے۔ دیکھا وہی بات ہوئی۔ یہ تو آخر اڑ ہی گئے۔ دراصل یہ چپکے چپکے اس کام میں لگے ہوئے تھے اور آخر کامیاب ہو کر رہے۔'' کسی نے کہا ''اس کالج کی تاریخ میں کوئی استاد یونیورسٹی میں پروفیسر بن کر یہاں سے نہیں گیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کالج اور ارکان کالج کو اس پر فخر ہونا چاہیے۔'' غرض اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔

ولیمہ چلتا رہا۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے۔ رات کے گیارہ بجے جاوید گھر لوٹ آیا۔ بیوی سے ولیمہ کی کہانی سنائی۔ اس نے کہا۔

''پرنسپل کے بیٹے کی بارات میں اگر وائس چانسلر نے ایسا کہا ہے تو غلط نہیں

ہو گا۔ چلیئے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے مبارک ہو۔''

''کمال ہے لیٹر آیا نہیں اور تم۔۔۔''

''ارے چھوڑیے لیٹر آجائے گا اور آئے گا ہی دیکھئے گا دو تین دن میں لیٹر ضرور آئے گا اور میری موجودگی میں آئے گا اور میں ہی اس کا لفافہ چاک کرونگی۔ میں اپنے ہاتھوں سے اسے پڑھ کر سناؤنگی۔ ٹھہریے میں منہ میٹھا کراتی ہوں۔'' وہ فریج سے میٹھالائی اور دونوں نے ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔

دو دن بعد جب جاوید کالج سے گھر لوٹا تو اس کی بیوی بہت خوش تھی۔

''بتایئے میں کیوں خوش ہوں اور آپ کو کیا دینے والی ہوں؟''

''کیا؟ کہیں لیٹر تو نہیں آگیا؟''

''میں نے کہا تھا نہ میں اپنے ہاتھوں سے اس خط کو کھولوں گی۔''

''اچھا تو واقعی آگیا کیا؟''

آپ کو جھوٹ لگ رہا ہے یہ دیکھئے۔ اتنا کہہ کر اس نے ایک لفافہ دکھایا اس میں سے ایک لیٹر نکالا اور پڑھ کر سنایا۔ تقرر کی تفصیل اور آخری تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ جاوید نے فوراً وضو کیا اور دو رکعت شکرانے کیلئے فرش پر خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہو گیا۔ نماز ختم کی۔ دعا مانگی۔ اس کے دل میں خوشیوں کی لہر دوڑنے لگی۔ برسوں کا وہ خواب جو ادھورا تھا آج خدا نے پورا کر دیا۔ اس کی رحمت کا کوئی حساب نہیں۔ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ جاوید کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح پروفیسر بن جائے گا۔ بغیر خوشامد، رشوت اور دوڑ بھاگ کے لیکن جب خدا کسی کو نوازتا ہے تو اس طرح بھی نوازتا ہے۔ بنا ایک پیسے کی رشوت، بنا خوشامد، بنا تعلقات، بنا جان پہچان کے آج وہ پروفیسر شپ کیلئے منتخب کر لیا گیا۔ خدا چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا۔

اب اگلا قدم کالج سے ریلیونگ کا تھا۔ ریلیونگ جاوید کیلئے قیامت بن گئی۔ ریلیونگ آگ کا دریا ہو گئی ریلیونگ شیر کے منہ سے شکار کو چھین لینے کا منظر بن گیا۔ ریلیونگ

کسی کے قدموں میں ناک رگڑنے کا عبرتناک واقعہ بن گیا۔ ریلیونگ ذلت ورسوائی کا بازار بن گیا۔ ذہن کا زخم اور دل کا ناسور بن گیا۔ برسوں کے دبے ہوئے انتقام کا ذریعہ بن گیا۔

وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا وہ ریلیو ہو پائے گا یا نہیں، پرنسپل پہلے سے ہی جلا بھنا ہے۔ ٹرسٹی کے واقعہ میں کلرک ملتان خاں نے میرے خلاف اس کے کان پھونکے تھے تب ہی سے وہ خار کھائے بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا سنائے گا۔ اپنے اختیارات کا کیسا کیسا مظاہرہ کرے گا۔ ڈرائے گا، دھمکائے گا کیونکہ جب وہ اپنے شعبے کا ہیڈ تھا اپنے ایک کلیگ کے کنفیڈینشل رپورٹ کو داغدار کر دیا تھا۔ اس کی سروس بک غائب کروادی تھی۔ عجیب بات ہے کہ وہ شخص بھی یونیوسٹی میں ملازم ہو گیا۔ خیر۔ یونیورسٹی سے کئی بار سروس بک کیلئے وہ تیس گھنٹے سفر کر کے کلکتہ سے آیا لیکن اسے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ اب میری باری ہے۔ خدا معلوم میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھو تو خون پینے والا دانت چھپائے ڈریکولا ہے جو انسان کی شکل میں نظر آتا ہے۔ کیا کیا جائے اس سے ڈائریکٹ ملا جائے یا کسی اور کے توسط سے۔ ڈائریکٹ میں جلی کٹی سنائے گا۔ دوسرے کے توسط سے ملو تو کہے گا ڈائریکٹ کیوں نہیں آئے۔ اس کا سب سے قریبی دوست جو ہر وقت اس کے چیمبر میں بیٹھا رہتا ہے سے پہلے ملنا بہتر ہوگا۔ اس سے راہ ہموار ہو جائے گی۔

دوسرے دن جب وہ کالج میں پہنچا تو تو ایسا محسوس ہوا جیسے سب کچھ کشیدہ ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے وائس پرنسپل عبدالقوی کے چیمبر میں داخل ہوا۔ کھڑا رہا کہ بیٹھنے کو کہیں گے۔ وہ کسی کاغذ کو نظریں نیچی کئے دیکھ رہے تھے۔ نہ جاوید کو دیکھا نہ ہی سلام کا جواب دیا۔ آخر کار وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دس منٹ تک انھوں نے کچھ نہیں پوچھا کہ کیوں آئے کیا کام ہے۔ جاوید کو ایسا لگا کہ یہ پرنسپل سے پیشگی ساز باز کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان دونوں نے شاید طے کر لیا ہے اس کا کام مت کرو۔ جب انہوں نے کاغذ پر سے نظریں نہیں اٹھائیں تو جاوید نے کہنا شروع کیا۔

''سر آپ کو تو معلوم ہوگا میرے سلیکشن کے بارے میں؟''

''نہیں تو کیا ہوا؟'' نظریں اب بھی کاغذ پر ٹکی تھیں۔ خدا معلوم وہ واقعی کاغذ کو دیکھ رہے تھے یا دیکھنے کا ڈرامہ کرر ہے تھے۔ جاوید نے یونیورسٹی کا تقررنامہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

جیسے جیسے وہ لیٹر پڑھتے گئے، چہرے کا رنگ فق ہوتا گیا۔ پورا لیٹر پڑھ کر نظریں اٹھائیں۔ نہ مبارک باد نہ کسی قسم کی خوشی کا اظہار۔ جاوید کو اس طرح دیکھا اور کہا جیسے کسی کے قتل پر کچھ کہنے جا رہے ہوں۔ آنکھوں سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ نفرت اور غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔ فرمایا آپ کے جانے سے میرا تو ایک ہینڈ چلا یا جائے گا۔ پھر اس شعبے کا کیا ہوگا جسے اتنی سخت محنت سے ہم نے قائم کیا ہے۔ اس طرح اگر لوگ یہاں سے جاتے رہے تو اس کالج کا کیا ہوگا۔ ہم نے خون پسینہ بہا کر اس کالج کو یہاں تک پہنچایا ہے اور آپ لوگ چھوڑ کر بھاگنا چاہتے ہیں؟ غصہ ان کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ میرا ہینڈ، ہم نے قائم کیا، خون پسینہ بہایا، یہ سب ایسے کہہ رہے تھے جیسے واقعی انھوں نے کالج کی ایک ایک اینٹ جوڑ کر بنائی ہو۔ جب کہ کالج میں سب سے زیادہ چھٹی (چھ سال) انھوں نے ہی لے رکھی تھی۔ چھ سال کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ افریقہ میں ٹہلنے کیلئے شاید افریقہ کے جنگل سے لکڑی لانے گئے تھے تا کہ کالج کی میز کرسیاں بنائی جا سکیں۔ بارہ بجے کے پہلے کبھی کالج میں قدم نہیں رکھا۔ اپنے لئے ٹائم ٹیبل ایسا بنوا رکھا تھا۔ ہیڈ ہونے کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ جاوید نے نہایت خاکساری سے کہا۔ جی میں بہت کچھ آرہا تھا لیکن کہنا مناسب نہیں۔ سر چھوڑ کر بھاگنا نہیں ہے۔ کسی کے چلے جانے سے کام نہیں رکتا۔ میں چلا جاؤنگا۔ مجھ سے بہتر کوئی اور آجائیگا۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کالج کا کتنا نقصان ہوگا۔ آپ کو کوئی اندازہ ہے۔ مجھے اس سلسلے میں پرنسپل سے بات کرنی پڑے گی۔ ابھی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ میں آج چار بجے پرنسپل سے ملوں گا۔ ہو سکا تو میں مینجمنٹ سے بات کروں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے چپراسی سے کوئی فائل مانگی۔ فائل ملتے ہی اس میں کچھ پڑھنے

لگے۔ جیسے حکومت کا پنج سالہ منصوبہ وہی تشکیل دے رہے ہوں۔ جاوید اپنے پروفیسری کے تقرر نامہ کو ہاتھ میں لئے ہوئے خاموش بیٹھا رہا۔ جب وہ فائل میں ڈوب گئے اور جب ان کے نکلنے کی کوئی امید نہ رہی تو جاوید کرسی سے اٹھا اور چیمبر سے باہر آ گیا۔ یار یہ تو کچھ دوسرا ہی معاملہ ہوگیا۔ بڑے میاں کو کیا ہوگیا۔ شاید چند روز پہلے کے واقعہ لائبریری کا اثر اب بھی غالب ہے۔ میاں عبدالقوی مینجمنٹ کے حوالے کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ جسے دیکھئے مینجمنٹ کی دھمکی دے رہے ہیں۔ شروع ہو جاتے میں مینجمنٹ سے بات کرونگا۔ میں تمہاری رپورٹ مینجمنٹ کو دونگا۔ میں نے اس موضوع پر مینجمنٹ سے گفتگو کی ہے۔ ان کے اس ڈائیلاگ سے پروفیسر ڈر جاتے تھے۔ پروفیسر قوی کی حوالہ گیری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایکدن انہوں نے اپنے چپراسی کو کلرک لائبریری کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ وہ بلینک آئی کارڈ طلباء کو دیا کرے۔ افراہیم نے چپراسی کے معرفت جواب بھیجوایا کہ ان کو غلط کام کروانا ہے تو کسی اور کے پاس جائیں یہاں ایسا کاروبار نہیں ہوتا ہے اور وہ کون ہوتے ہیں مجھے حکم دینے والے۔ پروفیسر ہیں پرنسپل نہیں۔ چپراسی نے جا کر ہو بہو سنا دی۔ سن کے پک گئے۔ آگ لگ گئی۔ سیدھے لائبریری میں آ گئے اور لائبریرین کی میز کے سامنے بیٹھ گئے اور وحید سے کہا وہ ادھر تمہارے پاس کون کلرک ہے اسے یہاں بلاؤ ضروری بات کرنی ہے۔ وحید نے چپراسی سے کہا۔ جب تک میز کے کنارے ایک کرسی اور لگا دی گئی۔ افراہیم میز کے پاس گیا اور کرسی کھینچ کے کنارے کر دی اور سیدھے میز پر ہی بیٹھ گیا۔ پاؤں زمین پر تھے۔ طرز تشریف نے لائبریرین کی ہمت پست کر دی۔ آنکھوں کو سکوڑا اور میاں قوی سے مخاطب ہو کر کہا مجھے کیوں بلایا؟ افراہیم کا یہ انداز دیکھ کر قوی سٹپٹا گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آغاز اس طرح ہوگا پھر بھی اپنے غصے اور حیثیت کا اظہار کیا۔

"دیکھو افراہیم میں نے چپراسی کو تمہارے پاس جس کام کے لئے بھیجا تھا اسے کر دینا چاہئے۔

"کر دینا چاہئے چاہے وہ کام غلط ہی کیوں نہ ہو؟"

''میں نے کہا تو ٹھیک ہی ہوگا۔''

آپ کون ہیں؟''

''میں اس کالج کا بہت ہی سینیئر پروفیسر ہوں۔ تمہیں میری بات مان لینا چاہئے۔''

''سنیئے سر ہمارے والدین سکھایا ہے کہ بڑوں کی عزت کرنی چاہئے۔ ان کے اچھے اور نیک مشوروں کو ماننا چاہئے۔ ان کی خدمت کرنی چاہئے لیکن ان سے ڈرنا نہیں چاہئے اس لئے آپ ڈرانا بند کیجئے۔''

''دیکھو تمہیں میری بات ماننی پڑیگی۔ میں اس کالج کا فاونڈر ممبر ہوں۔''

یہ سن کر اگراہیم کا تلوے کا سر پر آ گیا۔ اسے کالج کی تاریخ معلوم تھی۔

''اچھا فاونڈر ممبر۔ کب فاونڈ کیا اور کب آپ ممبر بنے۔ اس کالج کے فاونڈر ممبروں میں چند میمن طبقے کے حضرات بھی تھے۔ میرا تعلق بھی میمن برادری سے ہے۔ یہ کالج نہ آپ نے قائم کیا اور نہ کسی کے باپ نے جن صاحبان نے اس کالج کو قائم کیا وہ سب کے سب قبروں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ آپ کو حیدرآباد سے بلا کر یہاں لکچرر کے عہدے پر بحال کیا گیا جس طرح مجھے اورنگ آباد سے بلا کر مقرر کیا گیا ہے۔ تو آپ کیسے فاونڈر ممبر بن گئے۔ یہ الّو کسی اور کو بنایئے۔ اور آپ کو شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ اپنے آپ کو کس منہ سے پروفیسر کہتے ہیں۔ آئندہ سے خیال رہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ سوفی صد سچ ہے۔ اگر آپ کو کچھ برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔''

اتنا کہ کر افراہیم اٹھا اور اپنی روزمرہ کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میاں قوی منہ دیکھتے رہ گئے۔ لائبریرین سے کہا اسے سمجھاؤ۔ یہ کس قسم کا لڑکا ہے۔ اسے بڑوں کی عزت کا کوئی لحاظ ہی نہیں ہے۔ وحید کیا بولتا۔ اسے افراہیم کا تیور معلوم تھا۔ وہ اگر کچھ کہتا تو اسے دھن کے رکھ دیتا۔ قوی وحید سے ''میں مینجمنٹ سے بات کرونگا'' کہتے ہوئے اپنے ڈپارٹمنٹ کو چل دیے۔ اس گفتگو کے بعد قوی نے مہینوں جال بچھایا لیکن افراہیم اسکے دام میں نہیں آیا۔ خفیہ طور پر چپراسیوں کو اس کے پیچھے لگایا۔ معلوم کرو یہ کتنے بجے آتا ہے۔ کب جاتا ہے۔ کب

چھٹی لیتا ہے۔ کس طرح کام کرتا ہے لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن پرنسپل نے افراہیم کو اپنے چیمبر میں بلایا اور کہا قوی صاحب سینئر پروفیسر ہیں ان کی بات مان لینا چاہئے تھا۔ افراہیم نے برجستہ کہا غلط کام کے لیے قوی کیا پرنسپل بھی کہے تو میں نہیں مانونگا۔ پرنسپل اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ پرنسپل قوی کا دوست تھا۔ اس نے بھی افراہیم کو شکنجے میں لینے کے لیئے تدابیر کیں لیکن کامیابی نہ ملی۔ خدا معلوم میاں قوی نے مینجمنٹ سے کیا شکایت کی۔

پروفیسری کیلیئے الحمدللہ کسی کی خوشامد نہیں کرنی پڑی لیکن ریلیونگ کیلیئے لگتا ہے دردر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ خوشامد کرنی ہوگی نہ جانے اور کیا کیا کرنا پڑے گا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ کوریڈور سے گذر رہا تھا کہ آرٹس کے وائس پرنسپل پروفیسر جلیل صاحب سامنے سے آتے نظر آئے۔ یہ پرنسپل کے ''جی ہاں'' میں شمار کئے جاتے تھے۔ کہا جاتا تھا پرنسپل کی جوتیوں کے صدقے میں انھیں وائس پرنسپل شپ ملی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہئے کیا ہوا۔ ریلیونگ کس مرحلے میں ہے۔ پھر آنکھیں پھاڑ کے پوچھا کیا آپ پرنسپل سے ملے؟

''ابھی فی الوقت تو وائس پرنسپل سے مل کر آرہا ہوں۔''

''کیا کہا انھوں نے اگر یہ کہہ دیں گے تو سمجھو آپ کا کام ہوگیا۔''

''یہی امید تو نہیں ہے۔''

''کیوں۔''

اس لئے کہ انھوں نے ابھی سخت سست مجھے سنایا ہے۔ کہہ رہے تھے کالج کو خون پسینہ سے ہم نے بنایا ہے اور لوگ بڑی آسانی سے اسے چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ وہ پرنسپل سے ملیں گے بات کریں گے۔ تب ہی ریلیونگ کے بارے میں کچھ کہہ سکیں گے۔

جلیل نے کہا۔ ''وہ جو آپ نے ٹرسٹی کے سامنے کچھ کہا تھا اس کا دل میں برا مانے پرنسپل اور وائس پرنسپل دونوں بیٹھا ہے۔ ابھی میں پرنسپل کے چیمبر سے آرہا ہوں۔ کہہ رہے تھے ریلیونگ کا فیصلہ تو ہائی پاور ایکشن کمیٹی کریگی اور وہ اس وقت کریگی جب میٹنگ کیلیئے بیٹھے گی۔''

''تو اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔''

''میٹنگ کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کب ہوگی؟''

''سنا ہے تین تاریخ کو۔ اس دن مہینے کی بیس تاریخ تھی۔''

''اتنی تاخیر سے میٹنگ کیوں لے رہے ہیں۔''

''کیا معلوم۔ مجھے تو لگتا ہے وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں۔ ٹالتے جاؤ ٹالتے جاؤ تا کہ جوائننگ کی تاریخ بھی نکل جائے۔ مجھے تو لگتا ہے میٹنگ میں بھی آپ کا کام نہیں ہو پائے گا۔

''تو پھر کیا کریں؟''

''آپ ایسا کیجئے میٹنگ کے ممبران کو تیار کیجئے اور خصوصاً اسٹیٹ آفیسر کو۔''

جاوید سوچنے لگا کہ کس ممبر سے شروع کریں یا ر یہ خوشامد تو زندگی میں کبھی کی نہیں۔ کیسے کرتے ہیں یہ بھی نہیں معلوم۔ اور اگر یہی کرنا تھا تو اس یونیورسٹی میں ہی کر لیا ہوتا جہاں سے ڈاکٹریٹ کر کے اس کالج میں آئے۔ خوشامد کی ہوتی تو یونیورسٹی میں کب کا لیکچرر ہو چکا ہوتا۔ مگر وہ وقت گذر چکا ہے۔ فی الوقت تو تمہیں ان ممبروں کی خوشامد تو کرنی ہی پڑے گی ورنہ یہ لوگ تمہاری آخری تاریخ نکال دیں گے اور تم یونیورسٹی میں پروفیسر شپ جوائن نہیں کر پاؤ گے۔ تم نے پروفیسری کیلئے تو خوشامد نہیں کی۔ لیکن ریلیونگ کیلئے کرنی پڑیگی۔ چلو جاتے جاتے اتنا بھی کر دیں، کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ لوگ پروفیسر کو جاتے جاتے بھی حقیر اور کمتر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ارے عزت تو خدا دیتا ہے۔ انسان کے بس میں کیا ہے۔ انھیں ذلیل کرنے دو، تم سب کچھ برداشت کرتے ہوئے ممبروں سے ملنا شروع کر دو کالج میں بازار میں اور ان کے گھر میں۔ جب اتنا سب کچھ اتنے سالوں تک برداشت کر لیا تو یہ تو ایک مہینے کی بات ہے۔ ایک مہینہ اور سہی۔

وائس پرنسپل عبدالقوی سے ملنے کے بعد جاوید نے سمجھ لیا کہ یہ شخص کس قسم کے

تعاون کو تیار نہیں بلکہ الٹا یہ تو کام ہی خراب کرنے کے درپے ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ براہ راست پرنسپل سے ہی ملا جائے۔ ادارے کا منتظم اعلیٰ وہی ہے۔ جاوید کئی بار پرنسپل سے ملنے اس کے چیمبر میں گیا۔ کبھی میٹنگ ہوتی رہتی کبھی چپراسی اندر سے باہر آکر بتاتا کہ صاحب نے کہا ہے کل ملنے کو، کل پھر یہی جواب، گویا کسی صورت وہ ملنے کو تیار ہی نہیں۔ اس نے سوچا جس دن عبدالقوی پرنسپل کے چیمبر میں بیٹھا ہو اسی وقت اندر گھس لیا جائے۔ دو تین دن بعد یہ موقع ہاتھ آ گیا۔ عبدالقوی کے اندر جاتے ہی جاوید بھی داخل ہو گیا۔ سلام کر کے نوکر کی طرح کھڑا رہا۔ جب پرنسپل نے بیٹھنے کو کہا تو قوی کے پاس والی کرسی پر ایک فرمانبردار بچے کی طرح ہاتھ باندھ کر بیٹھ گیا۔ جاوید کی بحرالاسلام کالج کی سترہ سالہ ملازمت میں ندرت اللہ چوتھے پرنسپل تھے۔ آج اسے ندرت اللہ کی ریڈر سے پرنسپل بننے تک کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ پرنسپل بننے کیلئے اپنے سپورٹرس کو پونے سے صبح چار پانچ بجے جیپ اور کار میں بھر بھر کے ممبئی کالج مینجمنٹ کے دفتر میں عین اس وقت پہنچتے جب وہاں نئے پرنسپل کے انتخاب کے متعلق گفتگو ہو رہی ہوتی۔ یہ سپورٹرس میٹنگ میں آواز اٹھاتے کہ ندرت اللہ سے بہتر کوئی دوسرا پرنسپل کے لائق نہیں ہے۔ انتظامیہ ندرت اللہ کو پسند نہیں کرتی تھی وہ وائس پرنسپل کو پرنسپل بنانا چاہتی تھی۔ ندرت اللہ کے متعلق رپورٹ یہ تھی کہ یہ وہ پروفیسر ہے جو اپنی جیب میں دو ٹائم ٹیبل رکھتا ہے ایک کالج کا دوسرا ٹیوشن کا۔ کالج میں اس کے روزانہ تین لیکچر ہوتے تھے۔ ہر لیکچر میں ایک گھنٹہ کا گیپ ہوتا تھا۔ وہ صدر شعبہ بھی تھا اس لئے ٹائم ٹیبل اپنی مرضی کا بنوا رکھا تھا۔ جیسے ہی ایک لیکچر ختم ہوتا وہ فوراً کیمپس سے باہر نکل جاتا اور قریب کے کسی فلیٹ میں گھس جاتا ایک گھنٹہ کے بعد پھر کالج میں حاضر۔ ایک گھنٹہ کے بعد پھر کالج سے باہر اور فلیٹ میں اندر۔ روزانہ دو تین بار اس کا یہ معمول تھا۔ اور کالج کے تین لیکچر کے بعد کالج سے پوری طرح نو دو گیارہ۔ زیادہ تر پروفیسر اسے پہچانتے بھی نہیں تھے۔ بہت کم پروفیسروں سے اس کی ملاقات تھی۔ اپنے تین لیکچروں کے علاوہ اسے کالج کے دوسرے امور سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ رپورٹ کالج انتظامیہ کے سامنے تھی۔ اس لئے کوئی

سوال ہی نہیں تھا ان کے پرنسپل بننے کا۔ ندرت اللہ نے جب دیکھا کہ رپورٹ موافق نہیں ہے تو انھوں سپورٹرس کو جمع کرنا شروع کیا جس طرح نیتا اپنے ٹکٹ اور میٹنگ کیلئے سپورٹرس اور بھیڑ اکٹھا کرتے ہیں۔ اس بھیڑ کو جیپ میں بٹھا کر علی الصباح چار بجے پونہ سے ممبئی لے جانے لگے۔ اس بھیڑ کو یونیورسٹی انتظامیہ کے پاس بھجوایا۔ نیتاؤں سے کہلوایا۔ خدا معلوم کس کس سے یونیورسٹی اور کالج انتظامیہ پر پریشر ڈلوایا تب جا کر پرنسپل کی کرسی پر بیٹھ پائے۔ پھر تو یہ ہوا کہ کرسی پر اتنا زیادہ بیٹھ گئے کہ تشریف کے نیچے دو گدے رکھنے لگے پھر بھی کمر ہل گئی تو علاج کرانے لگے۔ ایک موٹی کرسی اپنی رہائش گاہ (ہوسٹل میں) میں رکھوا دی اور وہاں اس پر بیٹھ کر دستخط کرنے لگے۔ قد میں ٹھگنے تو تھے ہی کرسی پر دن رات بیٹھتے بیٹھتے کولھا بھاری ہو گیا۔ چلتے تو لگتا اپو راجا کا پیچھے سے کچھ لیفٹ رائٹ کر رہا ہے۔

فرعونیت یہاں تک بڑھی کہ بات بات پر اپنی یونیورسٹی پر طنز کرنے لگے۔ یونیورسٹی میں رشوت، غبن، جوڑ توڑ گویا دنیا کی ہر برائی انھیں یہاں نظر آنے لگی۔ یہاں کے تمام بڑے افسر رجسٹرار تا وائس چانسلر کو بے ایمان، لالچی، جھوٹا اور مکار بنا دیا۔ یہ خبر یونیورسٹی تک پہنچ گئی۔ انتظامیہ اور افسران حیران کہ یہ کون شخص ہے جس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یونیورسٹی پر عائد کی گئی تمام برائیاں خود ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جس کا انھیں ذرہ برابر خیال نہیں تھا۔ چہرے پر رعونت، خشونت اور چنگیزیت اس قدر چھا گئی کہ ہنسنے پر دانتوں، آنکھوں، نتھنوں، ہونٹوں، کانوں اور ناک سے گرگ آدم خور کا گمان ہوتا۔ وہاں کے ایک شہری نے سنا تو کہا سچ ہے کنڈکٹر سے کروڑ پتی۔ NAAC کیلئے کالج کو مینجمنٹ کمیٹی نے ۳۵ لاکھ روپے دیئے۔ پورے کالج کو از سر نو درست کیا گیا۔ ہر ڈپارٹمنٹ کو جگہ کے ساتھ ایک میز ایک کرسی بھی دی گئی۔ تینوں بلڈنگ کی کھڑکی، دروازے، دیوار، فرش، چھت، کوریڈور کی مرمت، صفائی اور رنگائی کی گئی۔ تین ہزار اسکوئر فیٹ میں جو پرانی کینٹن ASBESTOS میں کھڑی تھی اسے بھی نئے لوہے لکڑ اور فرش بنوا کر چمکا دیا گیا۔ دو ایکڑ میں پورے کالج کا کیمپس تھا۔ ظاہر ہے اتنی چھوٹی سی اراضی میں

اسپورٹس گراؤنڈ وغیرہ کہاں سے ہوسکتا تھا۔ پھر بھی ان چار عمارتوں اور پارکنگ کے بعد درمیان میں جو جگہ بچی اس میں دائرہ نما گراس سرکل بنادیا گیا۔ یہ سب تو اپنی جگہ پرنسپل چیمبر کا نقشہ پوری طرح بدل دیا گیا۔ فرش تا چھت دیوار تا فرنیچر میز تا کرسی سب کو ہلکا کتھئی رنگ کردیا گیا۔ بتایا گیا کہ پرنسپل چیمبر کو دیکھنے سے مائٹی اسٹون کا (MIGHTY STONE) کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی شان، طعنہ، آن بان، فخر و آمریت اور کچھ کرنے کرانے کا پختہ ارادہ اور منصوبہ۔ آگے چل کر میاں ندرت اللہ ان خیالات کا زندہ نمونہ بن گئے۔ لوگوں نے یہ بھی سنا کہ ندرت اللہ یہاں سے جاتے جاتے ایک کروڑ کمانے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ ان کے پہلے کے پرنسپل نے اپنے اپنے زمانے کے ریٹ کے حساب سے جیب بھرا جو لاکھوں میں تھے تو اب ایک کروڑ کا تخمینہ بھی حسب زمانہ ہے۔ ندرت اللہ کے والد اورنگ آباد کے تھے۔ بس میں کنڈکٹر تھے۔ یہاں کے ایک شہری نے سنا تو کہا سہی ہے کنڈکٹر سے کروڑپتی۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ NAAC کے پینتیس کو RENOVATION میں پینتیس دکھا کر بقیہ پورے پندرہ کو اپنے فرضی اکاونٹ کے دوزخ میں اس طرح نگل لیا کہ ڈکار تک نہیں لی۔ پھر تو ایڈمیشن یا اپوائنٹمنٹ ٹیچنگ یا نان ٹیچنگ ندرت اللہ کی آمدنی کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ عمارت کی مرمت اور آرائش کا جو سامان کالج میں آیا فرشی، اینٹ، سمنٹ، لکڑی، بجلی کے تار اور فٹنگس اس میں سے آدھا ندرت اللہ کے گھر پہنچ گیا۔ کالج اور گھر کی سجاوٹ ایک ساتھ ہونے لگی۔ حتیٰ کہ سائنس ڈپارٹمنٹ میں پریکٹیکل کیلئے لائی گئی گیس سیلنڈر بھی ان کے گھر پر جانے لگی۔ کالج کے آٹھ پیون ان کے گھر پر کام کرتے تھے۔

عجیب عجیب ڈرامے ہونے لگے۔ خواہ مخواہ موضوعات پر میٹنگ بلاتے۔ میٹنگ میں کیسٹ پر قرآن کی ایک آیت کو بار بار سامعین پروفیسر کو سناتے یعنی ''تعز من تشاء وتذل من تشاء'' یعنی خدا ہی عزت اور ذلت دیتا ہے۔ اس کے بعد ایمان، سچائی، قربانی اور اخلاقیات پر لمبا لمبا لیکچر دیتے۔ اس کے بعد مزاحیہ مشاعرے کے ٹیپ سنواتے اور پھر

''تعز ومن تشاء وتذل من تشاء'' سنا کر میٹنگ برخاست کر دیتے۔ دن گذرتے رہے، مہینے بیتتے رہے، سال جاتے رہے۔ اور اسی کے ساتھ نئی نئی خبریں بھی سامنے آتی رہیں۔ چپراسی، آفس کلرک، جونیئر کالج (گیارہویں بارہویں جماعت) میں تدریسی تقرر، سنیئر کالج میں پروفیسر کی بحالی دولاکھ تا پانچ لاکھ کے رینج میں یہ کاروبار دھوم دھام سے چلتا رہا۔ کالج کا پرانا طالب علم جبران کسی کا ایڈمیشن فارم لے کر ندرت اللہ کے پاس پہنچا کہ اس پر دستخط کر دو جواب دیا کہ کرائیٹیر یا کے مطابق اس کا فی صد نمبر کم ہے اس لئے داخلہ نہیں ہوسکتا۔ اس کیلئے تم مجھے گولی ماردو مگر میں اپنے طئے ہوئے فی صد سے کم پر کسی کو داخلہ نہیں دے سکتا۔ جبران نے کہا ٹھیک ہے اپن دیکھتا ہے تم کو اور تمہارے اصول کو۔ اگلے دن ہی کسی گارجین نے ندرت اللہ کے خلاف مقامی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ بچے کو داخلہ نہیں دیا جبکہ اس کے نمبر مطلوبہ فی صد سے زیادہ ہیں۔ اور ایسے طلباء کو داخلہ دیا گیا ہے جس کے نمبر کم ہیں اور گورنمنٹ نے جو ایڈمیشن کا کوٹا مقرر کیا ہے اس سے زیادہ داخلہ ہوا ہے۔ کورٹ نے ایک لاکھ کا جرمانہ عائد کیا۔ ندرت اللہ اس گارجین کے گھر گئے معافی مانگی۔ مقدمہ واپس لینے کی گذارش کی۔ اس کے بچے کو داخلہ کا وعدہ کیا۔ اس شخص نے کہا مقدمہ میں میرا جو خرچ ہوا ہے اور میرے بچے کو داخلہ اتنا تم کر دو تو واپس لے لوں گا۔ ندرت اللہ نے شرط مان لی۔

اس طرح کے واقعات ہوتے رہے اور پروفیسروں کو قرآن وحدیث سنائی جاتی رہی۔ ہوسٹل کی عمارت جس میں پرنسپل کی رہائش تھی وہاں سے پرنسپل چیمبر دو سو میٹر پر تھا جب وہ اپنی رہائش سے فرسٹ فلور سے نیچے اترتے تو پہلے آفس کا چپراسی نیچے اترتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس ہوتی جس میں ندرت اللہ کے ضروری کاغذات ہوتے۔ چپراسی آگے آگے ندرت اللہ پیچھے پیچھے۔ رہائش تا چیمبر یہ سفر دو منٹ کا ہوتا تھا۔ یہی عمل چیمبر تا رہائش بھی دہرادیا جاتا۔ آس پاس آتے جاتے کھڑے ٹھہرے پروفیسر اور طالب علم یہ پریڈ دیکھتے رہتے اور سوچتے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ چیمبر کے اندر جب ندرت اللہ حاجت

سے باہر آتے تو وہی چپراسی پاخانہ میں پانی مارتا۔ ندرت اللہ نے چیمبر کے دروازے پر لال ہری پیلی بتی لگا رکھی تھی۔ لال یعنی میٹنگ یا کوئی ضروری کام اندر ہورہا ہے اس لئے کوئی اندر نہیں آسکتا۔ ہری بتی یعنی آنے کی اجازت ہے لیکن اس کے اوقات بارہ سے ایک بجے تک تھے۔ یہ وقت پروفیسروں کیلئے تھا۔ ایک تا دو طلباء کیلئے۔ پیلی بتی یعنی کلرک اندر جاکر پوچھے گا اور باہر آکر بتائے گا۔ تب کوئی مل سکتا ہے۔ جس سے نہیں ملنا ہوتا تو لال بتی جلا کر اسے گھنٹوں انتظار کراتے آخر کار وہ چلا جاتا۔ پھر ہری بتی جل جاتی۔ وہ جب اندر سے کلرک یا چپراسی کو بلاتے تو بیل بجتی جس میں چڑیا کی آواز ہوتی یعنی چوں چوں چوں۔ بتیوں کے علاوہ دروازے پر ایک چھوٹا سا بورڈ تھا جس پر لکھا تھا پرنسپل ان یا آؤٹ۔ گویا یہ چیمبر کسی مشفق استاد پرنسپل کا نہ تھا بلکہ کسی سخت مزاج ظالم حکمران کا تھا۔ کیوں نہیں آخر چیمبر کے عرش وفرش کو دیکھ کر مائٹی اسٹون کا احساس بھی تو ہونا تھا۔ رسپشنسٹ مع چپراسی سے کہتے کہ چیمبر اور ویٹنگ ہال میں پوچھا مارو یعنی بالٹی میں پانی لاکر کپڑے بھگا کر فرش کو پونچھو۔ فرش اور پائخانہ کی صفائی کے عوض اس کے گھر کے دو افراد کو چپراسی بنا دیا۔ خدا معلوم یہ سودا کتنے میں طے ہوا۔ میٹاڈور گاڑی کو خود ڈرائیو کرتے تھے۔ گاڑی کالج کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوتی اور پارکنگ تک پہنچنے سے پہلے کسی ایسے پروفیسر پر نظر پڑ جاتی جس سے کوئی ضرورت ہوتی تو میٹاڈور میں سے ہی مٹھی کی انگلی سے اشارہ کرتے کہ میرے چیمبر میں پہنچو میں پارک کرکے آرہا ہوں۔ اپنے بیٹے کی شادی کیلئے دو طرح کے کارڈ چھپوائے۔ ایک عام دوسرا خاص۔ خاص یعنی براتی کی دعوت۔ عام یعنی ولیمہ میں شریک ہونے کیلئے۔ ولیمہ کیلئے شادی خانہ بک نہیں کیا۔ کالج گراؤنڈ اور اس کی عمارتوں میں ولیمہ کا انتظام کیا۔ اس رات کالج کیمپس شادی خانہ لگ رہا تھا۔ اپنے گھر کے کئی پروگرام انھوں نے کالج گراؤنڈ میں ہی کئے۔ سابق پرنسپل اور کسی پروفیسر میں چوں تک کرنے کی جرات نہ تھی۔ آفس کا کلرک اور آٹھ چپراسی ان کے ذاتی گھر میں بھی کام کرتا تھا۔ ہر طرف چاندی ہی چاندی تھی۔ خدا مہربان ہوتا ہے تو خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ بھڑک دار شرٹ میں روزانہ بھڑک دار ٹائی لگا

کر پورے کالج میں داماد کی طرح چھم چھم کرتے اور دندناتے پھرتے تھے۔ کوئی ان کا بال باکا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر تو فرعونیت اتنی بڑھی کہ الاماں!

''کیا بات ہے کس لئے آئے؟'' پرنسپل نے پوچھا؟

''سر آپ کو معلوم ہو گا یہ کہتے ہوئے اس کی آواز گھگھیا گئی، آواز حلق میں واپس چلی گئی۔ پھر ہمت کی طاقت اکٹھا کیا اور کہا سر ہمارا اسلیکشن یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اسے احساس ہوا جیسے اس نے بڑا جرم کیا ہے۔ جاوید نے یونیورسٹی کا تقرر نامہ پرنسپل کو دیا۔ پرنسپل نے جلدی جلدی پڑھا جیسے یہ عہدہ تو خود اسے ملنا چاہئے تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو یہ موقع کیسے مل گیا اور وہ بھی اس یونیورسٹی میں جہاں سے اس نے خود ایم ایس سی کیا تھا۔ لیٹر کو جیسے تیسے پڑھ کر عبدالقوی کے ہاتھوں میں دے دیا۔ قوی نے بغور مطالعہ کیا۔

''کیا لکھا ہے قوی صاحب'' پرنسپل نے پوچھا؟

''وہی آپ کے اسکیل میں تقرر ہے۔ جوائننگ کیلئے پندرہ دن دیئے گئے ہیں۔''

''تو آپ کیا چاہتے ہیں؟'' پرنسپل نے جاوید سے پوچھا؟

''سر میں جوائن کرنا چاہتا ہوں۔'' جاوید نے کہا۔

''کیوں یہاں آپ کو کسی قسم کی شکایت ہے کوئی کمی ہے، کیا تنخواہ نہیں مل رہی ہے؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ ہے دراصل پروفیسر شپ کا تقرر ہے اور یہاں میرے جانے کے بعد ہم سے اچھے کوئی آجائیں گے۔ میں جانے تک اپنا پورا نصاب پڑھا کر جاؤں گا۔''

''کیا خیال ہے آپ کا۔'' پرنسپل نے عبدالقوی سے پوچھا؟

عبدالقوی نے جاوید کو مخاطب کیا۔ ''دیکھئے خاں صاحب ہارورڈ یونیورسٹی میں ایسا ہے کہ وہاں کے ملازم کو جب کہیں چھوڑ کر جانا ہوتا ہے تو وہ اپنی یونیورسٹی کو لاکھوں دے کر جاتے ہیں بلکہ وہاں کے فارغ التحصیل جہاں بھی کام کرتے ہیں اپنی یونیورسٹی کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ رقم بھیجتے رہتے ہیں اس طرح اس یونیورسٹی میں بہت بڑی رقم جمع ہو گئی ہے تو آپ

بھی یہاں سے جا رہے ہیں۔آپ بھی کچھ دے کر جائیے بلکہ بہت کچھ دے کر جائیے۔''

جاوید نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا کہیں یہ لوگ خفا نہ ہو جائیں کہ''ہم سے پہلے جو صاحبان یہاں سے گئے انھوں نے تو کچھ بھی نہیں دیا۔''

عبدالقوی نے کہا۔''ان کی بات چھوڑیے۔اب رول بدل گیا ہے اب جو بھی جائے گا کچھ نہ کچھ دے کر جانا ہوگا۔''

''یونیورسٹی رول کے حساب سے جتنا ہوگا ہم اس کی کوشش کریں گے۔'' جاوید نے کہا۔

قوی نے کہا۔''وہ تو ایک معمولی رقم ہے۔اگر ہمیں یہ ترقی ملی ہوتی تو ہم کئی لاکھ دے کر جاتے اس لئے آپ بھی کم از کم لاکھ تو دیجئے ہی۔''

''لاکھ تو زیادہ ہے۔''

''آپ کیلئے کہاں زیادہ ہے۔دو بار میں دیجئے۔''

''اس میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔''

''نہیں اتنا تو دینا ہی ہوگا اور دوسرا بھی کوئی جائے گا تو اس سے بھی اتنا ہی لیں گے۔''

''مجھ سے ہی نیا قانون کیوں نافذ کر رہے ہیں۔''

''پہلے ہی کرنے والے تھے اتفاق سے آپ سے شروع ہو رہا ہے۔''عبدالقوی نے پرنسپل سے کہا۔''ڈاکٹر صاحب اب ہم مینجمنٹ سے مل کر ایسے حالات کیلئے ایک رقم فکس کر دیں گے۔''

''لین تو ملے گی؟'' جاوید نے پوچھا۔

''ہاں۔'' پرنسپل نے کہا۔

''نہیں۔لین اب کسی کو نہیں ملے گی۔''عبدالقوی نے کہا۔

''لیکن مجھ سے پہلے تو سب کو دی گئی۔''

''اب کسی کو نہیں ملے گی۔''

''تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''آپ کو رزائن کر کے جانا ہوگا۔''

''رقم میں تو تھوڑی کمی کر دیجیے۔''

''ارے آپ کیا تھوڑی کہہ رہے ہیں۔آپ سے جو کہا گیا ہے وہ کم ہے۔آپ کو شوق سے اس سے بھی زیادہ دینا چاہیے۔'' قوی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اور کوئی صورت نہیں ہے۔''

''نہیں کچھ بھی نہیں۔''

''آپ چند دنوں میں روپے کا انتظام کر لیجیے۔اس کے بعد ریلیونگ لیٹر بنا دیں گے۔'' پرنسپل نے کہا۔

''اچھا سر ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جاوید کمرے سے باہر آ گیا۔

جوائننگ کی آخری تاریخ کو دس دن رہ گئے تھے۔

ایک لاکھ کا انتظام کرنا ہوگا یہی سوچتے ہوئے اپنے فلیٹ پر پہنچا۔

بیوی نے کہا۔''کیا ہوا کیا کہا پرنسپل نے۔''

کہا کیا پرنسپل اور وائس پرنسپل نے ایک لاکھ کی بات کی ہے۔اس کے ساتھ ہی ملاقات کی روداد سنا دی۔

بیوی نے غصے میں اول فول دونوں کو سنانا شروع کیا۔کمینہ ہے کتا ہے جب تک مانگ کر نہیں کھائے گا پیٹ نہیں بھریگا۔خدا نے چاہا تو اسی دنیا میں وہ بھگتے گا۔وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے دن کالج سے فارغ ہونے کے بعد گھر نہ جا کر سیدھے بازار گیا۔مٹھائی کی دکان میں سب سے قیمتی مٹھائی ایک کلو خریدی۔پھر کالج واپس آیا۔سہ پہر چار بجے کا وقت تھا۔پرنسپل کالج ہوسٹل کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ڈرتے ڈرتے اس کے گھر کے دروازہ کی بیل بجائی۔بیٹے نے دروازہ کھولا۔ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر گدا لگائے بیٹھے تھے۔سامنے میز پر فائلیں رکھی تھیں۔ان پر دستخط کر رہے تھے۔آفس کلرک ایک ایک فائل

پیش کرتا جارہا تھا۔

سلام کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچا اور ہاتھوں میں مٹھائی کا پیکٹ تھما دیا۔ وہ سمجھ گئے یہ کس لیے دیا گیا ہے۔ کچھ نہیں کہا۔ بیٹے کے ہاتھوں میں پیکٹ دے دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ کچھ نہیں پوچھا کہ کیوں آئے کیا کام ہے۔ جاوید صوفہ پر بیٹھ گیا۔ سوچا لگتا ہے قوی نے کل اس کے کان بھرے ہیں اس لیے ابھی پھولا بیٹھا ہے۔ مٹھائی بھی فضول میں گئی اور خواہ مخواہ یہاں آکر سبکی ہوئی۔ لیکن اب آ گئے ہیں تو دو بات کر ہی لیتے ہیں۔ یہ تو بولے گا نہیں۔ خود ہی پوچھ لیتے ہیں۔ جاوید نے نہایت انکساری کے ساتھ دھیمی آواز میں پوچھا سر آپ نے کہا تھا کہ ایک لاکھ دینا پڑے گا۔ یہ تو بہت زیادہ ہے اگر اس میں تھوڑی کمی ہو جاتی۔

پرنسپل نے رعونت سے کہا۔ ’’یہ کالج ہے یا یتیم خانہ۔ یہ کالج فری فنڈ میں تو نہیں چل رہا ہے۔‘‘ اس کی آنکھوں میں بدمعاشی کی چمک بیدار ہو گئی۔ جاوید سہم گیا (بیشتر پروفیسروں کو تقررنامہ دیا گیا تھا اس پر یتیم خانہ ممبئی ہی چھپا ہوا تھا)

’’سر تھوڑا تو کم کر سکتے ہیں؟‘‘

’’تو مت جایئے آپ کو کس نے یہاں سے جانے کو کہا ہے۔‘‘

’’سر لین تو مل جائے گی؟‘‘

’’نہیں لین بند کر دی گئی ہے۔ آپ کو چھوڑ کر جانا ہو گا رزائن کر کے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ پھر فائل میں ڈوب گئے۔

یار یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا یہ تو کئی دن سے سن رہا ہوں۔ کل بھی پرنسپل چیمبر میں یہی کہا گیا۔ پرسوں بھی قوی نے یہی کہا تھا۔ خواہ مخواہ یہاں آ گئے۔ چند روز جوائننگ کی آخری تاریخ کو رہ گئے ہیں۔ یہ آدمی مانے گا نہیں۔

قرض لے کر انتظام کرنا پڑے گا۔ اچھا سر چلتا ہوں۔ آواز جیسے نیچے حلق سے آئی بہت آہستہ اور کمزور۔ پرنسپل نے سر کے اشارے سے کہا ٹھیک ہے۔ اور اپنی فائل میں لگ

گئے۔ کمرے سے باہر آکر موزہ اور جوتا پہنا اور فرسٹ فلور سے نیچے اترا اور کالج کیمپس سے باہر آیا تو ایسا لگا جیسے کے ماحول سے باہر آ گیا ہو۔ کھل کر سانس لی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ گھر جاتے ہوئے سوچتا رہا کہ قوی کو دیکھا اور پرنسپل کو دیکھا کچھ نہیں ہوا اب کیا کیا جائے۔ ان کا تو کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی آخری تاریخ جوائننگ کی نکل جائے گی۔ کچھ اور کرنا پڑے گا۔ کیا کرنا چاہئے۔ کس سے کہیں، کون آدمی ان سے کام کروا سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو ان کے قریب ہوگا یا جس کی یہ لوگ بات مان سکتے ہیں۔ وہ ہے اسٹیٹ آفیسر جو در اصل دفتر کا کلرک ہے۔ اس کے بڑے بھاؤ ہیں۔ وہی انھیں تیار کرا سکتا ہے۔ لیکن اس نے تو ٹرسٹی اور جمعدار والے واقعہ کو شکایت بنا کر پرنسپل کو سنایا تھا۔ اسی نے تو میرے خلاف پرنسپل کے کان بھرے۔ میں نے ٹرسٹی کو ڈپارٹمنٹ کا کمرہ دکھایا تھا کیونکہ اس سے پہلے ڈپارٹمنٹ کا کوئی کمرہ مخصوص نہیں تھا۔ اس دکھانے کو شکایت بنا کر اسٹیٹ آفیسر نے پرنسپل کے سامنے پیش کیا۔ اسے یہ بتایا کہ جاوید نے اپنے شعبے کا کمرہ ٹرسٹی کو دکھایا یعنی ٹرسٹی کو یہ بتایا کہ کمرا نہایت خستہ ہے۔ کالج انتظامیہ نے اتنا بُرا کمرا شعبہ کو دیا ہے جس میں قاعدے کا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ فرضی کہانی اسٹیٹ آفیسر نے پرنسپل کو سنائی تھی لیکن اس کے باوجود پرنسپل اسی کی بات مانے گا۔ ورنہ آج میٹنگ کل میٹنگ ہائی پاور کمیٹی کا فیصلہ اس میں جوائننگ کی آخری تاریخ بھی نکل جائے گی۔ لیکن اس کلرک آفیسر سے ڈائریکٹ تو مل نہیں سکتے کسی ایسے کو پکڑنا ہوگا جس سے وہ بے تکلف ہو اور وہ مجھے اس کے سامنے مجبور، ضرورت مند اور بے سہارا کے طور پر پیش کر سکے۔ ایسا کون ہوگا۔ کون یہ کام کر سکتا ہے۔ ایک آدمی ایسا نظر آتا ہے سید شارق امام، سینیئر لکچرر کے گریڈ میں کامرس پڑھاتے تھے۔ متوسط قد، اونچی توند، بھاری بدن، چوڑا چہرہ، بولنے میں سانس کے بوجھ سے آواز دب جاتی تھی۔ مونچھوں کے ساتھ کالج میں آئے تھے۔ عمر زیادہ لگتی تھی شاید اس لئے مونچھیں نکلوا دیں۔ توند اتنی ہی ہے۔ اسے پکڑنا ہوگا پہلی خوشامد اسی سے شروع کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے یہ کام کالج میں چلتے پھرتے نہیں ہو سکتا اس کے گھر جانا ہوگا۔ زندگی میں پہلی بار ریلیونگ لیٹر کیلئے سید شارق امام کے گھر رات کے آٹھ

بجے پہنچا۔ دروازے پر ناک کیا۔

شارق نے دروازہ کھولا کہا ارے جاوید صاحب آیئے آیئے۔شارق جس آدم ٹرسٹ کیمپس کی ایک بلڈنگ میں رہتے تھے اس میں تین فلور تھے۔گراؤنڈ فلور پر دکانیں، فرسٹ فلور پر ہاسٹل اور سیکنڈ فلور پر مختلف تجاروں کے آفس تھے۔شارق کے تین روم پارٹنر تھے جو کالج کے طالب علم تھے۔ پروفیسر شارق کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔طالب علم کے ساتھ طالب علم کی طرح رہتے تھے۔اپنے نام کا اسٹوڈنٹ آئی کارڈ بھی بنوا رکھا تھا۔سالوں اپنے وطن جھارکھنڈ اسٹوڈنٹ کنسیشن پر سفر کرتے رہے۔جب ٹی ٹی نے کئی بار اعتراض کیا کہ آپ کی صورت آئی کارڈ سے عمر رسیدہ ہے تو یہ سلسلہ بند کر دیا۔پھر جھارکھنڈ کے طالب علموں کے گارجین بن کر سفر کرنے لگے۔انھیں ساتھ لے کر جاتے اور لاتے جس کے عوض طلباء کے والدین ان کا ٹکٹ اپنے پیسوں سے بنوا دیتے۔مذہبی جماعت دینی امور کیلئے مختلف ضلعوں اور ریاستوں کا دورہ کرتی تو یہ اس کے ساتھ ہو لیتے ۔کیونکہ یہ سفر بھی مفت میں ہوتا تھا۔کالج میں طلباء کا کہنا تھا کہ پروفیسر جلیل کی طرح پروفیسر شارق کے الفاظ بھی لکچر میں سمجھ میں نہیں آتے۔کالج کے کلرکوں کا کہنا تھا کہ پروفیسر شارق جھارکھنڈ سے طلباء کو ایڈمیشن کیلئے لاتے ہیں اور ایک تعلیمی سال میں لاکھوں کی آمدنی بیٹھے بٹھائے ہو جاتی ہے۔ جاوید کو آج اسی پروفیسر کی خوشامد کرنی تھی۔وقت بھی انسان کو کتنا مجبور کر دیتا ہے۔

ہاسٹل میں ہر فلور کے کنارے ٹائلٹ بنا تھا۔بلڈنگ کے درمیان میں سیڑھی تھی جو سیکنڈ فلور تک جاتی تھی۔اس سیڑھی سے جاوید نے جیسے ہی فرسٹ فلور پر قدم رکھا پچاس سال کا ایک موٹا آدمی ٹائلٹ کی طرف تیزی سے بھاگتا نظر آیا۔اس نے دونوں ہاتھوں سے لنگی کی مونڈھی پکڑ رکھی تھی۔اوپر کا بدن ننگا تھا۔پیٹ کافی بڑا تھا اور توند اپنی آب و تاب کے ساتھ لٹک رہی تھی۔لگ رہا تھا جیسے اس نے لنگی کی مونڈھی نہیں پکڑ رکھی ہو بلکہ مونڈھی کے بہانے توند کو اوپر اٹھا رکھا ہو۔ایک اسٹوڈنٹ سامنے نظر آیا۔ جاوید نے پوچھا بھئی

پروفیسر شارق صاحب کس کمرے میں رہتے ہیں۔اس نے کہا وہ دیکھئے ٹائلٹ کی طرف لنگی میں وہی جا رہے ہیں۔ جب تک شارق ٹائلٹ میں گھس گئے تھے۔ جاوید وہیں پر کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد شارق ٹائلٹ سے باہر آتے دکھائی دیئے۔اس حالت میں جاوید نے آج ہی شارق کو دیکھا تھا۔یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو کالج میں کمر بند (BELT) سے کسا بندھا نظر آتا ہے۔اتنی بڑی توند میں آخر یہ چھپتا کیسے ہوگا۔اس کی عمر چالیس سے کم تھی اور اب تک کنوارے تھے۔قریب آتے ہی شارق نے منہ کھولا دانت دکھایا، سلام کیا اور اپنے ننگے بدن کو چھپانے کی بیکار کوشش کرتے ہوئے کہا.....

''ارے جاوید بھائی آپ یہاں کیسے؟''

''ہاں ایک ضروری کام آن پڑا ہے اور آپ کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا۔'' جاوید نے کہا۔

''آیئے آیئے کمرے میں وہیں چل کر بات کریں گے۔''

دونوں کمرے میں پہنچے بستر پر بیٹھ گئے۔ٹیبل کرسی ایک کونے میں اوپر نیچے رکھی ہوئی تھیں۔انھیں نکالنا دشوار تھا۔شارق نے جلدی سے کرتا پہنا، کمرے میں چار بیڈ تھے۔ ایک بیڈ پر ایک طالب علم کتاب پڑھ رہا تھا اس کا نام لے کر شارق نے کہا دیکھو جلدی سے چائے لے آؤ۔ وہ چائے لانے چلا گیا۔ کمرے میں اب جاوید اور شارق تھے۔

شارق نے کہا۔''ہاں اب اطمینان سے بتایئے۔بات کیا ہے اور ہم آپ کیلئے کیا کر سکتے ہیں؟''

جاوید نے سوچا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ پھر بھی اہم باتوں کو ذہن میں مرتکز کیا اور کہا۔

''شارق صاحب آپ تو جانتے ہونگے آپ کی دعا سے میرا اسلیکشن یہاں سے قریبی ضلع اورنگ آباد کی یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر ہو گیا ہے۔میں وہاں ہر حال میں جوائن کرنا چاہتا ہوں۔تقرر نامہ میں ایک ماہ کی مہلت دی گئی ہے۔آدھا مہینہ پرنسپل وائس

پرنسپل کی خوشامد کرتے کرتے نکل گیا۔ باقی بچے پندرہ دن۔ اب اس پندرہ دنوں میں مجھے ریلیو کیا گیا تو جوائننگ ہوگی ورنہ نہیں۔ ریلیوینگ تو اپنی جگہ ابھی تو کوئی مجھ سے پوری طرح بات کرنے کو بھی تیار نہیں۔ ایک کہتا ہے اس سے ملو۔ دوسرا کہتا ہے اس سے بات کرو۔ سب مجھے فٹ بال کی طرح ادھر ادھر کک مار رہے ہیں۔ نتیجہ صفر۔ ایک ایک دن گذرتا ہے اور میری ناامیدی بڑھتی جارہی ہے۔ آپ کے تعلقات اس شخص سے ہیں جو پرنسپل کا مشیر کار ہے اور معتمد ہے۔ میں نے دیکھا ہے اس شخص سے آپ کی بے تکلفی ہے۔ ہنسی مذاق ہوتا رہتا ہے۔ اس آدمی کو آپ ہی تیار کر سکتے ہیں۔ اس نے اگر پرنسپل سے کہا تو مجھے ریلیونگ لیٹر مل سکتا ہے۔ حالانکہ اسی نے میری شکایت ٹرسٹی کے حوالے سے پرنسپل سے کی تھی۔ اب وہی پرنسپل کو کنونس کر سکتا ہے اور اس کو میں براہ راست اس کام کیلئے نہیں کہہ سکتا۔ یہ کام آپ کر سکتے ہیں۔ اس لئے خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم اس کام کیلئے آپ کے شکر گذار ہونگے۔''

''ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ ہم سے جو ہوگا ہم ضرور کریں گے۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔''

اس اثناء میں چائے آگئی۔ چائے پی گئی۔ شارق نے موبائیل میں نمبر لگایا۔ ہیلو ہیلو سلام علیکم۔ میں بول رہا ہوں شارق امام۔ کیسے ہیں آپ۔ دراصل ایک ضروری کام سے آپ کو فون کرنا پڑا ہے۔ اس کیلئے ہمیں تھوڑا وقت چاہئے۔ وہ کام اپنے جاوید صاحب کا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے بات کرنی ہے۔ کہئے کب حاضر ہو جائیں۔ اسٹیٹ آفیسر نے دوسرے دن شام کا وقت دیا۔ جب سے وہ اسٹیٹ آفیسر بنا تھا خود کو کلرک گردانتا ہی نہیں تھا اور تمام پروفیسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتا تھا۔ پرنسپل نے اس کیلئے باضابطہ ایک چیمبر تمام سہولیات کے ساتھ بنوا دیا تھا۔

''ایسا ہے اس نے کل شام میں اپنے گھر پر بلایا ہے۔ کل شام میں آپ یہیں آجایئے یہاں سے اس کے گھر پر چلیں گے۔'' شارق نے بتایا۔

ہاں ٹھیک ہے میں سات بجے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر جاوید اپنے فلیٹ کو واپس آ گیا۔ دوسرے دن شام میں معینہ وقت پر جاوید شارق کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ دونوں باہر آئے۔ شارق نے کہا ایسا ہے دو کلو اچھی والی مٹھائی بندھوا لیجئے۔ یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ کیا کیجئے گا۔ آپ کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے۔ پرنسپل کے ذہن کو اسی مردود نے پراگندہ کیا ہے اس کی صفائی بھی یہی کرے گا۔ کچھ سوچئے نہیں لے لیجئے۔

جاوید نے کہا میں کچھ بھی ایسا نہیں سوچ رہا ہوں۔ دو کیلو وغیرہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ یہ تو آداب مہمان داری میں بھی شامل ہے۔ آخر اس کے گھر جا رہے ہیں۔ کچھ تو لے کر جانا ہی چاہئے۔ دراصل کام ہو جائے یہ بڑی بات ہے۔ جاوید نے دو کلو قیمتی مٹھائی کو پیکٹ میں بندھوایا اور اسے لے کر دونوں اسٹیٹ آفیسر کے فلیٹ پر پہنچے۔ شارق نے بیل بجائی۔ پیچھے جاوید بھیگی بلی کی طرح کھڑا تھا۔ خدا معلوم یہ آدمی میرا کام کرے گا بھی یا نہیں۔ پروردگار اس ریلیونگ کیلئے کیا کیا کرنا پڑے گا۔ ایک کلرک کی دریوزہ گری۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔ ایک بار ریلیو ہو گئے تو یہ لوگ اور اس حبس کے ماحول دونوں سے نجات مل جائے گی۔ اور نجات کیلئے ریلیونگ اور ریلیونگ کیلئے خوشامد کرنی ہی پڑے گی۔ سچ ہے مجبوری میں انسان کس قدر کمزور ہو جاتا ہے۔ کلرک بنام اسٹیٹ آفیسر نے دروازہ کھولا۔ شارق اور جاوید نے یکے بعد دیگرے سلام کیا۔ جاوید نے اتنی خاکساری سے سلام کیا جیسے ریلیونگ اس آدمی کے ہاتھ میں رکھی ہے۔

اسٹیٹ آفیسر ملتان خان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا آیئے آیئے اندر آیئے۔ ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر شارق اور جاوید اور کرسی پر ملتان صاحب بیٹھ گئے۔ پھر جاوید کھڑا ہوا اور ملتان کے پاس جا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہاتھوں کی طرف بڑھایا اور کہا۔

''یہ چھوٹا سا نذرانہ ہے قبول کیجئے۔''

''ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈبہ ہاتھ میں

پکڑلیا۔ جاوید اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ پانی آیا بسکٹ آئی چائے آئی سبھوں نے کھایا پیا۔ ملتان اور شارق نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور مسکرانے لگے۔ ایسا لگا جیسے ایک مرغا پکڑ کر مقصد برآری کیلئے لایا گیا ہو۔ اور وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آخر لے ہی آئے۔ دونوں کی آنکھوں میں شرارت اور خفیہ مقاصد نظر آ رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ ''اور تمہارا کیا چل رہا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''الحمد اللہ۔ آپ کی دعا سے سب ٹھیک چل رہا ہے اور اب وہ پہلے والا سب بند کر دیا ہے۔''

دوسرا مسکرایا جیسے کہہ رہا ہے۔ ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔''

شارق نے کہا۔ ''اب ہٹاؤ ان باتوں کو ہم لوگ جس کام کیلئے آئے ہیں اسے انجام دینا ہے اور یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔''

''کون سا کام؟''

''ارے یار جاوید صاحب کے ریلوینگ کا معاملہ ہے اور پرنسپل کو تم جانتے ہی ہو۔''

ملتان نے گمبھیر صورت بنائی۔ جیسے ایک نہایت ہی سنگین مسئلہ کو اسے حل کرنا ہے۔ گویا ناممکن کو ممکن۔ چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔ چھت کی طرف غور سے دیکھا پھر فرش کو دیکھا اور بڑے فلسفیانہ انداز میں جاوید کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا پرنسپل تو آپ سے بہت ہی خفا ہیں۔ وہ جو آپ نے ٹرسٹی سے کیا کیا بتا دیا تھا۔ یا خدا یہ ٹرسٹی والی بات تو میری ہمزاد بن گئی ہے۔ جہاں جاؤ جس سے ملو ایک ہی کہانی سناتا ہے۔ کالج ڈیولپمنٹ کی خبر تھی جو ٹرسٹی کو بتائی گئی اس میں شکایت کہاں سے آ گئی۔ میں نے تو کوئی شکایت نہیں کی تھی انھیں ڈپارٹمنٹ دکھایا تھا۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ جاوید نے ڈپارٹمنٹ دکھا کر میری شکایت کی۔

''میں نے ٹرسٹی کو بتایا تھا کہ اب شعبہ کا ڈپارٹمنٹ بن گیا ہے۔''

لیکن وہ تو کہتے ہیں ''جاوید نے ٹرسٹی کے سامنے میری شکایت کی۔''

جاوید نے ٹرسٹی کو ڈپارٹمنٹ ہی بتایا تھا۔ وہ ڈپارٹمنٹ جس کا پہلے کوئی وجود نہ

تھا۔ NACC کے لئے ایک چھوٹا سا کمرادیا گیا تھا جس میں انگریزی، ہندی اور اردو شعبوں کو رکھا گیا تھا۔ پرنسپل کو غلط رپورٹ اسی ملتان نے دی تھی اور اب اس وقت جاوید پر الزام عائد کر رہا تھا۔ جاوید کی مجبوری تھی وہ منہ توڑ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ شارق نے دیکھا کہ بے کار کی بحث شروع ہو جائے گی اس نے کہا۔

''اب کس نے کیا کہا کیا بتایا کیا سمجھا اسے رہنے دو۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ پرنسپل کو اس کام کیلئے (ریلیونگ) کون تیار کریگا اور ملتان کے علاوہ کوئی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے ملتان صاحب آپ کو یہ کام کرنا ہے۔''

''اچھا ہم کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔''

''آپ ہی کر سکتے ہیں۔'' جاوید نے گزارش کی۔

''کل پرنسپل سے بات کریں گے۔ پھر شام میں بتائیں گے۔'' ملتان نے بتایا۔

شارق نے کہا کل یہ کام کسی بھی طرح کرنا ہی ہے۔ شام میں گڈ نیوز ملنی چاہئے۔

''اچھا بابا کل تو آنے دو۔'' ملتان نے کہا۔

دوسرا دن صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا کے مماثل تھا۔ کالج صبح ساڑھے سات بجے سے ساڑھے بارہ بجے دن تک ہوتا تھا۔ ساڑھے سات بجے سے ہر گھنٹہ جاوید یہی سوچتا رہا کہ آج ملتان پرنسپل سے بات کرے گا۔ ابھی تو آٹھ بجے ہیں ابھی نو ابھی دس۔ پرنسپل آتا بھی تو دس بجے ہے۔ گیارہ بجا۔ بات ہو چکی ہوگی۔ خدا کرے موافقت میں گفتگو ہو۔ بارہ بجا ایک بجا دو بجا۔ آج شام کا انتظار کون کرے۔ یہیں کالج میں ہی پوچھ لیں گے انجام کیا ہوا۔ جاوید اسٹیٹ آفیسر کے روم میں گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ آتے جاتے چپراسی سے پوچھا اس نے کہا آج ادھر آئے نہیں۔ چار بجا پانچ بجا۔ جاوید پانچ بجے کالج سے متفکر و پر اندیشہ اپنے فلیٹ پر پہنچا۔ سات بجے شام میں اس نے شارق کو فون لگایا۔

''بھئی شارق صاحب ملتان میاں کہاں ہیں۔ میں نے کالج میں پانچ بجے شام تک ان کو ڈھونڈا۔ وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ کل انھوں نے اپنے گھر میں آج کی شام کا وعدہ کیا

تھا۔ معلوم نہیں پرنسپل سے کیا طے ہوا۔ لیکن وہ صاحب ہیں کہاں۔''

شارق نے کہا'' آپ تھوڑی دیر کے بعد فون کیجئے۔ میں فون پر انھیں ڈھونڈتا ہوں۔''

آدھے گھنٹے کے بعد جاوید نے شارق کو فون پر پوچھا'' کچھ پتہ چلا۔''

''ارے وہ بندہ دن کے دو بجے ہی کالج سے نکل گیا تھا کسی شادی میں شریک ہونے۔ ابھی تک گھر نہیں لوٹا ہے۔''

''پرنسپل سے اس کی بات ہوئی یا نہیں؟''

''ہاں ہوئی۔ پرنسپل نے کہا اس سلسلے میں کل بات کریں گے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ پورے دن صبح سے شام تک کے انتظار کا یہ حاصل ہے۔''

''چلئے آج نہیں کل ہو جائے گی میں اس سے فون پر پھر بات کروں گا'' شارق نے کہا۔

جاوید کا دوسرا دن کالج میں اسی بے چینی سے گذرا۔ صبح سے ہی گھنٹے گھنٹے شمار کرتا رہا کہ کب دس بجے اور ملتان پرنسپل معاہدہ انجام پائے۔ پانچ بج گئے۔ وہ ملتان خان کے چیمبر میں گیا۔ ادھر ادھر فون کرنے کے بعد وہ جاوید سے مخاطب ہوئے۔ بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ تو آپ کے متعلق کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ میں نے کہا وہ شخص بھی اپنے کالج کا ملازم ہے۔ اس کا ایک مسئلہ ہے۔ آخر اس کو کون سنے گا۔ آپ کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ آپ کے ہاتھوں ہی وہ کاغذ بنے گا۔ ورنہ وہ کہاں جائے گا۔ پرنسپل نے کہا وہ جس نے میری شکایت ٹرسٹی سے کی تھی۔ ملتان نے کہا۔ کی تھی، پرانی بات ہوگئی۔ اب اس کو لے کر آپ اس کا مستقبل کیوں تاریک کر رہے ہیں۔ آپ اپنی شرائط بتایئے اور پھر اس کو ریلیو کر دیجئے۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ کہتے کہتے ملتان کے چہرے پر کرختگی آ گئی تھی۔

پرنسپل نے کہا۔''اس مسئلے کو اب کل کالج کی نوتشکیل شدہ ہائی پاور ایکشن کمیٹی دیکھے گی۔ اب فیصلہ کمیٹی کے ہاتھوں میں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''لیکن کمیٹی کے صدر تو آپ ہی ہیں۔'' ملتان نے کہا۔

''ہاں ہیں تو لیکن فیصلہ تمام ممبران کی متفقہ رائے سے ہوگا۔'' پرنسپل نے کہا۔

''ٹھیک ہے میٹنگ ہی سہی۔'' اتنا کہہ کر ملتان پرنسپل چیمبر سے باہر آ گیا۔

ملتان نے سمجھ لیا پرنسپل بذات خود کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ دراصل اس معاملے کو طول دینا چاہتا ہے وہ اپنی انتقامی ذہنیت سے باز نہیں آئے گا۔ خواہ مخواہ تاخیر کرتا جارہا ہے۔ خدا معلوم اس کا کیا ارادہ ہے۔

ملتان نے جاوید سے کہا۔ ''تو جناب یہ ہے آج کی روداد۔ وہ بندہ میٹنگ کی رٹ لگائے بیٹھا ہے اور کچھ سننے اور کرنے کو تیار نہیں۔ اب تو جو ہوگا میٹنگ میں ہی اور میٹنگ میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہر طرح کے ممبر ہیں۔ ہیں تو تمام کالج کے پروفیسران ہی لیکن کون کیا بولے گا کہنا مشکل ہے۔''

پرنسپل اور قوی نے مینجمنٹ سے ساز باز کرکے کالج میں ایک ہائی پاور ایکشن کمیٹی بنائی تھی جس میں اپنے گروپ والوں کو ممبر بنالیا تھا اور کالج کے پروفیسروں کے ہر مسئلے کو خود نہیں بلکہ ہائی پاور ایکشن کمیٹی میں سلجھاتے تھے۔ یہ کہئے سلجھاتے کم الجھاتے زیادہ تھے۔

''اور یہ ہائی پاور ایکشن کمیٹی کی میٹنگ کب ہوگی؟'' جاوید نے پوچھا۔

''تین دن بعد یعنی آج سے چوتھے دن۔''

جاوید نے بڑی مایوسی کے ساتھ ملتان سے کہا کہ میٹنگ میں آپ ہی میری آواز اٹھا سکتے ہیں۔ دوسرے ممبران سے ہمارے تعلقات بس یونہی ہیں۔

ملتان نے کہا آپ فکر نہ کریں۔ ہم سے جو ہوگا ہم ضرور کریں گے۔

خدا حافظ کہہ کر جاوید ملتان خاں کے دفتر سے باہر آ گیا۔

چوتھے دن میٹنگ نہیں ہوئی۔ معلوم ہوا دو دن بعد ہوگی۔ دو دن کے بعد کہا گیا تین دن بعد ہوگی۔ جوائننگ کی آخری تاریخ کو ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔

کالج کی کینٹین میں اورنگ آباد متوطن پروفیسر صولت حسین چائے پی رہے

تھے۔جاوید بھی موجود تھا۔ایک پروفیسر نے کہا بھئی جاوید کی ریلیونگ میں روز بروز تاخیر ہوتی جارہی ہے۔دودن کے بعد کہا گیا تین دن بعد۔پروفیسر صولت حسین نے کہاہاں بھئی جاوید جلدی یہاں سے نکل لو۔وہاں نئی نئی باتیں ہورہی ہیں۔

''کون سی باتیں؟''

''یہی کہ کیا جاوید جوائن کریگا۔ارے اس کے کالج کا پرنسپل تو اپنے شہر کا ہے۔اس سے کچھ ایسا کرائیں گے کہ جاوید ریلیو ہی نہ ہو پائے دیکھو جاوید کوئی تدبیر کرو۔کوئی ٹھیک نہیں ہے یہ پرنسپل وہاں کے دوسرے نمبر کے کنڈیڈیٹ سے کوئی سازباز کرچکا ہو۔تم کوریلیونہیں کرے گا۔ظاہر ہے نمبر دو کنڈیڈیٹ کو جوائن کا موقع خود بخود مل جائے گا۔''

یہ سن کر تو جاوید کے ہوش اڑ گئے۔اب کیا کریں۔اتنی محنت سے انٹرویو دیا۔خدا کے فضل وکرم سے سلیکشن ہوااور اتنی آسانی سے مجھ سے ہاتھ آیا موقع چھین لیا جائے گا۔کیا کریں،کس سے ملیں۔کس سے کہیں۔کہاں جائیں۔کون ہے میرا۔مجھے تو کوئی جانتا بھی نہیں۔سوچ سوچ کر جاوید کا ذہن پھٹنے لگا۔اسی حالت میں اپنے فلیٹ پر پہنچا۔

بیوی نے جاوید کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔پوچھا کیا بات ہے۔جاوید نے آج کی پوری روداد سنادی۔سن کر وہ بھی متفکر ہوگئی۔کہنے لگی دیکھ لینا اس پرنسپل کا ایک دن بہت برا ہوگا۔جو دوسرے کا برا کرتا ہے خود بھی گڑھے میں گرتا ہے۔عین اس وقت امن امام صاحب آگئے۔یہ صاحب جاوید کے پرانے دوستوں میں تھے۔وفاشعار، جاں باز، مددگار قابل اعتبار دکھ اور سکھ کے ساتھی ایک سچا دوست اور مقامی اخبار کے مالک اور مدیر۔تینوں چائے پیتے رہے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔جاوید کے ماجرائے غم کو سن کر امن امام صاحب طیش میں آگئے کہنے لگے۔''ارے یہ پرنسپل کیا کرے گا۔وہ کوئی فرعون تو ہے نہیں۔ایک کالج کا پرنسپل ہے۔اس سے کوئی بڑا ہے کہ نہیں۔چلئے بمبئی اس ٹرسٹ کے صدر سکریٹری اور ممبران سے ملیں گے۔ممبران کے دوست کو ہم جانتے ہیں۔وہاں سے اجازت نامہ لے کر آئیں گے۔تب تو یہ چھوڑے گا اور اجازت نامہ کیسے نہیں ملے گا۔ضرور

ملے گا۔ ہمارے بھی لوگ بمبئی میں رہتے ہیں۔ اس پرنسپل کی تو ایسی کی تیسی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ کورٹ سے اس کے نام کا آرڈر نکلوائیں گے۔ تب تو کرے گا۔''

جاوید نے کہا۔ ''دھیرے بولئے بازو کے فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے وہ پرنسپل کا جاسوس ہے جونیئر کالج میں پروفیسر ہے۔ آپ بول کر چلے جائیں گے۔ بدنامی میری ہوگی۔''

''ارے آپ لوگ اس طرح ڈر ڈر کر کب تک جئیں گے۔ کھل کر ہمت سے مقابلہ کر جیئے ورنہ زندگی بھر ڈرتے رہئے گا۔ اس قسم کا پرنسپل اصل میں پھکا ہوتا ہے ان کی گیدڑ بھبکیوں سے گھبرایئے مت۔ پیسے لے لے کر گیارہویں بارہویں اور بی اے، بی ایس سی، بی کام میں داخلہ دیتا ہے اور بات کرتا ہے ایمانداری اور خدمت وفرائض کی۔''

''ارے آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ پیسہ لیتا ہے؟''

''ہاں بے شک لیتا ہے میرے پاس ثبوت ہے وہ طالب علم ہے جس نے پیسہ دیا ہے۔ میں اس طالب علم کو لاکر سب کے سامنے کھڑا کردوں گا۔ تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ پہلے وہ طالب علم خود ملا تھا اسے ڈانٹ کر بھگا دیا کہ جاؤ۔ سیٹ نہیں ہے۔ پھر اس نے ایک ایجنٹ کو تیار کیا۔ پیسے دیے وہ ایجنٹ طالب علم کا فارم لے کر اس سے ملا اور داخلہ مل گیا۔ ظاہر ہے ایجنٹ نے مول جول کر کے دستخط کرالیے اور بات کرتا ہے فرض کی ایمان کی۔ جھوٹا کہیں کا۔ آپ بمبئی چلیے میں یہ سب کچھ ٹرسٹ کے صدر وسکریٹری کو سناؤں گا اور دیکھیے پرنسپل کی کھٹیا کیسے کھڑی کرتا ہوں۔ وہ جانتا نہیں میں پریس کا آدمی ہوں۔ ہم جیسوں سے سرکار ڈرتی ہے یہ کس کھیت کا مولی ہے۔ ایک دن ناخن میں کیمرہ یا بٹن میں کیمرہ لگا کر جاؤں گا اور اسی طرح لین دین پر ایک ایڈمیشن فارم پر دستخط کراؤں گا اور دوسرے دن اخبار میں تصویر۔''

جاوید یہ سب سن کر اور پریشان ہوگیا۔ بمبئی تو چلے جائیں۔ وہاں پورا کالا چٹھا ٹرسٹ ممبران کے سامنے رکھ دیں۔ اجازت نامہ لے آئیں مگر یہ شیطان ہی تو ریلیونگ لیٹر بنائے گا۔ وہ بنائے گا مگر اس وقت بنائے جب جوائننگ کی آخری تاریخ نکل جائے تو

نقصان کس کا ہوگا۔اور ہمارے اصلاحی تحریک سے یہ سدھر تو نہیں جائے گا۔اور ممبئ کا اجازت نامہ دیکھ کر تو یہ اور بھی آگ بگولہ ہو جائے گا۔ پہلے کے واقعہ کو لے کر جلا ہوا ہے ہی۔دوسرا ہونے پر جل کر راکھ ہو جائے گا۔اور نقصان میرا۔جاوید نے یہ تمام باتیں بڑے اطمینان اور مدلل طریقے پر امن امام کو سمجھائیں تو وہ بھی چپ ہو گئے اور کہا۔

''تو پہلے آپ کسی طرح ریلیونگ لے کر جوائن کر لیجئے اس بندے کو بعد میں دیکھ لیں گے۔اخبار تو نکلتا ہی ہے بچ کر جائے گا کہاں۔دو خبر میں عقل ٹھکانے آجائے گی۔ بہت بڑا فتن ہے یہ کمینہ۔''

''ارے چھوڑیے کہنے سے کون شریف ہو جاتا ہے۔کوئی راستہ بتایئے۔'' جاوید نے کہا۔

امن امام سوچنے لگے کہ کیا راستہ ہو سکتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''آخر اس کی شرائط کیا ہیں؟''

''یہی تو پتہ نہیں چل رہا ہے۔میٹنگ میں معلوم ہوگا لیکن میٹنگ بار بار کینسل ہو رہی ہے۔اس طرح کینسل ہوتی رہی تو جوائننگ کی آخری تاریخ نکل جائے گی اور یہی اس کا پلان ہے۔''

''اس میٹنگ میں کون کون رہیں گے؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''کس کو معلوم ہے؟''

''وائس پرنسپل جلیل کو اور شارق امام کو۔''

''تو ان دونوں سے پوچھ کر ہمیں بتایئے۔ہم ان لوگوں سے ملنے اور کام کرانے کی سبیل کریں گے۔آپ فکر نہ کریں۔مجھے تو لگتا ہے یہ بے ایمان پیسے کھائے گا۔سارا کھڑاگ اسی لیے ہے۔ہم تو پریس والے لوگ ہیں۔ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہی رہتی

ہیں۔ یہ اسی قبیل کا لگتا ہے۔ دیکھئے گا میٹنگ میں کچھ نہیں ہوگا سوائے یہ کہ ریلیونگ کے کتنے پیسے۔''

''ہاں دیکھئے میٹنگ میں کیا ہوتا ہے۔'' جاوید نے کہا۔

''جو بھی ہو ہمیں بتائیے۔'' یہ کہتے ہوئے امن امام نے جانے کی اجازت مانگی۔ خدا حافظ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔

جاوید کی بیوی نے کہا۔'' آپ شارق امام کو فون لگائیے۔ وہ جہاں بھی ہو گھر پر یا کہیں باہر اس سے ملئے اور ہائی پاور ایکشن کمیٹی کے ممبران کے نام معلوم کیجئے اور ان سے ملنے کی تدبیر کیجئے تا کہ وہ میٹنگ میں آپ کی بات رکھ سکیں نہ پورے آدھے بھی۔ ملتان صاحب کا ایک ووٹ تو ہے۔ فوراً شارق امام سے ملئے۔'' شارق امام کا فون لگ گیا۔ اس نے فلیٹ پر بلایا۔ جاوید تھوڑی دیر میں ان کے فلیٹ پر حاضر ہو گیا۔

'' کہئے کیا خبر ہے؟'' شارق نے پوچھا۔

''کیا خبر رہے گی۔ تیلی کے بیل والی حالت ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''ملتان نے کیا کہا؟''

''انھوں نے بتایا کہ پرنسپل اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتے۔ ہائی پاور ایکشن کمیٹی ریلیونگ پر بحث کرے گی۔ وہیں جو فیصلہ ہوگا۔''

''اس کمیٹی کے ممبران کون کون ہیں؟''

شارق نے یاد کرتے ہوئے کہا۔'' سرفراز جلیل، ملتان، عبدالقوی۔''

''ان پانچوں میں سے آپ سے اچھے تعلقات کن سے ہیں؟'' شارق نے پوچھا۔

''بھئی ہم سے تعلقات کیا ہونگے۔ یہ میرے رشتے دار، نہ ہم وطن، اور نہ ہی گہرے دوست بس کالج کی حد تک ایک پروفیسر دوسرے پروفیسر کو جتنا جانتا ہے وہی ہمارے تعلقات ہیں۔'' جاوید نے کہا۔

''تو گویا ان میں سے کوئی آپ کا دوست نہیں۔ ایسی صورت میں یہ سب میٹنگ

میں آپ کے خلاف بولیں گے۔اور آپ کو ریلیو نہیں کیا جائے گا اور آپ یونیورسٹی میں جوائننگ نہیں کر پائیں گے۔ جاوید صاحب لوگوں سے میل جول رکھنا چاہیے۔کیا پتہ کون کب کام آجائے۔اگر آپ نے پہلے سے ان سے تعلقات رکھا ہوتا تو آج یہ نوبت نہیں آتی۔"

"جناب شارق صاحب میں یونیورسٹی میں ملازمت کیلئے انٹرویو دینے گیا تھا۔ خدا کے فضل سے کامیاب ہو گیا۔اگر یہ معلوم ہوتا کہ سلیکشن کے بعد یہ نوبت آئے گی تو میں انٹرویو کی تیاری کے ساتھ ساتھ ان حضرات سے تعلقات بھی قائم کر لیا ہوتا۔کیا ہی بہتر ہو کہ ملازمت کی درخواست فارم میں یونیورسٹی یہ بھی لکھ دیا کرے کہ امیدوار جنھیں امید ہو کہ ان کا انتخاب ہو جائے گا وہ اپنے متعلقہ ادارے کے پروفیسروں اور کلرکوں سے اچھے تعلقات بھی قائم کر لیں کیونکہ ان کے معاملہ پر اس ادارے کے ہائی پاور ایکشن کمیٹی میں غور و خوص کیا جائے گا۔ پرنسپل کے شعبہ سے ایک پروفیسر لین لے کر امریکہ گیا کہ وہاں سے لوٹ کر اسی کالج میں واپس آئے گا۔ وہ امریکہ سے سیدھے اورنگ آباد چلا گیا اور وہاں کے کالج میں جوائن کر لیا۔ وعدہ نبھایا اور نا ہی ایک پیسہ دیا اس کا کیا کر لیا انھوں نے۔ شارق صاحب آپ ہم جیسے بے سہاروں، کمزوروں اور غریبوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جناب حقیقت تو یہ ہے کہ ہم یہاں اپنے ہی ملک میں مہاجر ہیں۔ہم دوسری ریاست سے روزی روٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ہم کچھ بھی کر لیں ہمیں باہر کا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں والے کچھ بھی نہ کریں اپنوں میں شمار ہوتے ہیں۔آج اگر کسی مقامی نے یہ عہدہ حاصل کیا ہوتا تو اخباروں میں تصویریں شائع ہوتیں کالج میں جشن ہوتا۔لیکن ایک مہاجر کی کامیابی پر سب کو سانپ سونگھ گیا ہے دراصل شارق بھی بالواسطہ جاوید کو ذلیل کر رہا تھا۔ہم نے تعلیمی میدان میں ریسرچ پروجیکٹ، ریسرچ گائیڈ نگ، مقالے لکھنا، سیمنار میں شرکت کرنا، سیمنار کرانا، کیا نہیں کیا۔ایک ٹیچر ہونے میں کون سی کمی کی۔ جب بھی جو حکم دیا گیا پورا کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جب وقت آئے گا یہ تعلیمی کاوشیں نہیں دیکھی جائیں گی۔ دیکھے جائیں گے تعلقات، جان پہچان، خوشیا برداری۔ مجھے تو آج بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ کاش کچھ اور کیا

ہوتا۔ پروفیسر شپ کے لیے کسی سے میں نے ذکر بھی نہیں کیا کہ فارم بھرا ہے۔ اور ریلیونگ کے لئے دردر بھٹکنا پڑے گا یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ان لوگوں کو اگر میرے اعلیٰ تعلیم ریسرچ اور تصنیف وتالیف سے حسد ہے دکھ ہے تو مجھے فوراً ریلیو کر کے راندہ درگاہ کردیں نہ کہ اس طرح اس سے ملو، اس سے بات کرو، میٹنگ میں دیکھا جائے گا۔ میٹنگ کے ممبران سے ملو، ان کے گھر جا کر خوشامد کرو، جیسے ہم ریلیونگ نہیں مانگ رہے ہیں بلکہ اپنی زندگی کی بھیگ مانگ رہے ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مائناریٹی کے کالج میں سارے مسلمان بھائی مجھے کافر کی طرح سلوک کریں گے تو میں ہرگز ہرگز اس ادارے میں نہیں آتا۔ میرے پاس دوسرے مواقع بھی تھے۔ اور مواقع نہ بھی ہوتے تو اپنی یونیورسٹی سے نکلتا نہیں۔ مجھے فیلوشپ اچھی خاصی مل رہی تھی۔ آج میں نیت کرتا ہوں کہ زندگی میں کسی کو مائناریٹی کے ادارے میں کام کرنے کا مشورہ نہیں دونگا۔''

''ارے آپ تو برامان گئے۔ میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ کوئی راستہ ضرور نکلے گا انشاء اللہ۔ ذرادوڑ بھاگ کرنی پڑے گی۔ اب کیا کیجئے گا۔ یہاں پر لوگ اسی قسم کے ہیں۔ آپ بڑی مشکل سے ان کے شکنجوں میں آئے ہیں۔ ایک بار آزاد ہو گئے تو انھیں ستانے کا موقع پھر کہاں ملے گا۔ اس لیے یہ آپ کو پوری طرح اذیت دینا چاہتے ہیں۔ ذہنی چوٹ پہنچانا چاہتے ہیں۔ دکھ دینا چاہتے ہیں۔ آپ جس عہدے پر جارہے ہیں ان ممبران میں سے کوئی نہیں جاسکا۔ ان کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں پہنچا۔ اس کالج کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ ایک شخص سیدھے پروفیسر بن کر جارہا ہے۔ یہ انھیں برداشت نہیں ہورہا ہے۔ ان کے بس میں نہیں ہے ورنہ یہ لوگ آپ کا تقرر نامہ چھین کر پھاڑ دیتے۔ یہ ذہنیت ہے ان کی اور ان ہی سے آپ کو ریلیونگ حاصل کرنا ہے۔ گویا شیر کے منہ سے شکار چھیننا ہے۔ اس کے لئے ان کے طعن وطنز کو سننا پڑے گا۔ صبر کرنا ہوگا۔ کیا کیجئے گا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ اگر ریلیونگ نہیں لیں گے تو یہ سب دونوں ہاتھوں سے اس طرح تالیاں بجائیں گے گویا انھیں اپنے پرانے دشمن پر کامیابی مل گئی۔''

''ہاں تو آپ ہی بتائیے۔اب کیا کرنا ہوگا۔'' جاوید نے کہا۔

''دیکھئے ان پانچوں سے ملنا پڑے گا۔ان سے گذارش کرنی ہوگی۔ان کے گھر جانا ہوگا۔ان کو مٹھائی کا ڈبہ دینا پڑے گا۔یہ سب بھول جائیے کہ ان میں سے کوئی آپ کے کالج آفس کا کلرک ہے،کوئی جونیر کالج بارہویں کا پروفیسر ہے۔سب سے پہلے میاں جلیل سے مل لیجئے۔میں ان سے کل کالج میں مل لوں گا۔آپ کا ذکر بھی کردونگا۔آپ کل شام مٹھائی کا ایک بڑا ڈبہ لے کر ان کے گھر جائیے۔ان کے سامنے ان کی خوب تعریف کیجئے۔ یہ نام کا وائس پرنسپل ہے۔پرنسپل اس کو منہ نہیں لگاتا ہے۔لیکن اس پرنسپل کے پہلے سے یہ وائس پرنسپل ہے اس لئے موجودہ پرنسپل کی مجبوری ہے اس کو رکھنا ورنہ کب کا اس کو اکھاڑ پھینکا ہوتا۔ان سب باتوں کے باوجود آپ ان کے منہ پر کہئے کہ آپ اس کالج کی انتظامیہ اور تعلیمی امور میں بڑا اہم کردار رکھتے ہیں۔اس کالج کی ترقی میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔آپ ایک دن پرنسپل ضرور بنیں گے۔لوگ کہتے ہیں کہ اصل کام تو جلیل صاحب ہی کرتے ہیں نام پرنسپل کا ہوتا ہے دراصل آپ پرنسپل میکر ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ یاد آئے تو کہہ دیجئے۔خوش ہوجائے گا۔خوشامد پسند ہے۔ایک یونیورسٹی پروفیسر اس کی اتنی تعریف اور منہ پر کررہا ہے وہ اپنے آپ کو عرش معلٰی پر سمجھے گا۔اچھی کوالیٹی کی مٹھائی لے لیجیے گا۔بچے، بیوی یعنی بھابھی کی تعریف کیجئے گا۔اس کے مخدوش فلیٹ کو اچھا بتائیے گا۔اس کے بے نام ونشان ڈپارٹمنٹ کی تعریف کیجئے گا اس کے کار کی تعریف کیجئے گا۔سمجھ لیجئے وہ آپ کے FAVOUR میں بات کرے گا۔''

شارق کی نصیحتیں سن کر جاوید اپنے فلیٹ آ گیا۔بیوی سے بتایا۔کھانا کھایا اور سو گیا۔

کل روزانہ کی طرح وہی سورج نکلا۔وہی ہوا چلی،وہی راستے وہی اسکوٹر اور وہی کالج۔صبح گذر گئی،دوپہر آئی اور شام بھی ہوئی۔جاوید مٹھائی کی دوکان کی طرف چلا۔دو کیلو کا پیکٹ بندھوایا اور جلیل صاحب کے فلیٹ پر پہنچا۔بیل دی۔انھوں نے دروازہ کھولا۔

''سلام علیکم۔کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ جاوید نے کہا۔

''وعلیکم السلام آیئے آیئے۔'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان کی بیوی نے اپنے کمرے سے پوچھا کون ہے؟

''وہ جاوید صاحب آئے ہیں۔'' جلیل صاحب نے کہا۔

جاوید نے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا اس میں تھوڑی سی شیرینی ہے بچوں کے لیے ہے۔

''ارے رے اس کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو آپ کا گھر ہے۔''

''ہاں وہ تو ہے پھر بھی خالی ہاتھ اچھا نہیں لگتا ہے۔''

جلیل صاحب نے ڈبہ لے لیا۔ ایک طرف رکھدیا۔ اور جاوید سے مخاطب ہوئے

''اور سنایئے کیا حال ہے۔ بیوی بچے۔''

''سب خیریت سے ہیں۔''

''اور کوئی خاص بات۔'' (جلیل نے جان بوجھکر پوچھا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ خاص بات ریلیونگ ہے) ''کیا رہے گی آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ریلیونگ کا معاملہ اب ہائی پاور ایکشن کمیٹی میں چلا گیا ہے۔ اس کمیٹی میں آپ بھی ممبر ہیں۔ دوبار میٹنگ کی تاریخ بدل گئی ہے۔ اب تیسری بار پرسوں ہے۔ پرنسپل صاحب نے بذات خود کچھ نہیں کیا۔ جو کرے گی کمیٹی۔''

''ہاں وہ آپ کے ٹرسٹی والے واقعہ کو لے کر بہت خفا ہیں حالانکہ جیسا آپ نے بتایا ٹرسٹی کو آپ نے شعبہ کا کمرا دکھایا تھا کہ شعبہ کو کمرا مل گیا ہے۔ مگر پرنسپل کا کہنا ہے کہ اس نے ٹرسٹی کو کمرا دکھا کر میری شکایت کی۔''

''ہاں انھوں نے غلط کو سہی مان لیا ہے۔ میں نے اس کی وضاحت بھی کی تھی لیکن انھیں میری باتوں پر یقین نہیں ہے۔ خیر وہ واقعہ تو اپنی جگہ ہے۔ فی الوقت میٹنگ میں کیا ہوگا میں اس کے لیے پریشان ہوں۔''

''دیکھئے میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرونگا۔ پرنسپل کا راست ہاتھ ملتان

کلرک یعنی اسٹیٹ آفیسر ہے۔ آپ اس کو تیار کر لیجئے آپ کا آدھا کام ہو گیا۔''

''ملتان خان تو آپ کے دوست ہیں، آپ ہی کہیں گے۔ اور آپ ان کو کہیں گے تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ بہتر ہوتا اگر انھیں یہاں بلا لیا جاتا۔ آپ سے تو بے تکلفی ہے۔ آپ کے یہاں آنا جانا بھی رہتا ہے۔''

اچھا میں فون کر کے دیکھتا ہوں گدھا کہاں گھاس چر رہا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے فون لگایا۔ ارے یار ملتان کہاں ہو۔ (کلرک سے اس طرح بات کی جیسے وہ ان کا لنگوٹیا یار رہے) تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر پر آؤ فون رکھدیا اور کہا۔ ملتان یہیں آ رہا ہے۔ آنے دیجئے۔ یہیں سامنے میں اس سے بھی گفتگو ہو جائے گی۔ تب تک ان کی بیگم چائے لے آئیں۔ گھریلو باتیں ہوتی رہیں۔ ان کے بچے ادھر ادھر بھاگتے رہے۔ شور کرتے رہے۔ چائے پینے کے بعد ان کی بیگم کچن میں چلی گئیں۔ بیل ہوئی ملتاں خاں آ گئے پانچ منٹ بعد پروفیسر شارق بھی پہنچ گئے۔

شارق نے فون لگایا مولانا کو۔ دس منٹ میں وہ بھی آ گئے۔ طے یہ ہوا کہ سب لوگ قریب کے ریستوران میں چلیں وہیں تفصیل سے تبادلہ خیال ہوگا۔ جاوید نے خاکساری سے پروفیسر جلیل احمد سے کہا کہ آپ نے پہلے بھی ہماری مدد کی ہے۔ آپ کی مدد کے بغیر یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ اور آج پھر ایک ضرورت پڑ گئی ہے۔ جس میں آپ کا تعاون لازمی ہے۔ پہلے بھی مدد میں اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا جس میں جاوید کو مالک مکان نے فوراً فلیٹ خالی کرنے کو کہا تھا۔ لاج کے کرایہ کے روم میں ضروری سامان پہنچا دیا تھا۔ لیکن کتابیں تیرہ کارٹون میں تھیں۔ ان کو لاج میں لے جانا ناممکن تھا۔ بارش کا زمانہ تھا۔ جلیل صاحب کے فلیٹ کے اوپر کی منزل میں ایک نامکمل فلیٹ تھا۔ کنسٹرکشن کا کام باقی تھا لیکن چھت پڑ گئی تھی جاوید نے جلیل صاحب کے گھر جا کر اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ کہا کہ فلیٹ خالی کرنا پڑ رہا ہے ہماری کچھ کتابیں اور چھوٹی موٹی چند چیزیں ہیں۔ فی الوقت مجھے ایک بیڈ لاج میں مل گیا ہے ہفتہ دس دن میں ماہانہ کرایے والا کمرہ خالی ہوگا اور مجھے ہی ملے گا۔ ملتے

ہی میں اپنی کتابیں لے جاؤنگا۔ان کے اوپر کی منزل میں جو نامکمل فلیٹ تھا وہ اسی کالج کے ایک پروفیسر کا تھا اور اس کی چابی جلیل صاحب کے پاس رہتی تھی۔جلیل صاحب مان گئے اور کہا کتابیں اسی فلیٹ میں رکھ دیجئے۔

اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے جاوید نے ان سے کہا کہ آپ نے پہلے بھی مجھ پر احسان کئے ہیں۔جب پورا قافلہ زینے سے نیچے اتر رہا تھا جاوید سب کے پیچھے تھا۔جلیل صاحب کی بیگم دروازے پر کھڑی سب کو رخصت کر رہی تھیں۔جاوید نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا بھابی آپ کے پہلے بھی ہم پر بڑے احسانات رہے ہیں آج پھر ضرورت آن پڑی ہے جلیل بھائی سے آپ خود کہیں گی تو میرا کام آسان ہو جائے گا ہم پہلے بھی آپ کے مشکور تھے آج دوبارہ آپ کی مدد چاہئے۔

اتنا کہتے کہتے جاوید کی آواز جیسے اس کے حلق میں بیٹھ گئی۔اس نے نظریں نیچی کرلیں۔اسے خود اپنے آپ پہ شرم آرہی تھی۔اس کے بس میں ہوتا تو وہ غیرت سے زمین میں گڑ جاتا۔اس ریلیونگ کے لیے یہ سب کرنا پڑے گا۔اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔یا خدا کس کس کے دروازے پر جانا پڑے گا۔ابھی تو یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔یہ نئے نئے لوگ زیادہ تر صرف ایم اے سکنڈ کلاس ان کی خوشامد کس کس طرح کرنا پڑے گی۔ مجھے تو یہ فن آتا ہی نہیں۔کبھی کی ہی نہیں۔

ایسے موقع پر کیسے بولتے ہیں۔کون سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔لب ولہجہ کیسا رہتا ہے آواز کتنی دھیمی رکھنی پڑتی ہے کچھ بھی تو نہیں معلوم۔کہیں کوئی یہ نہ کہدے کہ ابے پروفیسر تو تو بالکل کورا ہے۔تجھے تو خوشامد بھی کرنا نہیں آتی تو کیا جواب دونگا۔آج ہی کا دیکھو پہلے اس کے شوہر کے سامنے نظریں نیچی کر کے مدد کی بھیک مانگی اب اس کی بیوی سے پرانے احسانوں کا ذکر کر کے نئے احسان کے لئے ہاتھ پھیلایا جا رہا ہے۔ان کی بیوی نے کہا ہاں ٹھیک ہے ہم ان سے بول دیں گے۔

”قافلہ سیڑھی سے باہر آ گیا۔جلیل صاحب نے اپنی سیکنڈ ہینڈ کار روڈ پر

نکالی۔ سب لوگ اس میں بیٹھ گئے۔ کار پانچ منٹ چلنے کے بعد رک گئی۔ ریسٹورنٹ میں سب آہستہ آہستہ جوس پی رہے تھے۔ پی لیا۔ شارق نے کہا۔ ''ہاں تو جلیل بھائی جاوید صاحب کا کیا ہوگا؟''

انھوں نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کہا (جیسے جاوید ایک اونٹ ہے اور آج پہاڑ کے نیچے آیا ہے) ''کیا ہوگا یہ تو ملتان صاحب بتائیں گے۔ یہ تو پرنسپل کے دایاں ہاتھ ہیں۔''

ملتان نے کہا۔ ''ارے میں دایاں ہوں یا تم ہو۔ تمہاری ایک جیب میں پرنسپل ہے اور دوسری میں عبدالقوی وائس پرنسپل جس کی ہر بات پرنسپل مانتا ہے۔''

شارق نے کہا۔ ''سمجھ گیا میں سمجھ گیا آپ دونوں ہی پرنسپل کے دست راست ہیں۔ لیکن میٹنگ میں یہ بات طے ہونی ہے۔''

پروفیسر جلیل نے کہا۔ ''ہاں یار چار پانچ پروفیسر اور ہیں لیکن پرنسپل تو جاوید سے بہت ناراض ہیں معلوم نہیں میٹنگ میں وہ کیا انداز اختیار کرے۔'' جلیل صاحب نے اس پرانی بات کے ذکر سے پھر جاوید کو متفکر اور اداس کر دیا۔ آخر یہ لوگ کہاں تک ہمیں ترانہ سناتے رہیں گے۔ سنا سنا کر آخر کتنا بزدل اور نالائق ثابت کرنا چاہتے ہیں یا کہیں ان کا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ پروفیسر منتخب ہو گئے ہو اپنی جگہ لیکن ہم لوگوں کے سامنے تم بہت بڑے الو اور گدھے ہو۔

شارق نے کہا۔ ''ہاں پرنسپل ناراض ہے مجھے بھی معلوم ہے لیکن آخر آپ لوگ کس لیے ہیں۔ آپ لوگوں نے کیسے کیسے خطرناک کام انجام دیے ہیں اور بال بال بچ گئے یہ ناراضگی کیا ہے۔''

پروفیسر جلیل چونک پڑے۔ ''ابے تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ ہم لوگوں نے کیا خطرناک کام کیا ہے۔ اور بال بال کون بچا۔ آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے۔ تو کون سا شریف ہے میں جانتا ہوں تم کو۔'' شارق مسکراتے رہے۔

ملتان خان نے کہا۔ ''یہ بدمعاش کسی کو بخشے گا نہیں اس سے تم (جلیل) ہوشیار

رہو۔ ایک دن یہ تم کو لپیٹ دیگا۔''

''ہاں یار یہ بڑا عیار اور پاجی قسم کا آدمی ہے۔'' جلیل نے کہا۔

''یہ سب رہنے دیجئے کون کیا ہے یہ میں خوب جانتا ہوں۔ منہ مت کھلوائیے۔ فی الوقت جاوید صاحب کا راستہ نکالیے۔'' شارق نے وضاحت کی۔

ملتان خاں نے کہا۔'' راستہ ایسے نہیں نکلتا ہے اس کے لیے پارٹی وارٹی ہونی چاہئے تم کیا سستے میں نکلنا چاہتے ہو۔''

شارق نے پہلے ہی جاوید سے کہا تھا کہ یہ لوگ کھانے پینے والے ہیں۔ یہ ذرا آپ کی جیب ہلکی کریں گے تیار رہئے گا۔

''ارے تم کو پارٹی کہاں چاہئے فائیو رسٹار فور اسٹار کہاں چلنا ہے چلو ابھی چلتے ہو۔ جلیل بھائی کی کار یہیں پر ہے۔'' شارق نے بہ بانگ دہل کہا۔

''نہیں آج نہیں کل چلیں گے۔ وہ جو ایک نیا ہوٹل وانوڑی میں کھلا ہے سنا ہے اس میں چکن بڑا لذیذ بناتا ہے۔ وہیں چلیں گے۔ چکن کھاتے ہوئے جاوید صاحب کے مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' ملتان نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے کل کتنے بجے؟''

''کل رات کا کھانا وہیں کھائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' شارق نے کہا'' تو جاوید صاحب کیا خیال ہے؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کل سب لوگ کہاں کیسے آئیں گے یہ ابھی بتا دیجئے۔''

کل سب لوگ آج ہی کی طرح جلیل صاحب کی بلڈنگ کے نیچے آٹھ بجے رات میں پہنچ جائیں گے۔

جلیل صاحب نے کار سے سبھوں کو اپنی بلڈنگ تک چھوڑا۔ وہاں سے فرداً فرداً سب اپنی اپنی بائیک پہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ رات گذری، صبح ہوئی، دن گذرا اور شام ہوئی۔ جاوید ہر ساعت اور ہر لمحے میں یہی سوچتا رہا کہ خدا معلوم کل کیا ہوگا۔ یہ لوگ ڈنر

کھانے کے بعد کچھ کریں گے یا یونہی مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں۔ اگر کچھ نہیں کیا تو؟۔ شارق، جلیل، ملتان، مولانا کی دعوت کے بعد بھی چار پانچ ممبر اور بچتے ہیں۔ وہ تو دعوت میں نہیں آرہے ہیں پھر ان کی مرضی کا پتہ کیسے چلے گا۔ وہ ہمارے لیے میٹنگ میں کیا بولیں گے۔ وہ الگ مزاج کے ہیں اس دعوت میں تو آنے سے رہے۔ جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان چاروں کے ساتھ دعوت کرنی ہے تو بالکل ہی نہیں آئیں گے۔ ان چاروں ممبر کے بارے میں الگ سے غور کرنا پڑے گا۔ پہلے آج کی دعوت میں یہ چار تو تیار ہو جائیں۔ یہی خیالات جاوید کے ذہن میں کل سے آج تک گردش کر رہے تھے۔

جاوید نے دعوت ممبران کی تمناؤں کا ذکر بیوی سے کیا۔ وہ بولی کرنا کیا ہے اندھیر نگری چوپٹ راجا۔ ایسے حالات میں کیا کر سکتے ہیں۔ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ نااہل جاہل اور کم رتبے کے لوگ جب اعلیٰ عہدوں پر آجاتے ہیں تب یہی ماحول بنتا ہے۔ ایسی ہی ٹولی تشکیل پاتی ہے۔ کھلایئے۔ ان کا دوزخ بھریئے اس کے بعد ادارے کے سربراہ کے ہاتھ گرم کرنے ہونگے۔ کوشش کر لیجے پروفیسر بننا کوئی آسان کام ہے۔ یہی سب سیکھ کر جایئے گا تو بڑے بچوں کو یونیورسٹی میں پڑھایئے گا۔ آنے والی زندگی میں یہ کام آئیں گے۔

ایک ایک کر کے پروفیسر شارق، پروفیسر مولانا، ملتان، پروفیسر جلیل کی بلڈنگ کے نیچے جمع ہوتے گئے۔ نیچے سے شارق نے جلیل صاحب کو آواز دی۔ چھل بل کرتے ہوئے وہ سکینڈ فلور سے نیچے اترے اور اس طرح کار کو اسٹارٹ کیا جیسے کسی کی شادی میں جا رہے ہوں جہاں جم کر کھانا ہے اور رنگ رلیاں منانا ہے۔ مجوزہ ریسٹورنٹ میں تمام حضرات پہنچے۔ آڈر دیا گیا۔ سبھوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے شارق نے کہا۔

''ملتان صاحب اور جلیل صاحب جاوید صاحب کی ریلیونگ کا کیا ہوگا؟''

''یار پرنسپل جاوید صاحب سے بہت ناراض ہے۔ وہی ٹرسٹی والے واقعہ کو لے کر۔'' ملتان نے کہا۔

پتہ نہیں ہر دوسری ملاقات میں جلیل اور ملتان اس واقعہ کا ذکر بلاناغہ کیوں کرتے

تھے۔ کہیں دونوں نے آپس میں طے کرلیا تھا کہ میں بھول جاؤں تو تم اور تم بھول جاؤ تو میں یا کچھ اور تھا جو جاوید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یا پھر دونوں مل کر جاوید کو ذہنی زدوکوب کرنا چاہتے تھے یا دونوں اس بہانے اپنی انا کو تسکین پہنچانا چاہتے تھے یہ سوچ کر کہ کبھی تو یہ ملتا نہیں ہے جب ضرورت پڑی تو پیروں پر گر گئے۔ گویا کالج میں رہنا ہے تو ہم لوگوں سے ہمیشہ ملتے رہو ہم چاہے جیسے بھی ہوں ہمارے ناز اٹھاتے رہو۔

''ارے یہ ڈائیلاگ سن سن کے میرے کان پک گئے۔ آپ لوگ یہ کہانی بند کیجئے پرنسپل ناراض پرنسپل ناراض حد ہوگئی۔ کیا جاوید صاحب کسی سے غیر قانونی طور پر ریلیونگ مانگ رہے ہیں۔ جس میں پرانی داستان کا تتمہ زبردستی کا جوڑا جا رہا ہے۔ ایسے واقعات اس کالج میں ایک ہی نہیں ہیں۔ اس سے بھی سنگین نوعیت کے معاملات ہیں مگر کس نے کس کا کیا اکھاڑ لیا۔ وہ شخص بٹن کھول کر چلتا ہے دل میں جو آئے بکتا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کے بارے میں تو کبھی ایک لفظ نہیں کہا کیونکہ آپ کو معلوم ہے ایسا کرنے پر وہ آپ کو بھی سنائے گا اور آپ اس کا کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ اور دوسری طرف ایک شخص بالکل خاموش ہے اپنی شکایت کی صفائی دے چکا ہے۔ آپ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اپنے کالج کے لیے کتنا بڑا عہدہ حاصل کر کے لایا ہے کتنا بڑا اعزاز حاصل کیا ہے۔ ارے ایسے شخص نے واقعتاً بھی اگر کوئی کوتاہی کی ہو تو اسے بھول جانا چاہئے مگر آپ لوگ ہیں کہ انھیں نمائش کی چیز بنا رکھا ہے۔ آپ لوگ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں ہونے والی میٹنگ میں تو وہ کہئے ورنہ ہم اپنے بل بوتے پر جو ہوگا وہ کریں گے۔'' شارق نے بڑے جذباتی انداز میں سنایا۔

جلیل اور ملتان دونوں بولے ''ارے شارق صاحب آپ خواہ مخواہ خفا ہو گئے۔ ہم لوگ جاوید صاحب کی عزت کرتے ہیں۔ انھوں نے واقعی کالج کے لئے اعزاز حاصل کیا ہے۔ ہم لوگ میٹنگ میں ان کے لیے پرزور وکالت کریں گے۔''

''اور بقیہ ممبران کا کیا ہوگا؟'' شارق نے کہا۔

ملتان نے کہا۔ ''اکنامکس والے سے میں کل بات کروں گا۔''

''سرفراز کو کون تیار کرے گا؟''

پروفیسر جلیل نے کہا۔''سرفراز سے اچھے تعلقات مولانا کے ہیں کیوں صاحب آپ دونوں تو مذہبی پروگرام ایک ساتھ مل کر کرتے رہتے ہیں۔اس لیے انھیں آپ سنبھال لیجئے۔''

مولانا نے کہا۔''یہ سہی ہے کہ ہم دونوں ایسے پروگرام کرتے رہتے ہیں لیکن اس معاملے میں ان کے خیالات کیا

ہیں یہ تو گفتگو کے بعد ہی پتہ چلے گا۔''

شارق نے کہا۔''مولانا آپ اپنی تقریروں میں مسجدوں میں اپنا جھنڈا گاڑنے کا نعرہ لگایا کرتے ہیں یہ ایک چھوٹا سا کام ہے آپ کو پہلے سے پسینے آنے لگے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں تو کیا۔آپ سن لیجئے آپ کو یہ کام کرنا ہے اور سرفراز کو راستے پر لانا ہے۔اور ملتان صاحب پروفیسر وکیل کو آپ برسوں سے جانتے ہیں۔ان سے آپ کل ہی طے کر لیجئے۔کل ہی ایک دن بچا ہے۔پرسوں میٹنگ ہے۔''

''اور عبدالقوی کو کون تیار کرے گا؟''مولانا نے کہا۔

شارق نے کہا۔''ان سے تو آپ کی جماعتی لڑائی ہے۔ان کو شیشے میں اتاریں گے جلیل صاحب۔دونوں کے ایک ہی بلڈنگ میں فلیٹس ہیں۔دونوں ایک دوسرے کے چیمبر میں بیٹھتے ہیں کھاتے ہیں پیتے ہیں۔تو یہ ذمہ داری جلیل صاحب کی۔آپ لوگ یاد کر لیجئے کل ہی کا دن ہے۔کالج میں ان حضرات سے مفصل گفتگو ہو جائے تاکہ میٹنگ میں وہ جاوید صاحب کی مفاہمت میں آواز اٹھائیں۔''

جاوید خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔اسے ایک ناول کے جنگ کا منظر یاد آتا رہا۔جس میں سپہ سالار اپنے معاون سالاروں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم اپنی فوج کے ساتھ دائیں طرف،تم بائیں طرف،تم میرے پیچھے رہو گے اور تم اچانک حملہ کرو گے۔اتنے گھوڑسوار،اتنے پیدل،اور اتنے ہاتھی پر۔ریلیونگ لیڈر ایک بڑے میدان کے کنارے میں

رکھا ہوا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے دشمن کی فوج سے گھمسان کی لڑائی کرنی پڑے گی۔ جیسے بھی ہو غنیم کو شکست دینا ہے۔اس کے بعد ہی ریلیونگ لیڑ پر قبضہ کر سکتے ہیں۔فتح کا نام ہوگا فتح ریلیونگ لیڑ۔

اس گفتگو کے خاتمہ تک کولڈ ڈرنک پی جا چکی تھی۔ملتان نے کہا''یار یہاں سے ایک کیلومیٹر پر ایک نیا کیفے کھلا ہے۔سنا ہے اس میں آئس کریم بڑی شاندار ملتی ہے۔ابھی کوئی زیادہ رات تو ہوئی نہیں ہے۔دس بجے ہیں۔یہی وقت ہے آئس کریم کھانے کا۔اگر ایک ایک آئس کریم ہو جائے تو مزہ آجائے۔''

پروفیسر جلیل نے کہا۔''ہاں یار میں نے بھی سنا ہے اس آئس کریم کے متعلق۔''

شارق نے کہا۔''ارے شیطانوں آئس کریم بھی کھالیں گے مگر یہ مت بولو کہ سنا ہے۔مجھے تو لگتا ہے تم لوگوں نے وہاں کی آئس کریم کھائی بھی ہے۔مزید کھانے کے لیے کہہ رہے ہو سنا ہے۔چلئے جلیل صاحب کار اسٹارٹ کیجئے چلتے ہیں۔کار سے سب لوگ اس ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ریسٹورنٹ کے باہر کھلی جگہ میں کرسیاں لگی تھیں اور تین چار قدم پر ایک بڑا سا میدان تھا۔کشادہ جگہ تھی۔خوب ہوا لگ رہی تھی۔میدان کے دوسرے کنارے سے روڈ تھی اس لیے گاڑیوں کے آنے جانے کا شور زیادہ نہ تھا۔گویا واقعی بڑی پر لطف جگہ تھی۔آئس کریم میز پر آگئی۔سب لوگ کھاتے رہے۔متعلقہ باتیں ہوتی رہیں۔کھانے کے بعد ایک بار پھر سب لوگ جلیل صاحب کی بلڈنگ تک آئے۔رخصت ہونے کے پہلے جاوید نے پروفیسر جلیل، ملتان اور مولانا سب سے گذارش کی کہ میرے مسئلے کو حل کر دیجئے ہم آپ کے بہت مشکور وممنون ہونگے۔ہاں ضرور کریں گے یہ کہتے ہوئے سبھی رخصت ہوگئے۔شارق نے اپنا اسکوٹر جاوید کی بلڈنگ کے پاس لگایا تھا اس لیے وہاں تک پیدل جانا تھا۔وہ جاوید کے ساتھ چلنے لگے۔

''شارق صاحب کیا امید ہے؟'' جاوید نے پوچھا

''آپ متفکر نہ ہوں۔ہوگا انشاء اللہ ضرور ہوگا۔یہ تینوں تو مان گئے۔بقیہ دو ایسے

ہیں جنھیں تیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی پرنسپل کی نگاہ میں بڑی اہمیت ہے۔ اگر انھوں نے اختلاف کیا تو آپ کا کام رک جائے گا۔''

''لیکن ادھر جلیل صاحب اور ملتان صاحب اور مولانا صاحب نے تو کہا ہے کہ وہ انھیں راضی کرلیں گے۔'' جاوید نے کہا۔

''ارے یہ ان کا کہنا ہے لیکن ہمیں خود بھی تو کچھ کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے یہ لوگ کچھ نہ کریں اور ہم اس انتظار میں رہ جائیں اور کام اٹک جائے۔''

''تو کیا کرنا پڑے گا؟'' جاوید نے پوچھا۔

''اس کی صورت یہ ہے کہ اب تو رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آج تو ممکن نہیں۔ کل شام میں ان دونوں پروفیسران کے گھر جائیں گے اور ڈبے کے ساتھ۔ آپ کل سات بجے شام میں ہمیں فون کیجیے۔ دونوں اسکوٹر تک پہنچ گئے۔ شارق نے اسکوٹر اسٹارٹ کی اور خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

جاوید نے گھر میں آکر کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر دراز ہوگیا۔ گھر کے لوگ سو چکے تھے بیوی نے نیند کے عالم میں ہی دروازہ کھولا تھا۔ اسے جاوید سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ فوراً سوگئی۔ جاوید اپنے بستر پر کل کیا ہوگا سوچتے سوچتے آنکھ بند کرلی۔

دنیا ویسی ہی نظر آرہی تھی جیسی کہ پروفیسر شپ میں سلیکشن کے پہلے تھی۔ لوگ پہلے کی طرح ادھر ادھر آ اور جا رہے تھے۔ گاڑیاں اسی طرح بھاگ رہی تھیں۔ بازار میں وہی گہما گہمی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن جاوید کے ذہن میں پہلے جیسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے ذہن کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ وہاں سب کچھ مسمار ہو چکا تھا۔ سب کچھ ڈھے چکا تھا۔ دور دور تک گرد و غبار کا سلسلہ تھا۔ کچھ بھی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ جو کچھ نظر آرہا تھا اس میں آٹھ انسانوں کے چہرے تھے۔ ایسے چہرے جن سے کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔ نہ ہی یقین نہ ہی شک۔ ان کی نیت ان کے ارادے ان کی منشا اور ان کے منصوبے کچھ کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ گرد و غبار نے ان کے چہروں کو مدھم اور مضمحل کر دیا تھا۔ جاوید ایک کو پکڑتا تھا تو دوسرا

نکل جاتا تھا اسی دوڑ بھاگ میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

روزانہ کی طرح پھر صبح ہوئی۔ دنیا حسب سابق حرکت، شور اور روشنی کے ساتھ زندہ اور متحرک تھی اور بے حس اور گونگی بہری شام کی طرف گامزن۔ کالج کا ایک اور بے کیف دن گذار کر جاوید گھر لوٹا۔ شام ہوتے ہی شارق کو فون لگایا۔ شارق نے جواب دیا آپ ڈبے کے ساتھ میرے فلیٹ پر آجائیے۔ یہیں سے ساتھ نکلیں گے۔ جاوید پہلے مٹھائی کی دوکان میں پہنچا۔ دو دو کیلو مٹھائی کے دو ڈبے پیک کرائے۔ اسکوٹر کی ڈکی میں رکھا۔ دس منٹ کے بعد وہ شارق کے کمرے میں تھا۔ وہ کپڑے بدل رہے تھے۔

''اچھا تو پہلے کہاں جائیں گے؟'' شارق نے پوچھا۔

''دو جگہ جانا ہے۔ پہلے پروفیسر وکیل کے یہاں چلئے۔ وہ دور رہتے ہیں۔ سرفراز قریب ہی رہتے ہیں۔ ان کے یہاں بعد میں چلیں گے۔''

دونوں پروفیسر کے دولت خانہ کی طرف اسکوٹر دوڑانے لگے۔ تیس چالیس منٹ بعد ایک کالونی کے پاس رکے۔ کسی سے پوچھا فلاں نام کی سوسائٹی یہی ہے۔ اس نے کہا نہیں آپ پندرہ منٹ اور ڈرائیو کیجئے پھر داہنی طرف اس سوسائٹی کی عمارتیں نظر آئیں گی وہاں پوچھ لیجئے گا۔ ہدایت کے مطابق اس جگہ پہنچے سکنڈ فلور پر ان کا فلیٹ تھا۔ سکنڈ فلور فرسٹ فلور پر کئی بار چڑھنا اترنا ہوا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سارے دروازے بند تھے۔ کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ ایک آدمی کوریڈور میں چالیس پچاس قدم پر جاتا نظر آیا۔ دوڑ کر اس کے پاس گئے۔ پوچھا اس نام کے پروفیسر کہاں رہتے ہیں۔ اس نے کہا آپ جہاں پر کھڑے تھے اس کے اوپر یعنی سکنڈ فلور پر۔ جاوید کے ذہن میں الجھن تھی۔ وہ کیسے اس پروفیسر سے بات کرے گا جو جونیر کالج میں اکنامکس پڑھاتا ہے۔ مضافات کے کسی کالج سے ایم اے ہے۔ اس سے کس طرح مخاطب ہونا پڑے گا۔ پہلے کچھ کہنا ہوگا یا ڈبہ دینا ہوگا۔ اس طرح کہ یہ لیجئے تھوڑی سی شیرنی ہے بچوں کے لئے ہے۔ پتہ نہیں یہ سن کر وہ کیا کہے۔ کہیں برا تو نہیں مان جائے گا۔ ہوگا کیا جیسے جلیل صاحب کو کہا تھا ان سے بھی

ویسے ہی مخاطب ہو نگے۔ کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس شخص کے گھر پر جا کر دریوزہ گری کرنی پڑے گی۔ نالائقوں سے ملنے لیاقت میری گئی۔ لیکن مجبوری میں تو آدمی کو کیا کیا کرنے پڑتے ہیں۔ کالج سے ایک بار آزاد ہو گئے پھر ان مفت خوروں کی صورت کون دیکھتا ہے۔ لیکن نجات اتنا آسان کہاں ہے۔ خدا معلوم ابھی اور کیا کیا کرنا پڑے گا۔ شارق نے کہا یہی فلیٹ ہے لیکن دروازہ بند تھا۔ دروازے میں ایک چور کھڑکی تھی۔ چور کھڑکی کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ بیل بجائی تو پہلے اندر کا دروازہ کسی نے کھولا۔ اس کے بعد چور کھڑکی کے بازو میں کھڑے ہو کر کسی نے پوچھا آپ کون ہیں؟

''ہم پروفیسر شارق ہیں ہمارے ساتھ پروفیسر جاوید ہیں۔ ہم لوگ بحرالاسلام کالج سے آئے ہیں سر ہیں کیا؟'' ایک خاتون کی آواز آئی۔ ''نہیں سر نہیں ہیں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''کہیں گئے ہیں۔ کچھ بتا کر نہیں گئے۔''

''کب آئیں گے؟''

''یہ نہیں بتایا تھا۔''

اب کیا کریں۔ جاوید نے کہا۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آدھ ایک گھنٹہ میں واپس آجائیں گے تو ہم لوگ بلڈنگ کے باہر ان کا انتظار کر لیتے۔ محترمہ سے پوچھ کر دیکھئے۔ محترمہ بولیں۔ نہیں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔

وہ جو بات کرتی تھیں اس میں چند لمحوں کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پاس میں کھڑے یا بیٹھے کسی شخص سے اشارے لے کر بتا رہی ہوں۔ چور کھڑکی سے جاوید نے دیکھا کہ اندر ایک متوسط لمبائی کا ہال ہے۔ فرش پر کھانا لگا ہے۔ ایک دو بچے کھانے کے پاس بیٹھے ہیں لیکن کوئی مرد نظر نہیں آرہا ہے۔ ہم لوگوں کا نام سن کر وہ کھانے سے ہٹ گئے یا تھے ہی نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن جاوید کو یہی محسوس ہوا کہ پروفیسر صاحب ہیں اندر ہی۔ کھانا کھا رہے تھے۔ ملاقاتی کا نام سن کر کنارے ہو گئے اور محترمہ ان کے اشارے پر

جواب دیتی رہیں۔

جاوید نے کہا۔ ''کل صبح آنا پڑے گا۔''

''کل صبح کیسے ممکن ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ جگہ ہم لوگوں کے علاقے سے کتنی دوری پر ہے۔ اور صبح سات بجے سے کالج ہے۔ کالج جائیں گے یا یہاں آئیں گے۔ اور کل ہی وہ تاریخی میٹنگ ہے ہائی پاور ایکشن کمیٹی میٹنگ۔ مٹھائی محترمہ کو دے دیجئے۔ نام تو پہلے بتا دیا ہے۔'' شارق نے کہا۔

''میڈم پروفیسر جاوید صاحب سر کے لئے ایک سامان لائے ہیں۔ آپ لے لیجئے۔ دراصل ہم لوگ اس میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہیں جو کل کالج میں ہونے والی ہے۔ سر اس میٹنگ میں بیٹھیں گے۔ اس میٹنگ میں یہ پروفیسر جاوید صاحب کا ایک کام ہے۔ اس کے متعلق سر سے بات کرنی تھی۔ آپ ان سے بتا دیجئے گا۔ یہ میٹھا ہے رکھ لیجئے۔''

ایسا لگا کہ محترمہ نے کسی سے کچھ پوچھا۔ پھر تھوڑا سا دروازہ ہٹایا جس میں مشکل سے مٹھائی کا ڈبہ اندر جا سکتا تھا۔ انھوں نے پیکٹ کو لیا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ دونوں خدا حافظ کہہ کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔

''چلئے جاوید صاحب ان کو ڈبہ تو دے دیا اب سرفراز کے یہاں چلتے ہیں۔''

''ارے ان سے تو ملاقات ہوئی ہی نہیں۔ کیا معلوم کل میٹنگ میں کیا بولیں گے؟''

''ارے آپ فکر نہ کریں۔ ڈبہ مل گیا نا اب وہ آپ کی بولیں گے۔''

''یہ کیسے؟

''آپ نہیں جانتے ڈبے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ دیکھا نہیں سب لوگ فرش پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہم لوگوں کے آنے کے بعد ڈبہ کھولا ہوگا۔ منہ میٹھا کیا ہوگا۔ کل تک اس کا اثر رہے گا۔''

''لیکن اگر وہ تھے تو دروازہ کیوں نہیں کھولا ہم لوگوں کو بٹھایا کیوں نہیں؟''

''ارے یہ سارے افراد خاندان ایک ساتھ فرش پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ کھانے

کے درمیان میں ہم لوگ پہنچ گئے اب ایسی حالت میں نئے آدمی کو خواتین کے درمیان کیسے بلاتے اس لئے انھوں نے بہانا کر دیا۔"

"کمال ہے ڈبہ لے لیا اور بہانہ کر دیا۔"

جاوید صاحب ایک جگہ مل کر کام کرنا الگ بات ہے اور گھر میں ایک ساتھ کھانا کھانا دوسری بات ہے۔ الگ ماحول الگ کلچر الگ اسٹیٹ اور ذہنی افتراق۔

"پھر وہ ہمارا کام کیسے کریں گے؟"

"ارے وہ کام کہاں ہے اسے تو جان بوجھ کر ایک کام بنایا گیا ہے۔ کام کا نام دیا گیا ہے۔ تا کہ آپ کو پریشان کیا جا سکے۔ ذاتی بغض وحسد کی بھڑاس نکالی جا سکے۔ کسی کو منت وخوشامد کرتا ہوا دیکھ سکیں۔ ورنہ یہ تو حکومت کے ضابطے میں ہے کہ کوئی اپنی مرضی سے کہیں بھی جوائن کر سکتا ہے اور اپنی پسند سے ایک ملازمت چھوڑ کر دوسری نوکری کر سکتا ہے۔ یہ ہر شہری کا حق ہے۔ لیکن آپ کی پسند کو کسی کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف کر دیا گیا۔ چلئے یہ سب تو آپ بھی جانتے ہیں۔ بہر حال مٹھائی کھانے کے بعد وہ میٹنگ میں آپ کے روکنے کی بات نہیں کریں گے ہاں شاید لین دین کی بحث ضرور ہوگی۔ مٹھائی میں طاقت ہوتی ہے میں نے کہانا۔ خیر چلئے سرفراز کے یہاں۔"

ایک گھنٹے بعد سرفراز کے مکان کے دروازے پر دونوں کھڑے تھے۔ بیل بجائی۔ سرفراز نے دروازہ کھولا۔ سلام کلام ہوا۔ مسکرائے۔ کہا اچھا آپ لوگ ہیں۔ اندر آیئے۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر سب لوگ بیٹھ گئے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ آپ کو اتنی رات گئے ہم لوگوں نے تکلیف دی۔ معافی چاہتے ہیں۔ جاوید نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے ڈبہ ان کی طرف پیش کر دیا۔

"ارے یہ کیا ہے۔ کس لیے؟"

"یہ تھوڑا میٹھا ہے۔ بچوں کے لیے۔ دراصل کل کی میٹنگ میں آپ بھی شریک ہونگے۔ جاوید صاحب کا مسئلہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آپ کے بغیر کیسے ہو پائے گا۔ یہ

بہت پریشان ہیں۔ جوائننگ کی تاریخ نکلی جارہی ہے۔ دو دن بچ گئے ہیں۔'' شارق نے وضاحت کی۔

''لیکن اس کا فیصلہ تو میٹنگ میں ہی ہوگا۔ ابھی کیا کہا جاسکتا ہے۔'' سرفراز نے کہا۔

جاوید یہ سن کر ڈر گیا۔ ارے یار یہ تو بالکل مخالف لگتا ہے۔ اس کی باتوں سے ابھی پتہ چل گیا۔

''لیکن کوشش کرنے سے سنگین مسئلے کا حل بھی نکل آتا ہے۔ یہ تو محض ریلیونگ کی بات ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ریلیونگ کیلئے جیسا سب کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ وہی میرے لیے بھی ہو۔'' جاوید نے کہا۔

''ہاں یہ تو سہی ہے لیکن حالات کے مدنظر تھوڑی تبدیلی تو ہوتی ہے۔ سرفراز نے بتایا۔

جاوید پھر کھٹکا۔ یار یہ تو تہیہ کیے بیٹھا ہے کہ اپنی ہی کریں گے۔ لگتا ہے اس پر مٹھائی کا کچھ اثر نہیں ہونے والا ہے۔ مٹھائی رائگاں گئی۔

شارق نے کہا۔'' دیکھئے پروفیسر صاحب کالج میں ہر پروفیسر انتظامیہ کی نگاہ میں یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے انتظامیہ کا بھی فرض ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ جاوید صاحب نے سترہ سال کی زندگی میں تدریس کے علاوہ کالج کے دوسرے امور میں بھی ہمیشہ دلچسپی لی ہے۔ ریسرچ میں ان کا اچھا خاصا کام ہے۔ اور آج یہ یونیورسٹی میں جانا چاہتے ہیں۔ اس میں بھی کالج کی عزت افزائی ہے۔ انھوں نے کالج کا مان بڑھایا ہے۔ اس کی شان میں چار چاند لگائے ہیں۔ پھر ان کی ریلیونگ میں اتنی تاخیر کیوں ہورہی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ پروفیسر شپ بڑی بات ہے لیکن جو کام ہوگا ضابطے کے ساتھ۔'' سرفراز نے کہا۔

''ہاں بالکل ضابطے میں ہونا چاہئے۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ ہم لوگ اس لیے آپ کے پاس آئے کہ آپ تو ماشاءاللہ ایک اہم مذہبی تنظیم کے پرانے کارکن بھی ہیں۔

حق وانصاف کی آپ تبلیغ بھی کرتے ہیں۔آپ کے رہتے ہوئے میٹنگ میں بھی یہی ہونا چاہیے۔'' شارق نے کہا۔

''ہاں ہم یہی کوشش کریں گے۔آپ لوگ چائے لیں گے؟'' سرفراز نے پوچھا۔

''نہیں رہنے دیجئے۔رات زیادہ ہوگئی ہے۔ہم لوگ چائے لے کر آئے تھے۔ آپ کو ہماری وجہ سے زحمت ہوئی۔معافی چاہتے ہیں۔کل دو بجے میں میٹنگ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جاوید صوفے سے اٹھ گیا اور دروازے کی طرف چلنے لگا۔

سرفراز نے کہا''ہاں دو بجے ہے۔ٹھیک ہے۔''

شارق نے کہا۔''اچھا ڈاکٹر صاحب اجازت خدا حافظ، خدا حافظ۔''

دونوں مکان سے باہر آ گئے اسکوٹر کے پاس پہنچے۔جاوید نے شارق سے کہا۔ شارق صاحب یہ آدمی تو پرنسپل کی زبان میں بات کر رہا تھا۔

''ہاں سب کے سب ہمارے ساتھ تو نہیں ہو سکتے ایک دو تو مخالف میں رہیں گے ہی۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ہو سکتا ہے اگر ہماری اکثریت ہوئی تو یہ اپنے آپ اکثریت سے مل جائیں گے یا خاموش ہو جائیں گے۔بہر حال آئے تو ان کے دروازے پر بھی۔اگر ذرا سا بھی انسانیت اور عدل وانصاف کا خیال ہوگا تو حق کہیں گے ورنہ چڑھتے سورج کی پوجا۔خیر تمام ممبران سے کسی نہ کسی صورت میں ملاقات تو ہوگئی۔اب آپ اطمینان سے گھر جا کر سو جایئے۔کل انشاءاللہ معاملے کا حل نکل آئے گا۔''

اسکوٹر پر ملتان کے ساتھ پروفیسر جلیل کے فلیٹ جاتے ہوئے جاوید نے یہ کہا تھا کہ پچیس ہزار لے لیجئے لاکھ دو لاکھ کیوں مانگ رہے ہیں۔) جاوید کو آگے چل کر یہ احساس ہوا کہ شاید ایسا کہنا ملتان کے لیے ایک اشاریہ ثابت ہوا کہ یہ بندہ پچیس تو دے گا ہی تو میٹنگ میں پچیس پر ہی طے کر دیا جائے۔ہو سکتا ہے جاوید کا یہ خیال غلط ہو سچ ہو لیکن جاوید کو کبھی کبھی ایسا لگتا کہ جلیل، ملتان، شارق اور مولانا سب آپس میں ملے ہوئے ہیں اور ڈرامہ کرتے ہوئے جاوید سے کھانا اور نقد دونوں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔خدا معلوم کیا حقیقت

ہے اور کیا جھوٹ۔

وہ رات بڑے کرب میں گزری۔ صبح ساڑھے سات سے دن کے دو بجے تک جاوید اس طرح بے چین تھا جیسے عدالت کا فیصلہ دو بجے ہونے والا ہے اور اس میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے ہی دو بجا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یہ قافلہ پروفیسر عبدالقوی کے کمرے سے چلا۔ اس کے ساتھ پروفیسر جلیل پروفیسر ملتان اور پروفیسر سرفراز تھے۔ وہ لوگ کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آگئے تھے۔ کوریڈور میں ہی تیس قدم پر جاوید کھڑا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر قافلے پر (ہائی پاور ایکشن کمیٹی پر) پڑی وہ فوراً کوریڈور سے ملحق کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں دبگ گیا کہ کہیں عبدالقوی کی نظر نہ اس پر پڑجائے۔ قومی اپنی شیروانی کی دونوں جیب میں ہاتھ ڈالے ایسے چل رہے تھے جیسے منتریوں کا قافلہ پارلیمنٹ میں جارہا ہے اور وہاں انھیں کی اکثریت ہے اور وہاں وہی ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ قافلہ کوریڈور سے ہوتا ہوا پرنسپل چیمبر میں چلا گیا۔ بقیہ ممبران وہاں پہلے سے موجود تھے۔ میٹنگ شروع ہوئی۔ جاوید منٹ گھنٹہ کا شمار کرنے لگا۔ وہ کبھی اسٹاف روم میں تھوڑی دیر بیٹھتا، کبھی کالج کے کیمپس میں کبھی کینٹین میں کبھی اسٹیٹ آفیسر کے چیمبر میں۔ گویا اسے چین نہیں تھا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔

پانچ بجے میٹنگ ختم ہوئی۔ دو کے بجائے تین بجے شروع ہوئی۔ جاوید اسٹیٹ آفیسر کے چیمبر میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا۔ تمام ممبروں میں اسے ملتان پر ہی اعتبار تھا کیونکہ مقامی پیمانے پر اس کا سیاست میں بھی دخل تھا اور کالج کے کئی فتنوں کو ابھرنے سے پہلے اپنی سیاسی جان پہچان کے بل بوتے پر نیتا اور منتری کے ذریعے دبا دیا تھا۔ لیکن چھ بجے تک ملتان اپنے چیمبر میں نہیں آئے کہاں گئے۔ کہاں گئے کسی کو پتہ نہیں۔ جاوید صرف ملتان کا انتظار ان کے چیمبر میں کرتا رہا۔ اور دوسری طرف بقیہ ممبران اپنے اپنے گھروں کو نکل گئے۔ اور ملتان کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ ملتان خان کے چیمبر کے پاس کھڑا تھا کہ اچانک اس کی نظر پروفیسر وکیل پر پڑی جن کے گھر گذشتہ رات گیا تھا۔

''سلام علیکم۔''

''وعلیکم اسلام!''

''میٹنگ ہوگئی کیا؟''

''ہاں ہوگئی۔''

''کل ہم لوگ آپ کے گھر پر گئے تھے۔''

''ہاں ہاں...... ہاں''

اس آدمی نے یہ تک نہیں کہا کہ ہاں مجھے گھر والوں نے بتایا۔ یا مجھے افسوس ہے آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہوسکی۔ کچھ بھی نہیں۔ بس ہاں ہاں ایسے کرتا رہا جیسے زبردستی بول رہا ہو۔ جاوید کو تو اس وقت بھی یہی لگا کہ یہ آدمی کل رات اپنے گھر میں ہی تھا۔ خیر۔ جاوید نے ڈرتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔ تو سر میٹنگ میں میرا کیا ہوا؟

اس نے کہا۔ ''وہی ریلیو کیا جائے گا۔''

''اور کچھ۔''

''ہاں پچیس پر...... پچیس ہزار۔''

''لیکن دوسرے پروفیسر جو گئے ہیں ان سے کچھ نہیں لیا گیا۔''

''اب سب سے لیا جائے گا۔''

''یعنی نیا قانون مجھ سے۔''

''ہاں آپ سے ہی۔ اور آپ کے بعد کوئی بھی پروفیسر کالج کو کچھ دیے بغیر نہیں جائے گا۔''

''اچھا سر آپ کا بہت بہت شکریہ یہ جاوید نے کہا۔

''ہاں ہاں ہا......'' انھوں نے کہا اور کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس کے علاوہ ایک لفظ بھی نہیں کہ آپ کہاں جارہے ہیں۔ کس عہدے پر جارہے ہیں یا مبارک باد وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ وہ ایسے چلے گئے جیسے یہ ایک نہایت ہی غیر ضروری بات تھی۔ یہ وہی پروفیسر

صاحب تھے جو مومن پورہ میں اپنے شاگرد کی ہوزیئری کی دکان میں سارے زیر جامے فری میں خریدتے تھے۔ جاوید کو میٹنگ کی تفصیل چاہئے تھی۔ کون بتائے گا۔ ملتان کہاں گئے۔ کوئی نہیں جانتا۔ ان کا فون خاموش ہے۔ چلو سرفراز سے پوچھتے ہیں۔ ابھی وہ ڈپارٹمنٹ میں ہونگے۔ وہاں پہنچا۔ ڈپارٹمنٹ کے اسٹاف روم میں ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ سلام کیا۔ انھوں نے جواب دے کر کہا بیٹھئے۔

''کیا ہوا سر؟''

''ہاں ریلیو کریں گے لیکن پچیس ہزار دینے پڑیں گے۔''

''لیکن مجھ سے پہلے کسی نے بھی ایک پیسہ نہیں دیا۔ مجھ سے کیوں؟''

''میٹنگ میں سبھوں نے طے کیا ہے۔''

''مجھ سے ہی کیوں؟''

''اب آئندہ سب کو دینا پڑے گا پچیس میں کوئی تخفیف نہیں۔''

''نہیں۔''

نہ مبارک باد نہ کچھ پوچھنا کسی اور سے بات کرنے لگے۔

''اچھا ٹھیک ہے آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

جاوید نے دل میں کہا اب کس بات کا شکریہ۔ کمینے تمہارے گھر اس لیے گیا تھا۔ معلوم ہوتا تو جاتا ہی نہیں۔ پرنسپل کا چمچہ اور انصاف کا لٹیرا۔ خدا نے چاہا تو تمہارے پچاس جائیں گے۔ کالج میں اور کوئی نہ تھا جس سے ملاقات کی جائے۔ سب تو دو بجے ہی جا چکے تھے۔ میٹنگ کے ممبران کو تو رہنا تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ جاوید بھاری قدموں سے اپنے فلیٹ کو روانہ ہو گیا۔ بیوی سے اب تک کی ساری روداد سنادی۔ کہا مفصل جانکاری باقی ہے۔ پھر کہیں ریسٹورنٹ میں یہ لوگ بیٹھیں گے۔ تب سنائیں گے۔ سات بجے شام میں شارق کو فون لگایا۔ انھوں نے کہا آپ نو بجے رات میں جلیل صاحب کی بلڈنگ کے نیچے پہنچ جائیں۔ بقیہ حضرات بھی وہیں آجائیں گے۔ کہیں چل کر میٹنگ کی باتیں ہونگی۔

نو بجے رات میں جاوید بلڈنگ نمبر ۳۷ کے نیچے کھڑا تھا۔ جس کے ایک فلیٹ میں پروفیسر جلیل رہتے تھے۔ ایک ایک کر کے سب آ گئے۔ پروفیسر جلیل کار کو پارکنگ سے روڈ پر لائے سبھی حضرات اندر بیٹھ گئے۔ کار روڈ پر بھاگنے لگی۔ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔ پارک کرنے کے بعد پروفیسر اور کلرک کار سے باہر نکلے اور ریسٹورنٹ میں ایک جگہ سب اپنی اپنی کرسیوں پر کرسی نشین ہو گئے۔

شارق نے کہا۔ ''ہاں جلیل بھائی سنایئے کیا ہوا؟''

''ملتان صاحب بتائیں گے۔'' پروفیسر جلیل نے کہا۔

''کہیئے ملتان صاحب۔'' جاوید نے کہا۔

''آپ کالج سے غائب ہو گئے۔ فون بند کر دیا۔ کہاں چلے گئے؟'' جاوید نے پوچھا۔

''ارے یار اچانک موت کی خبر آ گئی۔ میں بھاگا بھاگا وہاں چلا گیا۔ تجہیز و تکفین میں فون بند کر دیا تھا۔''

''تو سنایئے کیا رہا میٹنگ میں؟'' شارق نے پوچھا۔

''ارے پہلے کچھ ٹھنڈا جوس تو آنے دو۔''

جوس حاضر کر دیا گیا۔ سب پینے لگے۔

''ارے آپ لوگ تو اس طرح چپ ہیں جیسے میٹنگ میں شکست کھا کر آئے ہوں کچھ کہیئے تو۔'' مولانا نے کہا۔

جلیل نے ملتان کی طرف اور ملتان نے جلیل کو دیکھا۔ جلیل نے ملتان سے کہا تم بتاؤ۔ ملتان نے جلیل سے کہا تم ہی کہہ دو۔ جلیل نے بتایا کہ ریلیونگ کی شرط پچیس ہزار ٹھہری۔ پہلے پیسہ پھر ریلیونگ۔

''آپ لوگوں نے جو جرمانہ سنایا گیا مان لیا۔ اس پر جرح تک نہیں کی۔ اور یہ جرمانہ صرف جاوید صاحب پر ہی کیوں۔ کچھ تو آپ حضرات کو کہنا چاہیئے۔'' شارق نے جوش میں کہا۔

''پچیس کی کہہ رہے ہو وہاں لاکھوں کی مانگ ہو رہی تھی۔''جلیل صاحب بولے۔

''لاکھوں کی مانگ ہو رہی تھی اس لیے آپ نے بڑے اطمینان سے پچیس کو قبول کرلیا۔''شارق نے کہا۔

''اس سے کم پر وہ تیار نہیں تھے۔''

''کون تیار نہیں تھے؟''

''پرنسپل۔''

''لیکن آپ ممبران نے اختلاف کیوں نہیں کیا؟''

''یار کوئی کرتا تو میں بھی کرتا۔''

''اچھا سب ایک دوسرے کے انتظار میں رہ گئے۔''شارق نے کہا۔

ملتان سر جھکائے خاموشی سے بحث سن رہے تھے۔انھوں نے میٹنگ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔گویا جلیل صاحب نے جو بتایا اتنا ہی میٹنگ میں پیش آیا۔

''تو کل جاوید صاحب کو کیا کرنا پڑے گا۔''شارق نے پوچھا۔

''کل وہ پرنسپل صاحب سے مل لیں کیا اور کیسے کرنا ہے وہ انھیں بتا دیں گے۔'' جلیل صاحب بولے۔

''آپ کچھ فرمائیں گے اسٹیٹ آفیسر صاحب؟''شارق نے پوچھا۔

''نہیں نہیں۔اتنی ہی بات تھی۔جلیل نے سب کچھ سہی بتایا ہے۔''

''تو مجلس برخاست کی جائے۔''

''ہاں......''

''چلئے جاوید صاحب چلا جائے۔''

جاوید نے جوس کا بل ادا کیا۔سب لوگ کار میں بیٹھے۔جلیل صاحب کی بلڈنگ تک پہنچے۔وہاں سے فرداً فرداً اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔جاوید اپنے فلیٹ جاتے ہوئے سوچتا رہا۔یہ جوس کی محفل تو پھیکی اور مردہ سی لگی۔کہاں میں سوچ رہا تھا کہ یہ

لوگ جم کر میٹنگ کی روداد سنائیں گے کہ اس نے یہ کہا تو میں نے یہ جواب دیا اس نے یہ سوال کیا تو میں نے منہ توڑ جواب دیا اور کہاں قبرستان جیسی خاموشی۔ جیسے ذکر و بحث کے لیے نہ بیٹھے ہوں بلکہ خاموش ماتم سرائی کے لیے جمع ہوئے ہوں۔ جب ان دونوں کی خاموشی ایسی ہے تو بقیہ ممبران نے کیا کیا ہوگا سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جلیل صاحب زبردستی حلق سے جملے نکال رہے ہوں۔ کیا خاک بحث ہوئی ہوگی۔ پرنسپل نے کہا ہوگا سارے ایجنڈا پر گفتگو ہوگئی۔ آخری ایجنڈا جاوید کا ہے۔ اس کا یہ ہے کہ پچیس دینا پڑے گا ریلیونگ کے لئے۔ چلئے میٹنگ ختم۔ شکریہ۔ ان دونوں جلیل اور ملتان کے چہروں سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ ملتان کوئی بات چھپا رہے تھے۔ شاید اس محفل میں کہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان سے کل کالج میں اکیلے پوچھونگا۔ آخر انھوں نے کیا چھپا رکھا ہے۔

"یہ آپ کی پچھلے کئی دنوں سے اوپن ائیر پارلیامنٹ ہو رہی ہے۔ کچھ نتیجہ نکلا کہ نہیں۔ مجھے بتائیے تو سہی۔ اگر پرنسپل اپنی ضد پر ہے تو میں اپنے دوستوں سے کہونگی۔ اچانک لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے۔ انھیں پہلے سے کہہ کر رکھنا پڑے گا۔ مجھے اندازہ ہے یہ کمیٹی اور ممبران سب ڈھکوسلہ ہے۔ پیسہ کھانے کا ذریعہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ لوگ آپ سے پیسے بھی لیں گے اور آپ پر احسان بھی دکھائیں گے اور آپ کی انا کو ٹھیس پہنچا کر آپس میں خوشیاں منائیں گے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب دکھاوا ہے۔ بلکہ یہ سب مل کر آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ جو دروازے دروازے بھٹک رہے ہیں اس سے انھیں لاکھوں کی خوشی مل رہی ہے۔ آپ کی ذلت و رسوائی یہی ان کا منشا ہے۔ آپ ہیں کس خواب وخیال میں۔ ارے انھیں پیسے دیجئے یہ آپ کو لیڑ دیں گے۔ خواہ مخواہ اس سے اس سے التماس کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ یہ ایم اے درجے کے لوگ ایک پی ایچ ڈی کو بندر کی طرح نچا رہے ہیں۔ لعنت ہے ان مداریوں پر لعنت ہے ایسے پروفیسروں پر۔" بیوی نے غصے اور بیزاری کے لہجے میں کہا۔

"بھئی پیسہ لے جا کر سیدھے ان کی میز پر رکھ دینے سے تو کام نہیں ہوگا۔ اسے

دینے کا جو طریقہ ہوتا ہے ویسے ہی دیا جائے گا نا۔''

''چاقو خربوزے پر یا خربوزہ چاقو پر انجام تو کٹنا ہی ہے۔ تو پیسہ تو دینا ہی ہے۔ میز پر دیجئے یا ہاتھ میں رسید کیجئے دینا تو ہے نا۔ تو کل پیسہ ساتھ میں لیتے جایئے اور پوچھئے بڑے میاں اور چھوٹے میاں سے کہ حضور عالی مزاج سبحانی یہ رقم بے حساب کس مد میں کہاں اور کس کے حوالے کی جائے۔ وہ فوراً آپ کو بتائیں گے کس خزانچی کو سونپنا ہے۔ اچھا یہ تو بتایئے کتنے پیسے مانگے ہیں۔''

''پچیس ہزار۔''

''اور یہ جو آپ گھر گھر مٹھائی کے ڈبے پہنچاتے رہے ان حلال خوروں نے میٹنگ میں کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ پچیس ہزار آپ سے ہی کیوں۔ آپ سے پہلے کتنے گئے اور ان سے کتنے لئے گئے۔ کسی نے کچھ نہیں بولا؟''

''ممبران سب خاموش رہے پرنسپل نے اتنے پر فیصلہ کر دیا۔''

''ہاں انھیں ممبران میں سے کسی حلال خور نے لاکھ دو لاکھ کا ڈرامہ کیا ہوگا۔ اور پھر کسی ممبر نے پچیس کی رٹ لگائی ہوگی۔ پھر پرنسپل نے کہا ہوگا اتنا تو دینا ہی پڑے گا۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اس ڈرامہ کی ریہرسل پہلے ہو چکی ہوگی۔ چلئے آپ یہ سمجھ لیجے کہ اپنی پروفیسر شپ کی مٹھائی ان کم بختوں کو آپ نے ان کے گھر جا کر کھلا دی۔ جاتے جاتے بھی منہ میٹھا کر گئے۔ خدا نے چاہا تو ہمارے پچیس کے پچاس آجائیں گے انشاءاللہ اور ان مفاد پرستوں کا دیکھنا پچیس کے پچاس جائیں گے بلکہ اس سے زیادہ جائیں گے۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ دیکھنا ان پر نہیں تو ان کی اولاد پر پڑے گا۔ یہ خود بیمار پڑیں گے یا ان کے بچے کو علاج کی ضرورت پڑے گی۔ خدا غارت کرے ایسے قوم کے ہمدردوں کو اور قوم کے ایسے پروفیسروں کو۔'' بیوی نے غصے کا اظہار کیا۔

''بس بس رہنے دو۔ کیوں کوستی ہو انھیں۔ جو خدا کو کرنا ہوگا وہ کرلے گا تم اپنی زبان کیوں خراب کرتی ہو۔''

''ارے کئی ہفتوں سے یہ ایک باضابطہ پروفیسر کو جانور کیطرح دھتکار رہے ہیں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر۔ کیا ہے یہ؟ یہی علم ہے، تعلیم ہے، فکر و دانش ہے۔ استاد کا کردار ہے۔ یہ تو بنیا گری ہے۔ پروفیسر کی سوداگری۔ بے شرم کہیں کے بے غیرت کہیں کے۔''

''رہنے بھی دو صرف ایک دن جوائنگ کی آخری تاریخ کو رہ گئے ہیں۔ اتنے روپے ہو جائیں گے؟''

''ہاں میں دوستوں سے ایک مہینہ کے وعدے پر لائی ہوں۔ پانچ تو اپنے پاس تھے۔ کل پیسے دے کر ریلیونگ لے ہی لیجے اور کل ہی شام ہم سب لوگ جوائنگ کے لیے بس سے روانہ ہو جائیں گے۔''

صبح ہوئی۔ ریلیونگ کی صبح۔ کلاسیں ہوتی رہیں۔ دس بج گئے۔ جاوید پرنسپل کے چیمبر میں داخل ہوا۔ ان کا سر اپنی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ میز کے سامنے کرسیاں لگی تھیں۔ ایک کرسی کے پاس وہ کھڑا ہو گیا۔

''سلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔

جاوید نے کہا سر میٹنگ میں پچیس ہزار طے ہوا ہے۔

''ہاں۔''

''سر مجھ سے پہلے جو لوگ گئے ان سے کچھ نہیں لیا گیا۔''

''تو کیا آپ سے بھی کچھ نہیں لیا جائے۔ میں ہر کام آپ کے بعد شروع کروں؟''

''نہیں سر میں نے ایسا کب کہا۔''

''نہیں کہا تو ٹھیک ہے۔ پیسے دیجئے اور ریلیونگ لیٹر لیجئے۔ اور پیسے نہیں ہیں تو مت جائیے۔ آپ کو کون کہہ رہا ہے یہاں سے جانے کو۔ آپ کو یہاں کون سی کمی ہے۔''

''نہیں سر کمی کی بات نہیں ہے۔ عہدے اور مرتبے کے لئے لوگ تو جاتے ہی ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے آپ بھی جائیے پیسہ بھر دیجئے لیٹر مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے سر پیسہ کس کو دوں آپ لیں گے یا''۔

''نہیں آفس میں دے دیجئے۔ ملتان صاحب سے پوچھ لیجئے۔''

''اچھا سر خدا حافظ۔''

جواب میں انھوں نے سر کو ہلکا سا ہلایا اور فائل کو دیکھتے رہے۔ دوران ملاقات زیادہ تر وہ فائل کو ہی دیکھتے رہے۔ ایک دو بار چند لمحوں کے لئے جاوید کی طرف دیکھا تھا پھر فائل پر متفاعل۔ جاوید چیمبر سے باہر نکلا۔ دفتر میں گیا۔ کیش کلرک کے پاس پہنچا۔ اس سے کہا ابھی پرنسپل صاحب کے پاس میں گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ پچیس ہزار روپے جمع کر دیجئے اس کے بعد ریلیونگ لیٹر ملے گا۔

کلرک نے ایک رسید بک نکالی۔ اس نے کہا ''دیکھئے یہ اس رسید میں پیسے جمع کرانے سے آپ کو ٹیکس میں فائدہ ہوگا۔''

''مجھے تو یہ سب نہیں معلوم کہ کون رسید کس قسم کی ہے اور کس سے کیا فائدہ ملے گا۔'' جاوید نے کہا۔

عین اسی وقت ملتان صاحب بھی آفس میں آ گئے۔ جاوید نے ان کو بتایا کہ پرنسپل صاحب نے پیسے بھرنے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن کون والی رسید میں پیسے جمع کرنے ہیں۔

کلرک نے کہا۔ ''میں ان کو بتا رہوں کہ جس میں ٹیکس کے فائدے کا قانون لگا ہوا ہے اس میں بھر دیں۔

ملتان نے کہا۔ ''نہیں دوسری رسید جس میں کچھ نہیں لکھا ہے اس پر ان کے پیسے لو۔''

''کیوں جو بھی کالج کو اس طرح کی مدد کرتا ہے اسے تو ٹیکس والی رسید دیتے ہیں۔'' کلرک نے کہا۔

''تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔ سادہ رسید میں ان کے پیسے بھرو۔ تم کو بحث کی کیا ضرورت ہے۔'' ملتان نے حکم دیا۔

جاوید نے سادہ رسید میں پیسے بھر دیے۔ گذشتہ شام کی محفل میں ملتان خاں بالکل

خاموش تھے۔ آج ان سے پوچھتے ہیں وہ کیوں چپ تھے اور ان کے پاس کیا راز ہے۔ جاویدان کے ساتھ ان کے چیمبر میں گیا۔ کرسی پر بیٹھ گیا اور یوں مخاطب ہوا۔ کہئے کیسے ہیں آپ، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میٹنگ میں میرے مسئلے کا حل نکالا ورنہ خدا معلوم کیا ہونے والا تھا۔ میں تو شاید جوائن بھی نہیں کر پاتا۔ میری وجہ سے آپ کو اور دوسرے ممبران کو بڑی زحمت اٹھانا پڑی۔

ملتان صاحب گویا ہوئے۔ ''ارے ایسا نہیں ہے جاوید صاحب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے ہر ممبر سے ملاقات کی ان کے گھر گئے تحفے دئے۔ اپنی ذات بھر آپ نے ان کی پوری خدمت کی اور ان سے گذارش کی کہ آپ کے حق میں میٹنگ میں بات کریں لیکن آپ کو معلوم ہے ان میں سے کس نے کیا کیا کہا؟''

''اب کس نے کیا کہا یہ تو آپ جانتے ہیں آپ بتائیں گے۔ میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟''

''یہی تو میں بتانا چاہتا ہوں۔ اتنا کہتے ہوئے انھیں غصہ آ گیا چہرہ تن گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ جناب کسی بھی شخص نے ایک لفظ بھی آپ کے لئے میٹنگ میں نہیں کہا۔''

''کسی نے تو کچھ کہا ہوگا؟''

''میں نے کہا نا کسی نے کچھ نہیں کہا۔ حتیٰ کہ آپ کے جلیل صاحب بھی بالکل خاموش تھے۔''

''خاموش!''

''جی جناب بالکل خاموش!''

''تو ہوا کیا؟''

ہوا یہ کہ تین گھنٹے کی میٹنگ میں پونے تین گھنٹے تک مختلف مسائل ایجنڈوں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ جب ساری باتیں ہو گئیں تو پرنسپل نے کہا چلئے میٹنگ ختم۔ شکریہ۔ سب اٹھنے لگے۔ تو میں نے کہا آپ لوگ ایسے کیسے اٹھ رہے ہیں؟''

پرنسپل نے کہا۔ ''ساری باتیں تو ہو گئیں۔''

''ساری باتیں نہیں ہوئیں ایک ایجنڈا باقی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''جاوید صاحب کا کیا ہوگا؟ اس کے ریلیونگ کا کیا ہوگا۔ اس کی جوائننگ کو ایک دن رہ گیا ہے۔''

''وہ کسی اور میٹنگ میں غور کر لیں گے۔'' پرنسپل نے کہا۔

''اور کس میٹنگ میں۔ ایک دن بچا ہے۔۔ کب اس کو ریلیونگ ملے گی اور وہ کب جائے گا۔ اور اگر اس کو ریلیو نہیں کرنا ہے تو بھی آج کے ایجنڈا میں نوٹ کیجئے۔ کیا وہ اس کالج کا اسٹاف نہیں؟''

''وہ بالکل فری میں جانا چاہتے ہیں۔'' سرفراز نے کہا۔

''تو کیا لاکھ روپیہ دے۔''

''ہاں ترقی ہے۔ دینا تو چاہئے۔'' عبدالقوی نے کہا۔

''کیوں اسے دینا چاہئے اور دوسرے جو گئے ان سے آپ نے کیوں نہیں لیا۔ ان کی بھی تو ترقی تھی؟'' ''وہ چلے گئے۔ اب یہ نیا واقعہ ہے۔'' قوی نے کہا۔

''تو اس کا کوئی حل نکالئے۔''

''وہ کتنا دیں گے؟''

''کتنا دیں گے ایسا مت بولئے۔ آپ کالج کی ایک پالیسی بنا لیجئے۔ نہ کسی سے کم نہ کسی سے زیادہ۔''

''آپ کہئے؟''

''آپ کہئے؟''

''مجھ سے پوچھتے ہیں تو پچیس ہزار طے کر لیجئے۔ آئندہ جو بھی جائے سب کو دینا پڑے گا۔''

پرنسپل نے کہا ''ٹھیک ہے۔اس کو کہئے پچیس جمع کر کے ریلیونگ لے لے۔''

تو یہ ہے روداد اس میٹنگ کی۔ پرنسپل نے بڑی آسانی سے آپ کا موضوع لائے بغیر میٹنگ کو ختم کر دیا تھا۔ وہ تو جب میں نے روکا تو ر کے ورنہ سب اٹھ گئے تھے۔اور یہ آپ کے جلیل صاحب جب تک میں نے کچھ نہیں کہا بالکل چپ تھے۔ جب دیکھا کے میں نے سبھوں کو روک دیا اور وہ سب بیٹھ گئے اور میں بحث کرنے لگا تو پیچھے پیچھے انھوں نے بھی ایک دو لقمہ دیا۔ گذشتہ شام کی محفل میں وہ جس طرح میٹنگ کی کہانی سنا رہے تھے مجھے افسوس ہو رہا تھا اس لیے میں خاموش تھا۔ واقعی ایک چہرے پر دوسرا چہرہ بھی ہوتا ہے۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

جاوید رجسٹرار کے پاس پہنچا۔ ان سے روداد سنائی۔ ان سے کہا کہ مجھے ریلیونگ لے کر یہیں سے جوائنگ کیلئے جانا ہے۔ براہ کرم آپ لیٹر ڈرافٹ کر کے پرنسپل صاحب کے پاس دستخط کے لئے بھیجوا دیجئے۔ انھوں نے کہاں ہاں میں ابھی بنا دیتا ہوں۔ آپ ایک گھنٹہ کے بعد آیئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد جاوید ان کے چیمبر میں پہنچا۔ پوچھا لیٹر تیار ہے۔ اس نے کہا ابھی دستخط نہیں ہوا۔ پرنسپل صاحب کھانا کھانے گئے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے بعد آیئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد جاوید پھر رجسٹرار کے چیمبر میں گیا پوچھا لیٹر تیار ہے۔ جواب ملا لیٹر پرنسپل کی میز پر ہے۔ وہ شہر کے کسی کالج میں کسی میٹنگ میں گئے ہیں۔

''کب آئیں گے؟''

''ایک گھنٹہ میں آجائیں گے۔''

دو گھنٹے بعد شام کے پانچ بجے جاوید رجسٹرار کے چیمبر میں گیا۔ کیا لیٹر تیار ہے۔ انھوں نے کہاں ہاں تیار ہے لے لیجئے۔ اسنے ایک پر دستیابی کا دستخط کیا۔ لیٹر لیا۔ وہاں پر جتنے افراد تھے سب سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہتے ہوئے آفس سے باہر نکل گیا۔

جس وقت کالج رجسٹرار نے جاوید کے ہاتھ میں ریلیونگ لیٹر دیا اس کے بے جا

ن جسم میں جان آ گئی ۔ جیسے ظالم کے چنگل سے آزادی مل گئی ۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی ۔ اسی وقت ایک کلرک کسی کام کے لئے رجسٹرار کے پاس آیا۔ اس نے دیکھا کہ جاوید کو ریلیونگ لیٹر دیا جا رہا ہے۔ اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اورنگ آباد یونیورسٹی میں جا رہا ہے۔ اس کلرک کی بات سن کر جاوید کا دل بھر آیا۔ اس نے کہا کہ آپ اونچے عہدے پر جا رہے ہیں یہ خوشی کی بات ہے لیکن دوسری طرف بڑے دکھ کی بات بھی ہے کہ ہمارے کالج سے اتنا اچھا ٹیچر چلا جا رہا ہے۔ یہاں سے وہ جگہ بہت دور نہیں ہے۔ آتے جاتے رہئے گا۔ ہمیں اپنا سمجھئے۔ یہ سن کر ایسا لگا کہ رو دے اور جی بھر کر روئے۔ کسی نے تو چاہے کلرک ہی سہی اس نے قدر تو کی۔ اس نے ذرا سی اہمیت تو دی۔ جاوید نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ دل کو باندھا لیکن آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس کا دل ہی ایسا تھا جس نے بھی پیار کے دو بول کہے وہ اسے اپنا ہمدرد مان لیتا تھا۔ لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ زندگی میں ایسے جتنے لوگ ملے انھیں انگلیوں پر شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سترہ سال کے بعد اسے یہ عہدہ ملا تھا لیکن کالج کے یہ ماہ و سال درد و غم کے تھے جسے کبھی وہ فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اگر خدا نے اس سے پوچھا کہ میں تجھے دوسرا جنم دونگا اور اقلیتی کالج میں پروفیسری تو وہ خدا سے کہہ دے گا کہ مجھے ایسا دوسرا جنم نہیں چاہئے۔ وہ سترہ سال جس کے ہر سال اس نے کہیں نہ کہیں درخواست بھیجی اور انٹرویو کا سامنا کیا گویا درخواست اور انٹرویو کے مسلسل سترہ سال۔ اور کالج میں احساس کمتری، گھٹن، بزدلی، اجنبیت، تعصب، خوف، پشیمانی، گھبراہٹ، بے اعتمادی، ناچاری، تنہائی، دربدری اور اذیت و کرب کے سترہ سال۔

وہ رجسٹرار کے چیمبر سے باہر آ کر تین چار قدم کے بعد کالج کے آنگن میں ٹھہر گیا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ نیلے آسمان پر سفید بادل کے ٹکڑے یہاں وہاں اپنی اپنی جگہوں پر سکتے کی حالت میں تھے۔ موسم سرد اور فضا پرسکون تھی۔ سینئر اور جونیئر کالج کے لیکچر ختم ہو چکے تھے۔ اسٹوڈنٹس جا چکے تھے۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس کے پیچھے اور دائیں تین منزلہ عمارت کھڑی تھی جس کے فرسٹ، سکنڈ اور تھرڈ فلور کے ہال میں اس نے لیکچر لئے

تھے۔امتحانات لیے تھے۔مختلف ادبی پروگرام کیے تھے۔سامنے کمپیوٹر سائنس کی عمارت تھی۔یہاں بھی کلاس اور امتحانات لئے تھے۔کمپیوٹر بلڈنگ کے پیچھے ہاسٹل بلڈنگ تھی اس میں بھی لیکچر اور امتحانات لئے تھے۔اسی عمارت میں گراونڈ فلور پر مسجد بھی تھی جس میں قران خوانی اور نمازیں پڑھی تھیں۔اس کے پاس ہی کینٹین کی چھوٹی سی عمارت تھی جس میں ہزاروں بار چائے اور ناشتہ کیا تھا۔پروفیسروں کے ساتھ بیٹھ کر ہنسی مذاق کیا تھا۔بائیں طرف سائیکل اور اسکوٹر اسٹینڈ تھا۔ہر جگہ سے کوئی نہ کوئی یادوابستہ تھی۔مگر آج پورا کیمپس سنسان نظر آرہا تھا۔جس کالج کی خدمت میں اس نے اپنی جوانی کے پورے سترہ سال قربان کردئے تھے آج وہاں سے رخصت ہوتے وقت ڈیڑھ سو پروفیسروں میں سے کوئی نہ تھا۔اس نے پورے کالج پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ایک لمبی سانس لے کر چھوڑی بیگ کو کندھے سے لٹکایا اور پیدل بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

ZAWAL-E-A'DAM-E-KHAKI

by

Mohammad Ghayasuddin

माननीय पार्षद प्रो० असलम आज़ाद
के सौजन्य से वर्ष 2013

Rs. 800/- Library Edition

978-90-5073-090-4

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com